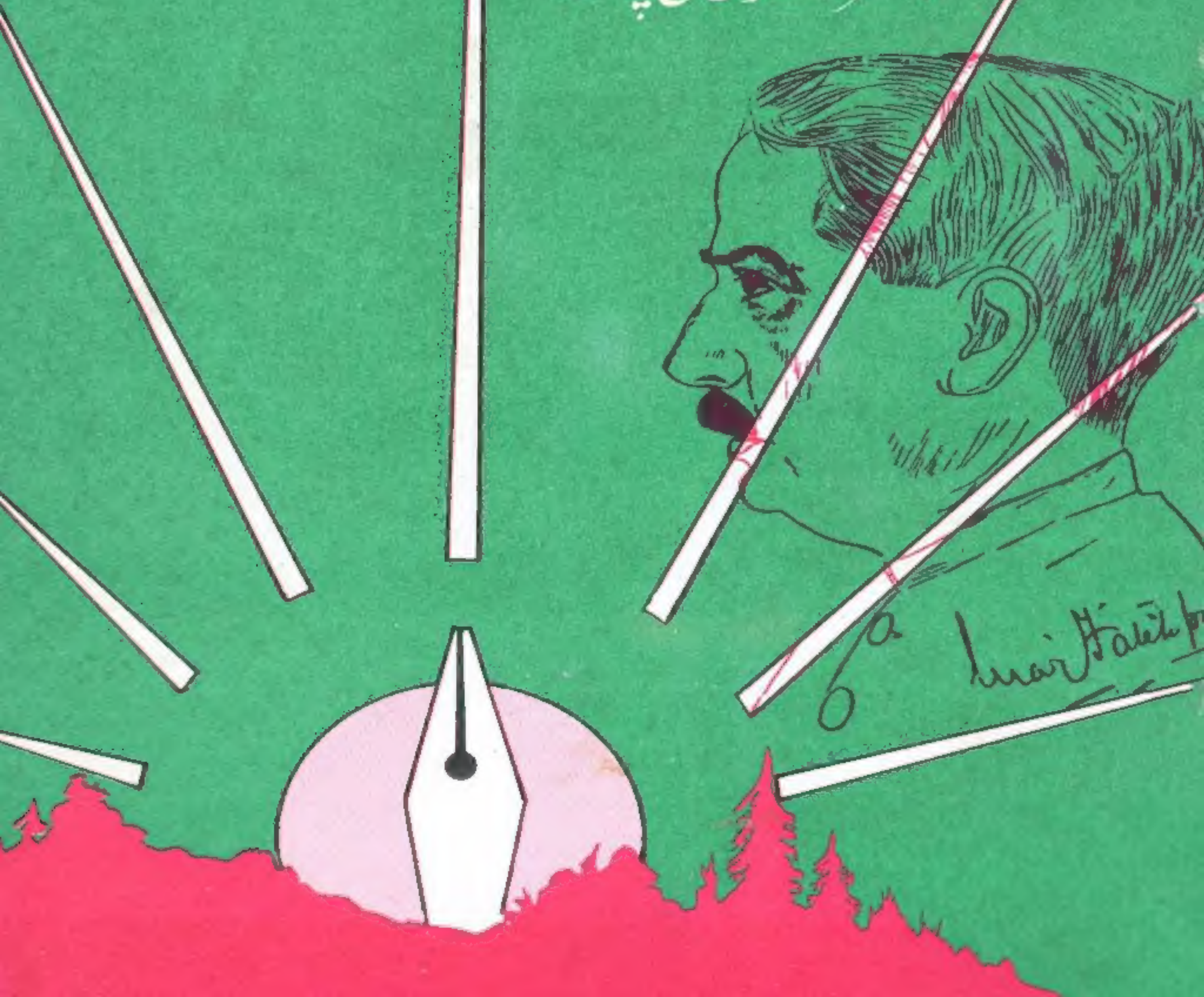
نگار پاکستان

بانی:- علامہ نیاز فتح پوری
جاری شدہ ۱۹۲۲ء

جشن طلائی نمبر

مدیر:-
ڈاکٹر فرمان فتح پوری



رجسٹرڈ نمبر ۲۴۷۲ — جاری شدہ ۱۹۲۲ء

بانی: علامہ نیاز فتح پوری

سالنامہ ۱۹۸۳ء

جشن طلائی نمبر

نگار پاکستان

مدیر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

معاون

امراؤ طارق

زیر اہتمام ——— فتح پور ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی

دفتر ——— ۶۰ ورلی روڈ۔ گارڈن ایسٹ کراچی

مراسلت ——— سی ۲۸۔ ۱۳ ڈی گلشن اقبال کراچی

فون: ۴۶۳۳۶۷

تعلیمی اداروں کے لئے محکمۂ تعلیم کراچی سے منظور شدہ سرکلر نمبر ڈی/ایف یو پی/۲۶۶۹

جشن طلائی نمبر

جس میں جشن طلائی میں پڑھے جانے والے مقالوں کے علاوہ نیاز و نگار سے متعلق، دوسرے قیمتی مضامین شامل ہیں، زیر ترتیب ہے۔ اور بہت جلد منظرِ عام پر آجائے گا۔

احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی ﷺ
آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کی
جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا
جن صفحات پر آیات درج ہیں۔ اُن کو صحیح اسلامی
طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔
(بشکریہ محکمۂ تعلیم حکومت سندھ)

سید اختر حسین نے ایجوکیشنل پریس سے چھپوا کر ۱۵۹-اے قمر کتاب گھر اردو بازار سے شائع کیا۔

جشن طلائی نمبر

فہرست مضامین

باسٹھواں سال	جنوری، فروری ۱۹۸۲ء	شمارہ ۱ ۲

۱

ملاحظات

نیاز فتح پوری بیسویں صدی کے ان گنے چنے ادیبوں میں ہیں جن کی جامعیت وہمہ گیری ہمیں سرسیّد، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کی یاد دلاتی ہے۔ ان کی شخصیت یک پہلو نہیں صد پہلو ہے اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس نے اردو زبان اور ادب کے قاری کو متاثر نہ کیا ہو۔ تبھی تو بعض ان کی مقالہ نگاری کو اہمیت دیتے ہیں اور بعض مالہ وما علیہ کو خاصے کی چیز جانتے ہیں۔ بعض من ویزداں والے نیاز کے دلدادہ ہیں اور بعض مجموعۂ استفسارات وجوابات والے نیاز پر جان چھڑکتے ہیں بعض ان کی مکتوب نگاری کے پرستار ہیں اور بعض ان کی بے باک صحافت کا دم بھرتے ہیں۔ بعض ان کے مختصر ناول "ایک شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" کو ادبی شاہکار سمجھتے ہیں، بعض جمالستان ونگارستان کے رومان پرور انشائیوں اور افسانوں کو تخلیقی کارنامہ خیال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے مذہبی افکار وخیالات کے قدردان ہیں اور کچھ ان کے ادبی معتقدات ونظریات کے مدّاح۔ کچھ لوگ انھیں اردو میں عربی وفارسی کی ادبی روایات کا آخری محافظ سمجھتے ہیں اور کچھ انھیں آزادیٔ فکر کے سب سے بڑے علمبردار اور روایات کے سب سے بڑے باغی کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو انھیں ایک وسیع النظر عالم اور روشن خیال مذہبی مفکر خیال کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو انھیں گمراہ، بے دین، لامذہب دہریہ اور کافر سمجھتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کے ہر باشعور اور بالغ ذہن نے نیازیات کا مطالعہ کرنے اور ان کے متعلق سوچنے پر خود کو مجبور پایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی غیر معمولی شخصیتیں

جو ہزار اختلاف کے باوصف ہر ذی شعور کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہیں روز روز نہیں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔

نیازؔ فتح پوری کے والد محمد امیر خاں، عربی و فارسی کے عالم و شاعر، اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کے بیشتر شعرا کا انھوں گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کثرت سے اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے کہ محاوراتِ فارسی کی سند میں وہ بے تکلف، اساتذہ کا کلام پیش کر دیتے تھے۔ نیاز کے والد کا مذہبی مطالعہ بھی وسیع تھا اور وہ صوم وصلوٰۃ کے بھی سختی سے پابند تھے۔ لیکن مذہبی خشونت یا مولویانہ تنگ نظری ان میں نام کو نہ تھی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی وہ خاص خیال رکھتے۔ لیکن اس باب میں بھی ان کا نقطۂ نظر اپنے معاصرین سے بہت مختلف تھا۔ وہ بچوں کی ذہنی پرداخت اور صحیح نشو و نما کے لئے ان کو زیادہ سے زیادہ . . . . آزادی دینے اور ہر معاملے میں انھیں اپنے طور پر غور و فکر کا عادی بنانے کے قائل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیاز کے مزاج میں بچپن ہی سے ایک قسم کی آزادہ روی اور کشادہ نظری پیدا ہو گئی۔

باقاعدہ تعلیم و تربیت کے لئے وہ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور میں داخل کئے گئے۔ مدرسہ کے بانی مولانا سید شاہ ظہور الاسلام ایک صاحبِ دل صوفی، عالم باعمل، خاموش، سماجی کارکن، بالغ نظر تعلیمی مفکر، دیوبند کے فارغ التحصیل فاضل، مولانا محمد علی مونگیری کے پیر بھائی اور فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔ مولانا شبلی کا بیان ہے کہ ندوۃ العلما کے قیام میں سب سے زیادہ حصہ انھیں کا ہے[۱]۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ وہ ندوہ کے ارکان خاص میں تھے[۲]۔

---

[۱] "یادگار ظہور" از مولانا حسن الدین خاموش، مطبوعہ عزیزیہ پریس آگرہ ۱۹۲۱ء

[۲] "معارف" اعظم گڑھ بابت دسمبر ۱۹۵۱ء

اور مولانا عبدالرزاق کانپوری نے وضاحت سے لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے اصل محرک وہی تھے[۱۵]۔ مولانا ظہورالاسلام کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے خصوصی دلچسپی تھی اور وہ انھیں دینی و دنیوی، دونوں علوم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دیوبند کی بھی ضرورت ہے اور علی گڑھ کی بھی۔ چنانچہ جب ان کے سامنے لوگ علی گڑھ کالج کو بُرا کہتے تو مولانا صاحب کہہ دیتے کہ "دیوبند اور علی گڑھ دونوں میری آنکھیں ہیں میں ان میں سے کسی کو پھوڑنے کو تیار نہیں ہوں"، اس خیال سے مولانا نے ۱۸۸۲ء میں یعنی سرسیّد کے مدرسۂ علی گڑھ کے صرف سات سال بعد فتح پور میں ایک نئے طرز کے مدرسے کی بنا ڈالی اس میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھانے اور صنعتی تعلیم دینے کا بھی انتظام کیا۔ علی گڑھ کے بعد برصغیر کا غالباً یہ پہلا مدرسہ تھا جس میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا کے اس مدرسے سے ہزاروں نے فیض اٹھایا لیکن جنھوں نے شہرت پائی ان میں مولانا حسرت موہانی، حکیم عبدالحی، نیاز فتحپوری، مولانا عبدالرزاق کانپوری، عارف ہسوی، اور مولانا حسن الدین خاموش خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس مدرسے میں نیاز کو دو خاص قسم کے علماء و اساتذہ سے واسطہ پڑا ایک وہ جو کہ مولانا ظہورالاسلام جیسے نہایت سادہ مزاج، رقیق القلب، وسیع النظر اور کشادہ قلب واقع ہوئے تھے۔ دوسرے مولانا نور محمد حافظ قادر بخش اور مولانا محمد حسن جیسے، جو کہ مذہب اور تعلیم دونوں کے باب میں بقول نیاز فتح پوری تنگ نظر اور سخت گیر تھے۔

مدرسۂ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے بعض مدرسین کی اس مولویانہ ذہنیت اور مذہبی کٹرپن کا یہ اثر ہوا کہ نیاز کا تجربہ مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر

۱۵۔ "یادِ ایام" ص ۱۰۲ از مولانا عبدالرزاق کانپوری مطبوعہ عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن

ہوتا چلا گیا۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ دیوبند کے بعض فارغ التحصیل اساتذہ
ور علمائ بھی انگریزی شاخ کو مٹانے کے درپے ہیں اور مغربی تعلیم کی تحصیل کو گناہ
خیال کرتے ہیں تو انھیں ایسے تنگ نظر علمائے دین سے نفرت پیدا ہونے لگی۔
س نفرت کا ردِ عمل ان کی وہ تحریریں ہیں جو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے بعد
نگار کے صفحات میں نمودار ہوئیں اور علمی اور ادبی حلقوں میں آزادیٔ فکر کا ایک
یا باب کھول گئیں۔

یہی زمانہ سرسیّد احمد خاں کے تعلیمی و مذہبی نظریات اور ان کی تحریک علیگڑھ
کے فروغ کا ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقائے
کار مسلمانوں کو تعصب، جہالت اور مذہبی تنگ نظری سے نجات دلانے کے
لئے خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ دوسری طرف برّصغیر کے بعض تنگ نظر علمائے
ین مغربی تعلیم اور انگریزی کی مخالفت میں سرسیّد کو دہریہ، کافر، نیچری اور
کرسٹان کے ناموں سے ملقّب کر رہے تھے اور ان کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کو
ملک و ملّت کے لئے مہلک قرار دے رہے تھے۔ لیکن سرسیّد اور ان کے ساتھیوں
کے خلوص، ایثار اور حوصلہ مندی کے آگے تنگ نظر مولویوں کی ایک نہ چلی، سرسیّد
اور ان کی تحریک علی گڑھ کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا۔ نوجوانوں پر خصوصاً اس تحریک
نے گہرا اثر ڈالا۔ نیاز فتح پوری بھی ایک باشعور نوجوان کی حیثیت سے سرسیّد اور
ان کی تحریک سے متاثر ہوئے۔ عقل و مذہب کے بارے میں وہ جو کچھ سوچ رہے
تھے۔ اس کا زیادہ حصہ انھیں سرسیّد کے افکار و خیالات میں مل گیا۔ گویا سرسیّد
نے ان کے مذہبی خیالات کی خارجی تائید کر دی۔ نتیجتہً مذہب کے مطالعے اور
اس پر غور و فکر کرنے کے سلسلے میں ان کا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا۔ لیکن آگے چل کر
وہ صرف سرسیّد کے مقلّد یا غالب کے طرفدار نہ رہے بلکہ مسلسل مطالعہ اور
ذاتی غور و فکر کی مدد سے انھوں نے سخن فہم بننے کی پوری کوشش کی ہے۔

ادصافِ مذہب اور اہلِ مذہب کے باب میں ان کا رویّہ وہی ہے جو۔۔۔

اوصافِ خودی کے سلسلے میں علامہ اقبال کا ہے۔ علامہ اقبال رنگ ونسل ومذہب کی تفریق کئے بغیر ہر اس شخص کی تعریف کرتے ہیں، جس میں وہ خودی کی قوتوں کو بروئے کار دیکھتے ہیں۔ ان کے اس مسلک کے سبب بعض تنگ نظر نقادوں نے ان پر اشتراکی اور فسطائی ہونے کا الزام لگایا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کم وبیش یہی کیفیت مذہب کے باب میں نیاز کی ہے انھوں نے اعمال اور اخلاق کو بنیاد بنا کر جب کسی شخص یا طبقے کو سراہا ہے تو بے عمل اور تنگ نظر مذہبی گروہ کی جانب سے ان پر کبھی معتزلہ، کبھی زندقہ، کبھی شیعہ، کبھی وہابی، کبھی اسمٰعیلیہ، کبھی احمدیہ اور کبھی بے دین اور دہریہ ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے ایک جگہ نہیں متعدد جگہ اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میں، ایک مسلمان کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں۔ بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری "ان کا اسلام خالص اسلام ہے وہ شیعہ ہیں نہ سنّی مقلد ہیں نہ غیر مقلد، دیوبندی ہیں نہ بریلوی اہل حدیث ہیں نہ قرآنی، وہ محض مسلمان ہیں[۱]"۔ اسی طرح ایک بلند پایہ شیعہ ادیب نے جب ان سے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ "میں پکا مسلمان ہوں نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم" اس کے بعد انھوں نے پوچھا آنحضرت کی جانشینی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو نیاز صاحب نے کہا "رسول اللہ، علی کو اپنا جانشین بنانا . . . . چاہتے تھے۔ اور علی ان کے مناسب جانشین بھی ہوتے لیکن آپ کی طرح میں اسے مذہب کا جزو نہیں سمجھتا۔ آپ کے لئے علی کی ولایت مذہب کا حصّہ ہے بغیر اس کے مانے مذہب پورا نہیں ہوتا۔ میرے لئے اللہ اور اس کے رسول کے آگے کچھ اور ماننا ضروری نہیں"[۲]

---

[۱] "نیاز کا مذہب"، مطبوعہ نگار پاکستان کراچی بابت مارچ اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۱۱

[۲] "نیاز فتحپوری سے نیاز"، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، نگار پاکستان مارچ اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۲۴

جہاں تک نیاز کی خالص ادبی تحریروں کا تعلق ہے انھوں نے کم وبیش ہر صنف اور ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس اندازِ خاص سے کہ ہم ان کی کسی تحریر کو بھی حرفِ مکرر نہیں کہہ سکتے۔ ابتداً اپنے مخصوص ماحول کے زیر اثر وہ غزل کی طرف لپکے۔ پھر مغربی اثرات کے زیر اثر انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۹۱۰ عیسوی میں "زمیندار" سے منسلک ہونے کے بعد انھوں نے علامہ اقبال، اور مولانا شبلی سے متاثر ہوکر مسدس کی صورت میں قومی و ملی نظمیں کہیں۔ چنانچہ الہلال کے ابتدائی پرچوں خصوصاً ۱۳-۱۹۱۲ء کے شماروں میں آپ کو زیادہ نظمیں مولانا نیاز اور علامہ شبلی ہی کی ملیں گی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ نیاز کا زیادہ تر قیام بھوپال اور دلی ہی میں رہتا تھا۔ یہی دور ہے جس میں نیاز نے ٹیگور کی "گیتا انجلی" کا اردو ترجمہ کیا۔ "جذباتِ بھاشا" کے نام سے ہندی شاعری کی انفرادی خصوصیات سے اردو والوں کو متعارف کرایا۔ نگارستان" اور "جمالستان" کے نیم تاریخی اور رومانی افسانوں کی تخلیق کی۔ "ایک شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" جیسے قیامت خیز مختصر ناول اردو کو دیئے۔ اس عہد کو نیاز کی ادبی شہرت و مقبولیت کا عہدِ شباب بھی کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ پاک و ہند کے ہر طبقے اور ہر گوشے میں ان کی تحریروں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ سارے ادبی رسائل ان کے مضامین حاصل کرنے کے متمنی رہتے تھے اور ادارتی نوٹ کے ساتھ خاص اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ بقول ملا واحدی "نیاز کی شہرت کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ڈپٹی عبدالرؤف نورالرحمٰن اور یونیورسٹیوں کے دوسرے نیاز کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لئے دلی کے پھیرے کیا کرتے تھے"[۱] یہی وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں ابوالخیر مودودی صاحب کا بیان ہے کہ

ہماری شامیں نیاز صاحب کی خواجہ تاشی میں گزرتی تھیں پھر نیاز

---

[۱] "نیاز اور دلی" از ملا واحدی مطبوعہ نگارِ پاکستان کراچی بابت مارچ اپریل ۱۹۶۳ء صفحہ ۶۳

صاحب نے ہمیں لکھنے پر ابھارا۔ "صرف باتیں ہی نہیں کچھ کام بھی ہونا چاہیئے۔ تم لوگ لکھو اور پڑھ کے سنایا کرو۔ ہر مہینے کم از کم ایک مضمون" ہم تینوں (یعنی، میں، ابوالاعلیٰ مودودی اور قمرالحسن) کے لیئے حسب ذوق مستقل موضوع بھی مقرر کئے لکھنا اور سنانا اٹل تھا۔ نیاز صاحب مجھے ملک الموت نظر آتے تھے لیکن زجرِ مشفقانہ سے مفر بھی نہ تھا۔ گھاس کاٹنی ہی پڑتی تھی۔ مستعدی سے ہر مہینے صرف ابوالاعلیٰ مودودی ہی لکھتے اور سناتے تھے۔ یہ لکھنا سنانا ان میں ایسا رچا کہ لکھ کے سنانے کی طرح پڑھنا ان کی عادت بن گیا۔[۱]

یوں سمجھ لیجئے کہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء کا زمانہ نیاز کی رومان نگاری اور انشائے لطیف کا زمانہ ہے اس کے بعد فروری ۱۹۲۲ء میں جب انھوں نے ترکی زبان کی مشہور شاعرہ "نگارِ بنتِ عثمان" کی انقلابی شاعری سے متاثر ہوکر، "نگار" جاری کیا تو ان کی نظر سنجیدہ علمی موضوعات پر مرکوز ہوگئی۔ نگار کے ذریعے انھیں تخلیقی اور تحقیقی قوتوں کے آزادانہ استعمال کا موقع مِل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ، ناول، صحافت، مقالہ نگاری، تنقید، مکتوبات نگاری اور انشاپردازی سب میں اُن کا سکّہ چلنے لگا۔ بقول مولانا حامد حسن قادری اب وہ ادیب نہ رہے، ادیب ساز بھی ہوگئے اور ان کی علمی اور ادبی شخصیت اتنی وسیع اور واضح ہوگئی کہ ادبی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں ان کا کٹر سے کٹر مخالف بھی ان کے نام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

---

[۱] "نیاز آخرالزماں" از مولانا ابوالخیر مودودی، مطبوعہ نگار پاکستان کراچی بابت ستمبر ۱۹۶۳ء ص ۶۳

شعروادب سے ہٹ کر نیازؔ فتح پوری نے بعض دوسرے موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ بقول شخصے، ان کے یہاں علوم وفنون سے الگ ایک ضخیم حصّہ متفرقات کا بھی ہے۔ اخلاق وحکمت، اقتصادیات ومعاشرت ارضیات وفلکیات، مذہب وتصوف، فحاشیات وجنسیات، علم نجوم وسیاست حاضرہ غرضیکہ زمین وآسمان کا شاید ہی کوئی قضیہ ہو جس کو نیازؔ نے نہ چھیڑا ہو۔ اور جس کو اپنے طرز تحریر کے جادو سے بڑے سے بڑے مرتد پڑھنے والوں کے لئے دلکش نہ بنا دیا ہو۔ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ نیازؔ کی تحریروں میں دل کشی کے یہ آثار ان کی دو بنیادی اور نمایاں خصوصیات، آزادیٔ فکروخیال اور اعلیٰ درجہ کی ادبیت کے سبب رونما ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی ساٹھ سالہ علمی وادبی زندگی میں جو کچھ لکھا ہے کافی غور وفکر اور تحقیق وتنقید کے بعد لکھا ہے جو کچھ سمجھا ہے وہی لکھا ہے۔ جس طرح محسوس کیا ہے اسی طرح لکھا ہے۔ سود وزیاں سے بے نیاز رہ کر لکھا ہے۔ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر لکھا ہے۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست کے قول کو نظر انداز کر کے لکھا ہے۔ شخصیتوں، طبقوں، گروہوں، فرقوں اور رنگ ونسل کے تعصبات سے بلند تر ہو کر لکھا ہے اور سب سے بڑھ یہ کہ جو کچھ لکھا ہے دل کش اور منفرد اسلوب میں لکھا ہے۔ یہ اسلوب جو کہ جمالیاتی کیفیتوں اور جرأت مندانہ لب کشائیوں سے ظہور میں آتا ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری "اپنے اندر طرح طرح کی توانائیاں رکھتا ہے۔" اس اسلوب پر پرانے یا از کار رفتہ ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ ایک زندہ قوت ہے جو اردو زبان و ادب پر نیازؔ کے اثرات کو کبھی فنا نہیں ہونے دے گا۔"[۱]

نیازؔ کا قلم، انیسویں صدی کی پہلی دہائی سے لے کر ۱۹۶۶ء کے اوائل تک کم وبیش ساٹھ سال چلتا رہا۔ ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ان کے گلے میں سرطان

---

[۱] "نگارِ پاکستان" کراچی بابت مارچ اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۰۰

کا پیش خیمہ بن کر ایک گلٹھی نمودار ہوئی ۔ علاج معالجہ ہوتا رہا ۔ نیاز صاحب اس عالم میں بھی لکھتے پڑھتے رہے ۔ اپریل ۱۹۶۶ء کے بعد ان کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی ۔ آخر کار ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور پاپوش نگر ناظم آباد کراچی میں مدفون ہوئے ۔ ان کی قبر پر اُن کی خواہش کے مطابق غالبؔ کا یہ شعر کندہ ہے ۔

زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

زیرِ نظر مقالات "نگار" کے جشنِ طلائی کے موقع پر بہت عجلت میں مرتب و منتخب کئے گئے ہیں ، ان میں سے بیشتر نیاز صاحب کے معاصرین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں اور نیاز صاحب کی زندگی میں لکھے گئے ہیں ۔ ان مقالات کا دائرہ صرف نیاز کی شخصیت و زندگی اور فکر و فن تک محدود ہے ۔ "نگار" کی ساٹھ سالہ خدمات اور اس کی علمی و ادبی روایات پر مشتمل مقالات الگ دوسری جلد کے لئے زیرِ ترتیب ہیں اور بہت جلد منظرِ عام پر آجائیں گے ۔

فرمان فتح پوری

فرمان فتح پوری

نیاز فتح پوری ایک نظر میں

(۱) نام، وطن اور تاریخ پیدائش

(۱) پیدائشی نام - نیاز محمد خاں (والدہ کا رکھا ہوا)

(۲) تاریخی نام - لیاقت علی خاں - (والد کا رکھا ہوا)

(۳) قلمی نام - نیاز فتح پوری -

(۴) باپ کا نام - محمد امیر خاں متوفی ۱۹۰۸ء

(۵) وطن - فتح پور ہسوہ محلہ خیلدار

(۶) جائے پیدائش - سنئی گھاٹ (ضلع بارہ بنکی)

(۷) تاریخ پیدائش ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء

(۸) خطاب - پدما بھوشن - اپریل ۶۲ء میں منجانب حکومت ہند

(۹) وفات کراچی - ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء

(۲) تعلیم و تربیت

(۱) چھ سات سال کی عمر تک گھر پر مکتبی تعلیم والد کی زیر نگرانی پائی - پہلے مولوی حبیب الدین صاحب (ساکن نیوتنی ضلع اناؤ) شاگرد مولانا احسن بلگرامی اور بعد ازاں لکھنؤ میں مولوی صدیق حسن غازی پوری اتالیق مقرر ہوئے -

(۲) نو دس سال کی عمر میں مولانا ظہور الاسلام کے بنا کردہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ یہیں سے ۱۹۰۸ء میں انگریزی مڈل اور ۱۹۱۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

(۳) اس سے پہلے تقریباً ڈیڑھ سال دارالعلوم ندوہ لکھنؤ اور پھر مدرسہ عالیہ رام پور میں (جس کے پرنسپل مولانا عرب طیب صاحب علم و فضل کے اعتبار سے اس زمانے کے نہایت ممتاز شخصیت خیال کئے جاتے تھے) اور مولانا وزیر محمد خاں شاگرد مولانا عبدالحق خیرآبادی سے بھی تعلیم حاصل کی۔

(۳) قابلِ ذکر اساتذہ جن کا مثبت یا منفی اثر قبول کیا۔

(۱) مولانا سید ظہور الاسلام صاحب محرک ندوۃ العلماء بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور۔

(۲) مولانا نور محمد صاحب مدرس اعلیٰ شاخ عربی مدرسہ اسلامیہ فتح پور۔

(۳) مولانا فاروق چریا کوٹی۔

(۴) مولانا عرب محمد طیب صاحب مدرسِ اعلیٰ مدرسۂ عالیہ رام پور۔

(۵) مولانا وزیر محمد خاں مدرس عالیہ رام پور۔

(۶) مولانا محمد حسین خاں صاحب فاضل دیوبند مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتح پور۔

(۷) مولوی اعزاز علی صاحب ہیڈ ماسٹر شاخ انگریزی مدرسۂ اسلامیہ فتح پور۔

(۸) مولوی حبیب الدین اتالیق و مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتح پور۔

(۹) مولوی صدیق حسن غازی پوری اتالیق۔

(۴) شادی

(۱) پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں بہ عمر سترہ (۱۷) سال الہ آباد میں ہوئی ۱۹۲۳ء میں بیوی کا انتقال ہو گیا۔

(۲) دوسری شادی ۱۹۲۴ء میں بمقام لکھنؤ مختار بیگم سے ہوئی جن کی وفات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔
(۳) تیسری شادی ۱۹۳۲ء میں مرحومہ کی چھوٹی بیوہ بہن گلزار بیگم بنت محمد ولایت خاں صاحب سے لکھنؤ میں ہوئی۔

(۵) اولاد

(۱) پہلی بیوی سے چار لڑکیاں ہوئیں۔ دو حیات ہیں اور پاکستان میں ہیں۔ دو کا انتقال ہو گیا۔
(۲) دوسری بیوی مختار بیگم سے صرف شوکت جہاں آرا ہوئیں جو لکھنؤ میں مجدد کو بیاہی تھیں اور ۱۹۵۴ء میں وفات پا گئیں۔
(۳) تیسری بیوی گلزار بیگم حیات ہیں۔ نیاز صاحب کی چھوٹی سالی ہیں پہلے ظفر احمد خاں کو بیاہی تھیں جن سے محمد یوسف خاں۔ محمد آصف خاں۔ محمد عارف خاں اور محمد قمر خاں ہیں۔ بیوہ ہو جانے کے بعد نیاز صاحب کے نکاح میں آئیں اور ان سے دو لڑکے محمد سرفراز خاں نیازی اور محمد ریاض خاں نیازی پیدا ہوئے۔ جن کی عمریں اس وقت بالترتیب ۳۵ اور ۳۲ سال ہیں اور دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور آج کل امریکہ میں ہیں

(۶) خاندان

(۱) محمد امیر خاں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی ہوئی۔ دوسری بیوی سے محمد نجابت علی خاں پیدا ہوئے جن کا ۱۲-۱۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ تیسری بیوی سے ایک لڑکی تنظیر النساء اور نیاز محمد خاں پیدا ہوئے۔

(۷) قابلِ ذکر اہم درس فتح پور میں۔

(۱) مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی۔

(۲) سید روح الحسن (برادر بزرگ مولانا حسرت موہانی)

(۳) سید مشتاق حسین، فتح پوری۔

(۸) طویل قیام

سنِ پیدائش ۱۸۸۴ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کے درمیانی حصے میں تقریباً اکیس بائیس سال فتح پور میں بسر ہوئے۔ چونکہ نیازؔ صاحب کے والد محکمۂ پولیس سے وابستہ تھے اور ان کا تبادلہ یوپی کے مختلف اضلاع میں ہوا کرتا تھا اس لئے نیاز صاحب کا قیام بھی مختلف شہروں میں رہتا تھا۔ لیکن سال کے چند مہینے فتح پور ہی میں گزرتے تھے۔ ۱۸۹۳-۹۴ء کے قریب وہ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے اس وقت ان کے والد اگرچہ لکھنؤ میں تھے لیکن نیاز کا زیادہ قیام بغرض تعلیم فتح پور ہی میں رہتا تھا۔ ۱۸۹۲-۹۴ء میں جب اُن کے والد نے پنشن لے کر رام پور میں وکالت شروع کی تو نیاز بھی رام پور چلے گئے۔ واپس ہو کر ۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء میں انہوں نے انگریزی مڈل اور میٹرک کے امتحان پاس کئے۔ اس کے بعد مُلازمت کا سلسلہ رہا۔ ۱۹۱۵ء تک یعنی بھوپال جانے سے پہلے وہ مختلف جگہ رہے لیکن اس عرصے میں بھی انہوں نے مدرسۂ اسلامیہ (انگریزی شاخ) کے نگراں کی حیثیت سے مختلف اوقات میں تقریباً پانچ چھ سال فتح پور میں قیام کیا۔

(۲) بھوپال۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۲ء تک

(۳) لکھنؤ۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۶۲ء تک

(۴) کراچی۔ ۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء سے تاحیات

(۹) عہدِ رنگین کے یادگار مقامات

(۱) مسوری (۲) کلکتہ (۳) الہ آباد (۴) دلّی (۵) سری نگر (۶) ہانسی (۷) اُچے گڑھ۔
(۸) لکھنؤ (۹) رام پور (۱۰) بھوپال (۱۱) بمبئی۔

(۱۰) سلسلۂ ملازمت

(۱) ۱۹۰۰ء میں پولیس سب انسپکٹر کے لئے نامزد ہوئے اور مراد آباد میں پولیس ٹریننگ مکمل کی۔

(۲) ۱۹۰۱ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر تھانہ ہنڈیا (ضلع الہ آباد) میں تعینات ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں مستعفی ہو گئے۔

(۳) ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان مدرسہ اسلامیہ انگریزی شاخ کے ہیڈ ماسٹر رہے۔

(۴) ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان باونی اسٹیٹ (کدورا) میں بہ عہد نواب ریاض الحسن خاں، ہیڈ ماسٹر، شہر کوتوال اور پرائیویٹ سکریٹری کے عہدوں پر مامور رہے۔

(۵) ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان اجے گڑھ اسٹیٹ بندیلکھنڈ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔

(۶) ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان ہانسی (ضلع حصار) گئے اور وہاں اسلز اسٹیٹ میں بہ حیثیت سیکریٹری کام کرنے لگے۔ سجاد حیدر یلدرم سے ملاقات ہونے اور ان کی تحریروں سے متاثر ہونے کا یہی زمانہ ہے۔

(۷) ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء میں واپس آکر دوبارہ مدرسۂ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔

(۸) ۱۹۱۰ء ہی کے درمیان چند مہینے مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار سے منسلک رہے۔ مولوی وحیدالدین سلیم بھی ان کے ساتھ تھے۔

(۹) ۱۹۱۱ء میں دوبارہ ہانسی (ضلع حصار) گئے اور میونسپل سیکریٹری مقرر ہوئے۔

(۱۰) ۱۹۱۲ء میں فتح پور واپس ہوئے اور مدرسۂ اسلامیہ سے منسلک رہے۔

(۱۱) ۱۹۱۴ء میں دلی گئے اور حکیم اجمل خاں کے انگریزی اسکول کے نگراں رہے۔

(۱۲) ۱۹۱۵ء میں بھوپال پہنچے اور مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

(۱۱) صحافتی زندگی

(۱) ۱۹۱۰ء میں "زمیندار" اخبار سے منسلک رہے۔

(۲) ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار "توحید" کے معاون مدیر ہوئے۔

(۳) ۱۹۱۲-۱۳ء میں ہفتہ وار "خطیب" کے قلمی معاون رہے۔

(۴) ۱۹۱۹ء میں روزانہ اخبار "رعیت" کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

(۵) ۱۹۱۱-۱۲ء میں "سہیل" نامی رسالہ نکالنے کا خیال ہوا لیکن اجراء نہ ہوسکا۔

(۶) فروری ۱۹۲۲ء سے نگار کے مدیر اعلیٰ ہیں۔

(۱۲) علمی و ادبی زندگی

(۱) فتح پور کے دورِ تعلیم ہی میں یعنی ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان شعر و ادب کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور طرح پر غزل کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے تھے۔

(۲) غزل کے ساتھ ساتھ نظموں کا شوق ہوا۔ چند دنوں انشائے لطیف اور رومانی افسانہ نگاری پر بھی قابو پالیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۶-۷ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک برابر قائم رہا۔

(۳) ۱۹۲۲ء کے بعد علمی اور مذہبی فکر انگیز تحریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

(۴) ۱۹۲۵-۲۶ء سے تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھنے کا آغاز ہوا۔

(۵) ۱۹۳۰ء کے بعد (متنوع مسائل حیات) اور مختلف علوم و فنون پر قلم اٹھایا اور نگار کو دائرۃ المعارف خیال کیا جانے لگا۔

(۶) تخلیقات کی طباعت و اشاعت کا آغاز "انتخاب لاجواب" (لاہور) اور علمائے عام (دہلی) سے ہوا۔

(۱۳) نگار سے قبل کی تحریریں

۲۲ء یعنی نگار کے اجراء سے پہلے نیاز صاحب کی تحریریں زیادہ تر مندرجہ ذیل پرچوں میں شائع ہوئی ہیں۔

(۱) انتخاب لاجواب (لاہور)	(۲) صلائے عام (دہلی)
(۳) زمیندار (لاہور)	(۴) صوفی (امرتسر)
(۵) رعیّت (میرٹھ)	(۶) خطیب (دہلی)
(۷) الہلال (کلکتہ)	(۸) تمدن (دہلی)
(۹) نقّاد (آگرہ)	

(۱۴) نگار کا اجراء

(۱) آگرہ ـــــ فروری ۱۹۲۲ء سے دسمبر ۲۲ء تک
(۲) بھوپال ـــــ جنوری ۱۹۲۳ء سے جون ۲۶ء تک
(۳) لکھنؤ ـــــ جولائی ۱۹۲۷ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک
(۴) کراچی ـــــ اگست ۱۹۶۲ء سے۔

(۱۵) فکروفن کو متاثر کرنے والی شخصیتیں

سرسیّد احمد خان (۲) محسن الملک (۳) مولانا شبلی (۴) اکبر الہ آبادی۔ (۵) ٹیگور (۶) آسکر وائیلڈ (۷) مہدی افادی (۸) مولانا ظفر علی خاں۔ (۹) ولیم ہیزلیٹ (۱۰) میر ناصر علی (۱۱) سرور جہان آبادی (۱۲) علامہ اقبال۔ (۱۳) سیّد سجّاد حیدر یلدرم (۱۴) مولوی کرامت حسین (۱۵) مولانا ابوالکلام آزاد (۱۶) ورڈسورتھ (۱۷) شیلی (۱۸) چرٹن (۱۹) برناڈ شاہ۔ (۲۰) واشنگٹن ارونگ۔

(۱۶) زبانوں سے واقفیت

(۱) اُردو (۲) فارسی (۳) عربی (۴) ترکی (۵) ہندی (۶) انگریزی۔

(۱۷) علوم و فنون پر دسترس

(۱) فقہ (۲) حدیث (۳) تفسیر (۴) نجوم (۵) علم الکلام (۶) معانی و بیان
(۷) فلسفہ (۸) منطق (۹) عروض (۱۰) موسیقی (۱۱) تاریخ (۱۲) نفسیات۔
(۱۳) قواعد (۱۴) فن تجوید (۱۵) فنِ انشاء (۱۶) تصویر کشی۔

(۱۸) اُردو کے پسندیدہ فنکار

اِنشائے لطیف۔ (۱) مہدی افادی (۲) سجّاد حیدر یلدرم (۳) میر ناصر علی۔
ناول و افسانہ۔ (۱) نذیر احمد (۲) شرر۔ سرشار۔ راشد الخیری۔ پریم چند۔
طنز و مزاح۔ (۱) اکبر الہ آبادی (۲) پطرس بخاری (۳) رشید احمد صدیقی (۴) شوکت تھانوی۔
نظم نگاری۔ (۱) اسمٰعیل میرٹھی۔ (۲) سرور جہان آبادی (۳) اقبال (۴) اختر شیرانی
(۵) حفیظ جالندھری (۶) نظیر اکبرآبادی۔ (۷) جمیل مظہری۔
(۸) جوش ملیح آبادی۔ (۹) شوق قدوائی۔ (۱۰) منظور حسین شور
گیت اور غزل۔ میر، مصحفی، غالب، مومن، داغ، فانی، جلال لکھنوی،
شاد عظیم آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری،
حسرت موہانی، وحشت کلکتوی، فیض احمد فیض، اجتبیٰ
رضوی، علی اختر حیدر آبادی۔
مثنوی۔ (۱) میر حسن (۲) شوق قدوائی۔ (۳) نواب مرزا شوق۔
مرثیہ۔ (۱) میر انیس۔

(۱۹) دوسری زبانوں کے پسندیدہ شعرا و ادبا۔

(۱) ترکی۔ نگار بنتِ عثمان۔
(۲) عربی۔ ابونواس۔ مہلہل۔ فرزدق۔ لیلیٰ اخیلیہ۔ ابو العتاہیہ، متنبی،
(۳) فارسی۔ عرفی، غالب، فردوسی، سعدی، حافظ، خسرو، بیدل، ظہوری۔

نسبتی تھانیسری، اقبال،
(۴) ہندی — میرآبائی، بہاری لال، تلسی داس، عبدالرحیم خانخاناں۔
(۵) انگریزی ۔ ولیم ہزلیٹ، ورڈسورتھ، شیلی، کیٹس، آسکر وائلڈ۔
واشنگٹن ایرونگ ۔ زینالڈز ۔ برنارڈ شا۔

(۲۰) فرصت کے مشغلے

(۱) مطالعۂ کتب (۲) موسیقی (۳) فوٹو گرافی (۴) میکانکزم —
(۵) سیر و سیاحت

(۲۱) حلقۂ احباب — (نیاز صاحب کے احباب کی فہرست بہت طویل ہے چند حضرات یہ ہیں)

ہوش بلگرامی (مرحوم) ضیاء عباسی ہاشمی ملک حبیب احمد خاں (مرحوم) ل۔ احمد،
مانی جائسی مرزا عبدالغفار بیگ مغل (مرحوم) خلیقی دہلوی (مرحوم) حکیم
مجیب الدین تبقائی (مرحوم) ملا واحدی مخمور اکبرآبادی ابوالخیری مودودی،
مہدی آفادی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جوش ملیح آبادی راشد الخیری (مرحوم)
سجاد حیدر یلدرم (مرحوم) عارف ہنسوی (مرحوم) رشید احمد صدیقی
بیدل شاہجہانپوری (مرحوم) امتیاز علی خاں عرشی علی اختر حیدرآبادی (مرحوم)
دلگیر اکبرآبادی (مرحوم) مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) مولانا ارشد تھانوی۔
جگر مرادآبادی (مرحوم) حکیم اجمل خاں (مرحوم) مولانا حسرت موہانی (مرحوم)
کوثر چاندپوری آثر لکھنوی فراق گورکھپوری مولانا عبدالرزاق کانپوری (مرحوم)
حسن الدین خاموش (مرحوم) مجنوں گورکھپوری چودھری برہم ناتھ دت
جمیل مظہری ڈاکٹر عندلیب شادانی محمد مجیب انصاری مولانا
ظفر علی خاں غلام رسول مہر شورش کاشمیری امتیاز علی تاج محمد طفیل
فیض احمد فیض آل احمد سرور احتشام حسین عبدالباری آسی (مرحوم)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی   ڈاکٹر نارنگ   خواجہ ذوقی   عبدالرؤف ہسوی
شجاعت علی رضوی (مرحوم)   صاحبزادہ مرزا وسیم احمد   حکیم محمد سعید   ملک رام

(۲۲) تصنیفی و تالیفی سرمایہ

مطبوعہ کتابیں
(۱) ایک شاعر کا انجام   (۲) جذباتِ بھاشا
(۳) صحابیات   (۴) تاریخ الدولتین
(۵) المسلئۃ الشرقیہ (عربی سے ترجمہ)   (۶) عرضِ نغمہ (ترجمہ گیتا انجلی)
(۷) فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع   (۸) فراست الید
(۹) مکتوباتِ نیاز جلد اوّل   (۱۰) مکتوباتِ نیاز جلد دوم
(۱۱) مکتوباتِ نیاز جلد سوم   (۱۲) مذاکراتِ نیاز
(۱۳) نگارستان   (۱۴) جمالستان
(۱۵) ترغیباتِ جنسی   (۱۶) شہاب کی سرگزشت
(۱۷) مجموعۂ استفسارات و جوابات حصہ اوّل   (۱۸) مجموعۂ استفسارات و جوابات حصہ دوم
(۱۹) " " " " سوم   (۲۰) من ویزداں
(۲۱) نقاب اُٹھ جانے کے بعد   (۲۳) گہوارۂ تمدن
(۲۴) انتقادیات جلد اوّل   (۲۵) انتقادیات جلد دوم
(۲۶) مذہب   (۲۷) حُسن کی عیاریاں
(۲۸) مالہ وما علیہ   (۲۹) نقش ہائے رنگا رنگ
(۳۰) مشکلاتِ غالب   (۳۱) محمد بن قاسم سے بابر تک
(۳۲) مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ   (۳۳) تاریخ کے گم شدہ اوراق
(۳۴) شبستاں کا قطرۂ گوہریں   (۳۵) من ویزداں حصہ دوم

نیاز کے تحریر کردہ نگار کے خاص نمبر

(۱) ملاحظات نمبر جنوری ۱۹۳۶ء   (۲) ڈرامہ اصحاب کہف نمبر جنوری ۱۹۳۷ء

(۳) قرآن نمبر جنوری ۱۹۴۵ء (۴) پاکستان نمبر جنوری ۱۹۴۸ء (۵) ایک مستقبل کی تلاش نمبر (نصف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء (۶) فرمانروایانِ اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۳ء (۷) علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۵ء (۸) معلومات نمبر جنوری ۱۹۵۶ء (۹) تنقیح اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۹ء (۱۰) غالب نمبر جنوری ۱۹۵۲ء

نگار میں نیاز کی مطبوعہ تحریریں

ملاحظات (اداریہ)	تقریباً ۵۰۰	علمی و ادبی مقالات	تقریباً ۷۰۰
سوانحی مضامین	تقریباً ۱۵۰	معلوماتی مضامین	” ۵۰۰
تبصرے	” ۳،۰۰۰	استفسار کے جوابات	” ۲۵۰
اُردو نظمیں	” ۹	اُردو غزلیں	تقریباً ” ۱۵
فارسی نظمیں اور غزلیں	تقریباً ۱۵	افسانے تقریباً ۱۵۰	ڈرامے تقریباً ۷

جوشؔ ملیح آبادی

حضرت نیازؔ فتح پوری

یادش بخیر یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اس زمانے میں آگرہ گیا ہوا تھا۔ جہاں لطیف الدین احمد صاحب کے دانش کدے پر حضرت نیازؔ سے مجھ کو پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جا رہا تھا اور نیازؔ صاحب آغازِ پیری کی جانب مڑنے والے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نیازؔ صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شہزادی" کی مجھے دل کھول کر داد دی تھی۔ اور "روحِ ادب" پر تنقید کا بھی وعدہ کیا تھا (جو کبھی ایفا نہ ہو سکا)۔

اس زمانے میں نیازؔ صاحب ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے منہ پر ڈاڑھی مجھ کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیازؔ صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیازؔ صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے، اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

میری جھولی میں تو آج بھی 'بقدرِ حوصلہ' علم و فکر کی پونجی نہیں ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پہ علم و فکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہوگی۔ نیازؔ کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدر آباد میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی۔ اور میں نے ان کو، ان کے میزبان ہوش صاحب بلگرامی سمیت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی، اور شرمناک فحش کلامی کی بناپر غارت ہوکر رہ گئی۔ وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بناپر نیاز اور ہوش دونوں کو میری جانب سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا ہے۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں سویرا ہو گیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں، میں بھی خیر سے پٹھان ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ مشتعل ہو جانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہو جاتی ہے کہ وہ علت اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائے۔

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک "نگار" کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر تبرّا کرتے رہے۔ اور اس کے بعد ہر چند ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا۔ لیکن جب بھی ان کو موقع ملا انہوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

ہر چند اس وقت میں جوان اور سریع الاشتعال جوان تھا۔ لیکن نیاز صاحب

کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی، لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے طویل خط بھی لکھے، جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن بھی کر دیا جاتا۔

میں نہایت واضح طور سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی، کون معاف کر سکتا ہے ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا ہی شخص تسلیم کر لیا تھا، اور اس لئے انہوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی لکھا وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فی صد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے، تو دُنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیعِ اوقات ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے .... اس اُبلتی جوانی کے گرجتے برستے اشتغال میں کس کی یہ مجال تھی کہ گھنیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دُھوپ میں آکر بیٹھ جاتا۔

اس لئے میرے جواب نہ دینے کو' براہِ کرم' میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے۔ کہ ؎

بنیاد تھی اس کی' ناتوانی میری

بہر حال وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا۔ اب ہم دونوں ضارب و مضروب

بڑھے ہو چکے ہیں۔ سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رُخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں، لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹ آیا ہے۔

اس منزلِ عمر میں ہمارے واسطے یہ نازیبا اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بنا پر امرِ حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لئے کامل ذہنی دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت نیازؔ ان چند انے گنے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں، یہ دون پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاق کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اُتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگا لوں۔

کاش نیازؔ فتح پوری کا سا خالقِ طرز انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔

ہائے وہ عقل، جو نرغے میں ہو دیوانوں کے۔

فراقؔ گورکھپوری

آشفتہ بیانی میری

مجتبیٰ فرمان،

اب سے ہفتہ بھر پہلے شاید آپکو میرا کارڈ مل گیا ہو۔ حسبِ وعدہ نثر کی یہ چند سطور اور چند اشعار "نگارِ پاکستان" کے "نیاز نمبر" کے لئے حاضر کر رہا ہوں ۔ مجھے حضرت نیاز کی عظمت کے متعلق براہِ راست جو کچھ کہنا تھا وہ نثر میں عرض کر دیا۔ یوں تو اس سے بہت زیادہ کہہ سکتا تھا لیکن صحت کی معذوریاں مانع ہوئیں۔ نظم کے جو اشعار ہیں وہ صرف اس اُمید سے بھیج رہا ہوں اور وہ بھی ڈرتے ڈرتے کہ شاید انہیں پڑھ کر پاکستان میں نووارد حضرت نیازؔ کا دل ذرا شگفتہ ہو۔ یہ اشعار بستر علالت پہ پڑے پڑے بے ترتیبی سے ذہن میں آتے گئے اور میں اُسی بے ترتیبی سے انہیں لکھتا گیا۔ ان میں کوئی منطقی تسلسل نہیں ہے جو بات انہیں پوری اکائی بنا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام اشعار ایک زمین میں ہیں۔ اور شاید ہر شعر میں میرے مختلف اسالیب میں سے میرا ایک خاص اسلوب اور لب و لہجہ جھلک رہا ہو۔ ان کی داد حضرت نیازؔ سے نہ ملے گی تو کس سے ملے گی ۔ اور اگر ان میں سے کچھ اشعار حضرت نیازؔ کو خوش نہ کر سکیں گے تو پھر کسے خوش کر سکیں گے۔ حضرت نیازؔ سے میرا بہت بہت سلام کہئے گا۔

چند اشعار ہونے کے بعد جو شعر بھی ہوتا تھا وہ گویا حضرت نیازؔ کی حضوری

میں ہوتا تھا اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔

آپ کا

فراقؔ

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میرے مخلص و مکرّم و محترم حضرت نیازؔ فتح پوری لکھنؤ سے چلے گئے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ انہیں الوداع کہتا اور دائمی جدائی سے پہلے انہیں ایک بار دیکھ لیتا۔ یوں تو جب وہ یہاں تھے بہت طویل وقفوں کے بعد کبھی کبھی ان کے یہاں جاکر ان کے درشن کر لیتا تھا لیکن یہ تو اطمینان تھا کہ وہ قریب ہی ہیں، مجھے اپنا ہی شعر یاد آگیا۔ یہ سوچ کر کہ اب حضرت نیازؔ ہم سے دُور اور بہت دُور ہو گئے :-

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمّت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

خیر یہ قربؔ و دُوری تو ایک مسلسل اور پیچیدہ اور ناقابلِ حل مسئلہ حیات ہے آپ کے متعدد خطوط "نگارِ پاکستان" کے "نیاز نمبر" کے سلسلہ میں ملتے رہے۔ اور میں سوچ کر دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کے رہ جاتا تھا کہ طویل اور شدید علالت کے عالم میں اتنی تاب کہاں سے لاؤں کہ اپنے محترم اور بزرگ اور سراپا خلوص و شرافت دوست حضرت نیازؔ فتح پوری کے متعلق اپنے خیالات کو قلم بند کروں۔ بول کر بھی کچھ لکھوانے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی۔ ایک بہت بڑے مکان میں بے آل و اولاد اور بے رفیقۂ حیات چار پائی تھامے پڑا ہوں۔ یار و مددگار بھی کبھی کبھار میری تنہائی کا ہاتھ بٹا جاتے ہیں۔

حضرت نیازؔ کی زندگی اور ان کے کارنامے ناقابلِ فراموش چیزیں ہیں۔ کس آنکھ کی مجال ہے جو انہیں نظر انداز کر سکے۔ وہ ہمارے ادب و

تہذیب کے قطب مینار ہیں۔ میں قریب قریب ستر برس کی عمر میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ان کی تحریروں سے اُردو سیکھی ہے اور ان کا رسالہ "نگار" چالیس برسوں سے میرے لئے ایک فیض گاہ، درس گاہ رہا ہے میرا ناچیز ادب حضرت نیاز کے ادب سے بہت مختلف ہے۔ لیکن اس کی تخلیق وتعمیر میں حضرت نیاز کی تحریریں بہت ممد ومعاون و مؤثر قوت کا کام کرتی رہی ہیں۔

میں تو یہ کہوں گا کہ جو ادیب معتقدِ نیاز نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے یعنی

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

ایک بہت بڑی بات جو ان کے اعلیٰ ترین ادبی خدمات کے علاوہ حضرت نیاز میں مجھے نظر آئی وہ ان کی روشن خیالی بے تعصبی ہے۔ اُن کے حریف جو بھی کہیں لیکن میں ببانگ دہل کہوں گا کہ حضرت نیاز مسلمان ہیں لیکن کیسے مسلمان ہیں؟ ایک ایسے مسلمان جس کے اسلام پر ہندو دھرم بھی ناز کرے۔ خود میں بھی یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ میرے ہندو دھرم کے سر پر دُنیا کے تمام پیغمبروں اور خصوصاً پیغمبرِ اسلام کے دستِ شفقت کا سایہ ہے۔ میں نے حضرت نیاز کو ایک ایسا مسلمان پایا جو انسان دوستی کا جیتا جاگتا مجسمہ ہے۔ حضرت نیاز کی شخصیت وکردار میں عقلیت غالب عنصر ہے۔ میرے مزاج میں عقلیت مابعد الطبیعات وتصوّف یا ویدانت کا امتزاج رہا ہے۔ اگرچہ محض حال وقل کا غلبہ مجھ پر کبھی نہیں رہا لیکن حضرت نیاز کی روشن خیال عقلیت پر میں تمام ان وجدان زدہ ہندو مسلمانوں کی طبعی فرقہ پرستی کو ترجیح دیتا ہوں جو حال وقال کا بھی ثبوت دیتے ہیں اور اپنے سے دوسرے فرقہ والوں سے غیریت کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ حضرت نیاز کی "من ویزدان" نے ایک شریفانہ وتہذیب یافتہ اور ہمہ گیر اسلام کو پیش کیا ہے جس سے کسی غیر مسلم کو بھی اختلاف کرنا ذرا آسان نہیں ہے۔ یہی مولانا روم کا اسلام تھا، یہی صوفیوں کے تمام سلسلوں کا اسلام رہا ہے اور یہی فارسی کی بلند ترین شاعری کا پیغام ہے

حضرت نیازؔ پر ایک نہایت قابلِ قدر مفکر، مقالہ نگار، صحیفہ نگار، فسانہ نگار، نقد و تبصرہ نگار اور ایک بلند پایہ اسٹائلسٹ (STYLIST) کی حیثیت سے اگر اختصار سے بھی لکھا جائے تو وہ ایک دفتر ہو جائے گا۔ بیماری میں اتنی سکت کہاں سے لاؤں؟

تین چار ماہ کی علالت میں دس پانچ دن ایسے بھی گزرے کہ چند غزلیں ہو گئیں جن کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میرا مخصوص مذاق وجدان اپنی آخری حدیں ان غزلوں میں چھوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ علالت نے میری طبیعت کی فطری گھلاوٹ میں بڑا اضافہ کر دیا ہے اور میری شاعری ان غزلوں میں اپنی انتہائی منزلوں کی جھلک دکھا رہی ہے لیکن "نیازؔ نمبر" کے لئے یہ غزلیں کیا دیں گی۔ البتہ ایک ایسی غزل اس علالت میں ہونے لگی جو ایک قصیدہ کی تشبیب کی صورت پکڑتی گئی اور جس کے متعدد اشعار پر غالباً عرفیؔ اور مرزا بیدلؔ کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ ہند و پاک میں حضرت نیازؔ ان اَنے گنے لوگوں میں ہیں جو عرفیؔ اور مرزا بیدلؔ کے کلام کے خاص جاننے والے اور قدر شناس ہیں۔ شاید اس لئے اس خط کے ساتھ اشعار کی شکل میں جو آپ نے افکارِ پریشاں بھیج رہا ہوں نہایت موزوں و مناسب ہوں گے۔ کیونکہ حضرت نیازؔ ان اشعار کو اپنے لئے ایک پسندیدہ نذر و تحفہ سمجھیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ ان کے بلند مذاقِ شعری کی داد ان اشعار میں دی گئی ہے۔ یہی سوچ کر جب یہ کئی اشعار موزوں ہو چکے تو آخر میں میں نے یہ شعر تیر کی طرح ثبت کر دیا۔

مری یہ نذرِ عقیدت سرِ قدومِ نیازؔ\
صبا کے دوش پہ پہونچے بصورتِ اشعار

جو اشعار بھیج رہا ہوں وہ اس موقعہ کے لئے غالباً اس لحاظ سے نہایت موزوں سمجھے جائیں کہ اگر میرے اشعار حضرت نیازؔ کے متعلق ہوتے

تو پسندیدہ ہوتے لیکن چونکہ حضرت نیازؔ کے رچے ہوئے ادبی مذاق کے عین مطابق یہ اشعار ہیں اس لئے صحیح معنوں میں انہیں پھولوں کا ایک تحفہ یا نذرِ عقیدت سمجھا جاسکتا ہے۔ اور بجائے پسندیدہ ہونے کے انھیں پسندیدہ تر خیال کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناچیز خدمت شاید اس لئے کسی قابل سمجھی جائے کہ ان اشعار کو پڑھ کر حضرت نیازؔ وجد کریں گے۔ کسی قابلِ قدر ہستی کو عین اس کے وجدان و مذاق کے مطابق اشعار سُنا کر وجد میں لانا کیا ثبوتِ خلوص نہیں ہے؟ کہنے کو تو ہوگیا کہ اس یادگار موقع پہ فراقؔ نے ایک ایسا تحفہ حضرت نیازؔ کی خدمت میں پیش کیا جو حضرت نیازؔ کو پسند آیا۔

کہیں یہ قافلۂ صبح کے نہ ہوں آثار
سرِ اُفقِ شب غم اڑ رہی ہے جن کے غبار

مری صدا ہے گھنا سایہ وقتِ نصف نہار
بوقتِ شب مری آواز روشنی کا منار

دیارِ دل کے یہی ہیں علامت و آثار
تمام دشتِ جنوں ہے، تمام شہر نگار

نشانِ منزلِ عبرت ہر ایک راہ گزار
ہر ایک نقشِ قدم لاکھوں حسرتوں کا مزار

خیالِ زلفِ سیاہ سے گھٹائیں چھانے لگیں
دھواں سا اُٹھنے لگا دیکھنا سرِ کہسار

کسی کی چشمِ سیہ کے پیام لائے ہیں
یہ میگھ دوت جو منڈلا رہے ہیں سلسلہ وار

یہ جوگنیں سی کمنڈل لئے جو آئی ہیں
ان انکھڑیوں کا پتہ کام روپ یا تاتار

یہ امتزاجِ صفت ہائے قربت و دوری
بدن تمام گریز و تمام بوس و کنار

جو انگلیاں کبھی رکھ دی ہیں نبضِ دوراں پہ
پتہ چلا کہ فضاؤں کو آگیا ہے بخار

ارے یہ اہلِ سیاست ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں
وہی کریں گے یہ بعد از خرابیٔ بسیار

ہے ایسوں ہی سے خدا واسطے کا بیر ہمیں
عوام کے جنہیں دُکھ سُکھ سے کچھ نہیں سروکار

ہم اور کچھ نہیں کہتے مگر یہ کہتے ہیں
کہ آدمی کے نہ بس میں ہو آدمی زنہار

حریفِ ابلقِ گردوں کی باگ موڑ چکے
یہاں ہنوز وہی ذکرِ چرخِ کج رفتار

کچھ اور چاہئے جذباتِ خارجی کے سوا
کہ زندگی کو ہے اے دوست زندگی درکار

یہ پالنا ہے تو کہتے ہیں مارنا کس کو
سُنا تو ہے کہ کوئی ہے جگت کا پالن ہار

یہ رات اور یہ گرداب اور یہ طوفاں
درست لنگر و کشتی نہ ناخدا بیدار

رہے گا معرکۂ زیست تا یکے جاری
کہ ٹوٹتی ہی نہیں ہے یہ خیر و شر کی قطار

عجیب ملزمِ روزِ حساب ہوں یارب
ثواب سے بھی ہوں منکر گنہ سے بھی انکار

یہ انتشار جہاں ہے جہانِ نو کا نقیب
غبارِ راہ گذر میں نہاں ہے کوئی سوار

وہاں بہ گردشِ وجدانِ ذکر جاری ہے
جہاں ہیں حلقۂ موہوم سبحہ و زنار

یہ سحر کاریٔ فن ہے کہ ہے کرشمۂ چشم
مرے سخن کی دمک ہے کہ تابشِ رخسار

بہ یک نگاہ مشاہدے بنا بھی دے مجھ کو
چہ خوش بود کہ بر آید بہ یک کرشمہ دو کار

جو صاف گردشِ دوراں کی زد سے باہر تھے
تری نگاہ اُڑا لے گئی وہ لیل و نہار

مری نوا میں ازل کا ترنمِ سحری
مری صدا میں ابد کے سکوت کی جھنکار

ورائے کیف تھا اثر تھا فشردۂ انگور
عجیب حال مرا ہے کہ نشہ ہے نہ خمار

کل آئی رات گئے تیری یاد یوں مجھ کو
گماں ہوا کہ کہیں دور بج رہا ہے ستار

یہ کس کے غم میں فضائیں تھیں جامد و ساکت
یہ کس کی یاد سے چلنے لگی ہے بادِ بہار

مرے ہی دل کی ہیں کچھ دھڑکنیں زبان و مکاں
مرے ہی غم کے شرارے ثوابت و سیار

اثر سے فکرِ غزل کے گھٹا سی چھانے لگی
شعور پر لگا منڈلانے ابرِ گوہر بار

بس ایک سازِ شکستہ ہوں خاک آلودہ
بڑھا دیا مرے نغموں نے زندگی کا وقار

بہت زمانہ ہوا قیس کو مگر اب بھی
نواحِ نجد میں اُڑتا ہے ناتواں سا غبار

مجھے سکوتِ فضا میں گماں ہوا اکثر
کہ جیسے دوست کرے دوست سے کوئی اقرار

جلا رہا ہوں میں بیچ بیچ کے یہ چراغِ سخن
کہ پھونک دے نہ مجھے میری گرمیٔ افکار

یہ زخمِ دل کی نمائش یہ طرزِ خود رحمی
کچھ اس سے بڑھ کے ہے سنجیدگیٔ غم درکار

ان انگلیوں نے جو اک ساز چھیڑ رکھا ہے
وہ مہر و ماہ یہ تارے اسی کی ہیں جھنکار

لبوں سے وقتِ شہادت کرن سی پھوٹی ہے
حیاتِ نو کی بشارت ہے نغمۂ سر دار

کریں شرافت و اخلاق جس کی خود تعظیم
وہ میں ہوں روسیہ و بد سرشت و بد کردار

جمالِ یار خود آگاہ ہو گیا یارے
بڑا یہ کام کیا تو نے اے دلِ خوش کار

معانقہ بھی بس اک پہلوئے تلاشِ جمال
مشاہدہ بھی بس اک دیدۂ انتظار آلود
ہنوز ہوش نما غفلتوں کے جھونکے ہیں
یہ زندگی بھی ہوئی کیسی نیند سے بیزار
وہاں سے بول رہا ہوں جہاں کہیں بھی نہیں
تمام عالم ہو از کنار تا بہ کنار
ہوا زمانے کی جس کو نہ چین لینے دے
ہم اس کو زندگی سمجھیں کہ کوئی کُشتِ عجلہ

فراق ہوش میں ہے اب تو ایک مدت سے
اُتر سکا نہ مگر تیری دوستی کا خُمار
یہ میری نذرِ عقیدت بہر قدومِ نیاز
صبا کے دوش پہ پہنچے بصورتِ اشعار

ملا واحدی

نیازؔ اور دلّی

۱۹۱۲ء یا ۱۳ کی بات ہے ۔ چلچلاتی گرمی کی دوپہر تھی ۔ مجھے بخار چڑھا ہوا تھا ۔ اور میں زنانہ مکان میں لیٹا ہوا تھا کہ خواجہ حسن نظامی ایک صاحب کو ساتھ لئے میری عیادت کرنے آئے ۔ فرمایا ۔ یہ مولانا نیازؔ فتح پوری ہیں' اخبار کے ایڈیٹر ۔

توحید' بھیا احسان الحق مرحوم' رئیس میرٹھ کا اخبار تھا ۔ جس کا مضمون "کھو بکبیر" نوشتہ خواجہ حسن نظامی آج تک لوگوں نے فراموش نہیں کیا ہے ۔

توحید کے پہلے ایڈیٹر خواجہ صاحب تھے ۔ پھر نیازؔ صاحب کو اُن کا معاون مقرر کیا گیا تھا ۔ توحید ہفتہ وار علمی' ادبی اور سیاسی اخبار تھا' اور اس کی حیثیت قریباً وہی تھی جو کلکتے کے "الہلال"' لاہور کے "زمیندار" اور دلّی کے "ہمدرد" کی تھی ۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب بھی انگریزوں کے ویسے ہی مخالف تھے جیسے مولانا ابوالکلام' مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی تھے ۔ خواجہ صاحب کی البیلی اور نیازؔ صاحب کی پُرشکوہ تحریروں نے توحید کو بہت مقبول کر دیا تھا ۔

نیازؔ صاحب کی شہرت کی ابتدا ہو چکی تھی ۔ میں نے ان کا نام سُنا تھا اور شاید ان کی کتاب "شہاب کی سرگزشت" سے بھی واقف تھا ۔

پہلی ملاقات بالکل مختصر رہی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں نیاز صاحب حکیم اجمل خاں کے انگلش اسکول کے ہیڈ ماسٹر بن کر دلّی تشریف لائے تو میرے ہاں ٹھہرے اور پورا ۱۹۱۴ء ہم دونوں کا بڑے اخلاص سے گزرا۔ انگلش اسکول حکیم اجمل خاں نے اپنے فرزند حکیم جمیل خاں اور اپنے خاندان کے دوسرے لڑکوں کے واسطے کھولا تھا، اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز پر نیاز صاحب کو ہیڈ ماسٹر بنایا تھا۔

۱۹۱۴ء میں میرا ہفتہ وار رسالہ خطیب نکل رہا تھا۔ نیاز صاحب حکیم اجمل خاں کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے علاوہ خطیب میں علمی، ادبی اور مذہبی مضامین لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں اُن کی مذہبی تحریریں ادبی تحریروں کی طرح پسند کی جاتی تھیں۔

آج کل کی تو خبر نہیں، ۱۹۱۴ء میں نیاز صاحب نماز کے نہایت پابند تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ نیاز صاحب نے کہا۔ سنیما جاتے وقت مجھے حکیم اجمل خاں کے مکان سے لے لیجئے گا۔ میں نے اس وقت انہیں شریف منزل کی بجائے ہمیشہ شریف منزل کے سامنے والی مسجد میں عصر کی نماز پڑھتے پایا۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے زیرِ سایہ مرزا غالب کا گھر تھا۔ میں اور نیاز صاحب قریباً روزانہ فلم دیکھتے تھے۔ اور نیاز صاحب فلم دیکھ کر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور لکھتے تھے۔ "کیوپڈ اور سائیکی" انہوں نے کسی فلم ہی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

۱۹۱۵ء میں نیاز صاحب بھوپال چلے گئے اور میرے پاس اپنی جگہ مولانا عارف ہسوی کو چھوڑ گئے۔ عارف صاحب سے نیاز صاحب کے برادرانہ تعلقات تھے۔ عارف صاحب کا رجحان سیاست کی طرف زیادہ تھا۔ میں نے خطیب کا باب سیاست ان کے سپرد کیا اور پھر اخبار انقلاب جاری کر کے انھیں انقلاب کا کلّی مختار کر دیا۔ عارف صاحب نے میدان سیاست میں بڑی ترقی کی۔ اخبار انقلاب انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ تو عارف صاحب مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد خود دلّی پراونشل کانگریس کمیٹی

کی طرف سے اخبار کانگریس نکلا۔ لکھنا اور جیل جانا بس یہی ان کی زندگی تھی۔ عارف صاحب ۱۹۳۶ء میں دنیا سے سدھارے ہیں تو پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔

سیاسی آدمیوں میں ان کا سا اخلاص میں نے کم دیکھا ہے۔ وہ نیاز صاحب کے تو خیر فدائی تھے۔ لیکن میرے ساتھ اور علامہ راشد الخیری، خواجہ فضل احمد شیدا اور منشی عبدالحمید خاں، ایڈیٹر مولوی کے ساتھ انہوں نے جو اخلاص برتا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ انسانوں کے ساتھ ہی نہیں، کانگریس کے ساتھ بھی انھیں اخلاص تھا۔

۱۹۱۹ء میں مجھے نیاز صاحب کی دوبارہ ضرورت پڑی۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں کا روزانہ اخبار رعیت، بھیّا احسان الحق نے اور میں نے لے لیا تھا۔ نیاز صاحب سے درخواست کی گئی کہ چھٹی لے کر آجائیں اور رعیت کی چیف ایڈیٹری سنبھالیں۔ چنانچہ نیاز صاحب آگئے۔ اس دفعہ نیاز صاحب کا دلّی میں فقط تین مہینے قیام رہا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے جو اب امیرِ جماعتِ اسلامی ہیں۔ اخبار رعیت ہی کے سلسلے میں نیاز صاحب کی شاگردی اختیار کی تھی۔

مودودی صاحب ۱۹۱۹ء میں اٹھارہ انیس برس کے ہوں گے۔ نیاز صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ یہ اخبار نویسی سیکھنی چاہتے ہیں۔ تنخواہ نہیں لیں گے۔ بس ایک میز اور ایک کرسی کی ضرورت ہے۔

حکیم اجمل خاں کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری اور بھوپال کی مُلازمت کے وقت بھی نیاز صاحب نے لکھنا ترک نہیں کیا تھا۔ اور نیاز صاحب کی ادبیت کا آفتاب برابر بلند ہو رہا تھا۔ خاص طور سے علی گڑھ کالج کے طلبا ان سے بے حد متاثر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (نائب صدر جمہوریہ ہند) اور کئی اور طالب علم، عبدالرؤف (ڈپٹی کلکٹر) نور الرحمٰن (بیمہ کمپنی والے) وغیرہ نیاز صاحب کے ادبی معتقد تھے اور نیاز صاحب سے ملنے کے لئے دلّی کے پھیرے کیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

کو بھی میں نے اوّل بار نیاز صاحب کے طفیل دیکھا۔ منشی محمد الدین غلیقی۔ سید ظفر حسن علوی۔ حکیم مجیب الدین بقائی، نیاز صاحب ہی کی وجہ سے میرے گھر کی رونق بڑھاتے تھے۔ یہ تینوں انشار پرداز تھے۔ ان تینوں کے اور نیاز صاحب کے جمع ہو جاتے سے میرے گھر میں بہار اُتر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ گویا چمن میں مہکتے پھول کھل گئے۔

نیاز صاحب لئے دیئے رہنے والے آدمی ہیں۔ مگر بات کرتے ہیں تو انسان خوش ہو جاتا ہے۔ بات کرنے کا اللہ تعالیٰ نے انھیں سلیقہ دیا ہے ان کی باتیں جچی تُلی اور معیاری ہوتی ہیں۔ باتوں کے معاملے میں وہ مولانا ابوالکلام کی صف میں کھڑے کئے جا سکتے ہیں۔

عارف صاحب اخبار رعیت سے بے حد ناراض تھے۔ کیونکہ رعیت کی پالیسی معتدل تھی۔ عارف صاحب اسے کیسے پسند کرتے۔ نیاز صاحب بھی اکسٹریمسٹ نہیں ہیں۔ عارف صاحب اکسٹریمسٹوں سے چار قدم آگے تھے۔ آخر ان کی دُعا قبول ہوئی اور اخبار رعیت نے تین مہینے سے زیادہ عمر نہیں پائی۔

اخبار رعیت بند ہو گیا تو عارف صاحب نے جشن منایا۔ دلّی کی مشہور ڈیرہ دارنی موتی جان انداز کا میرے گھر پہ گانا کرایا۔ موتی جان کا ذکر میں نے اپنی کتاب "میرے زمانے کی دلّی" میں کیا ہے۔ مضمون نیاز اور دلّی سے اس ذکر کا تعلق ہے۔ لہٰذا اسے نقل کرتا ہوں۔

طوائفوں میں بھی اونچ نیچ ہے۔ خاندانی اور غیر خاندانی، شریف اور رذیل، سب قسم کی طوائفیں ہوتی ہیں۔ خاندانی طوائفوں کو ڈیرہ دار کہا جاتا ہے۔ موتی جان، جن کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کا شمار دلّی کے بڑے ڈیرہ دار خاندان سے تھا۔ انھیں لکھنؤ کی ڈیرہ دارنیوں کی طرح امراءُ رؤساء کے لڑکوں کی تربیت کرتے تو نہیں سُنا گیا۔ البتہ دلّی کے ہندو مسلمان عمائد ان کے درباری تھے عشا کے قریب موتی جان کے ہاں دربار لگتا تھا اور اس دربار میں دلّی کے ادیب اور شاعر

اور امرآ و رؤسا شریک ہوتے تھے ۔ موتی جان انتہا درجے مہذب اور شائستہ خاتون تھیں ۔ انداز تخلص تھا شعر کہتی تھیں ۔

ایک مرتبہ موتی جان میرے ہاں بھی گانا گانے تشریف لائی تھیں یہوا یہ تھا کہ سردار دیوان سنگھ مفتوں نے ۱۹۱۹ء میں دلی سے روزانہ اخبار رعیت جاری کیا تھا ۔ اخبار مالی دشواری کے سبب بیٹھتا دکھائی دیا تو بھیا احسان الحق نے اسے اس شرط پر لے لیا کہ میں فقط روپیہ لگاؤں گا کام قاضی صاحب اور سردار صاحب کریں گے ۔ میں نے اس اخبار کی چیف ایڈیٹری جناب نیاز فتح پوری کے حوالے کی ۔ حاجی ریاض الدین بریلوی وغیرہ رعیت کے معاون ایڈیٹر تھے ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صحافت کی ابتدا اعزازی طور پر رعیت کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوکر کی تھی ۔ تین مہینے بعد بھیا بھی ہار گئے اور رعیت بند کر دیا گیا ۔ میرے اور نیاز صاحب کے مشترک دوست مولانا عارف ہسوی رعیت کی معتدل پالیسی سے نالاں رہتے تھے ۔ انہیں رعیت کے بند ہونے کی بڑی خوشی ہوئی ۔

اخبار رعیت بند ہو گیا تو نیاز صاحب بھوپال واپس چلے گئے ۔ اور بھوپال سے رخصت ہوکر انہوں نے لکھنؤ میں ڈیرے ڈال دیئے ۔ اور رسالہ نگار کی ایڈیٹری اور کتابوں کی تصنیف و تالیف سے ان کی قابلیت کا ڈنکہ بج گیا ۔

دلی وہ برابر آتے جاتے رہے ۔ مگر جتنا قیام ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۹ء میں کیا تھا اتنا قیام دلی میں پھر کبھی نہیں کیا ۔

مولانا ابوالخیر مودودی

نیاز آخر الزّماں

چند یادیں چند تاثرات

"مولانا ابوالخیر مودودی کی رائے نیاز کے بارے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زندہ ادیبوں میں مُلّا واحدی، ارشد تھانوی، ضیا عباس ہاشمی ل احمد، مولانا ابوالخیر مودودی، اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ... ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ چند ایسی شخصیتیں ہیں جو نیاز کے اس حلقۂ اثر سے تعلّق رکھتی ہیں جو اجرائے نگار (۲۲ء) سے بہت پہلے بھوپال اور دہلی کے زمانۂ قیام میں بن چکا تھا۔ ان میں سے غالباً سبھی نیاز سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ تاہم انھیں حضرات کو نیاز کے حقیقی معاصرین میں شمار کرنا چاہیئے جن کو نیاز کی شخصیت وفن کے مطالعہ ومشاہدہ کا بڑے قریب سے موقع ملا ہے۔

مولانا ابوالخیر مودودی بعض وجوہ سے نیاز کے اس حلقۂ خاص میں خاص الخاص کی حیثیت سے رکھتے ہیں اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ نیاز کی شخصیت وفکر کے بہت سے سربستہ راز کھول سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے مولانا کے اس مضمون سے ہوگیا تھا جو انھوں نے "نقوش" کے "شخصیات نمبر" میں "نیاز فتح پوری" کے عنوان سے کسی وقت لکھا تھا۔ نیاز سے ابوالخیر مودودی کے اس تقرّب وخصوصیت کے پیش نظر، شروع سے میری خواہش اور کوشش رہی کہ "نیاز نمبر"

میں موصوف کا مضمون ضرور شامل ہو۔ چنانچہ دوسروں کے ساتھ میں نے مولانا سے بھی "نیاز" اور "بھوپال" کے عنوان پر لکھنے کی گزارش کی، مولانا نے میری ہمت افزائی فرماتے ہوئے خط کے جواب میں لکھا :۔

"جی ہاں "نیاز اور بھوپال" پر لکھنے والا ایک ہی نافرجام رہ گیا ہے کاش ...... ! قمر کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابوالاعلیٰ "بعد از خدا بزرگ" ہو گئے اور یہ نافرجام!

ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

ایک وہ جس نے قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا۔ جس نے ادبی درک نیاز صاحب کی صحبتوں میں حاصل کیا اور جس نے حضرت نیاز کو ادیب سے زیادہ ایک اعلیٰ قسم کا انسان پایا۔ یہ اس کی بدبختی ہوگی اگر وہ امتثالِ فرمان سے "دلِ بحساب اندر" قاصر نہیں ہے۔ ذہن دسویں جنوری سے لکھ رہا ہے، لکھے جا رہا ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ ذہنی ارتسامات کاغذ پر منعکس ہو جاتے۔"

اس جواب کے چند دن بعد بطور یاددہانی میں نے مولانا کو پھر خط لکھا۔ جواب آیا :۔

"بھائی "نیاز نمبر" ضرور شائع ہوگا۔ ضرور شائع ہوگا۔ سراپا سپاسِ نیاز لکھے گا، ضرور لکھے گا۔ جیسا کچھ بن آئے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ جیسا لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں سکتا اسی لئے لکھتا نہیں اور لکھوں تو پڑھتا نہیں "

یہ وعدہ کچھ اتنا حتمی تھا کہ بار بار لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خاموشی سے مولانا کے مضمون کا منتظر رہا۔ بدقسمتی سے مولانا اس اثنا میں بیمار پڑ گئے

انھیں لاہور سے باہر کچھ دنوں پنڈی میں قیام کرنا پڑا، مراسلت کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا یہاں تک کہ "نیاز نمبر" کی پہلی جلد شائع ہوگئی اور مولانا کا مضمون نہ آیا۔

"نیاز نمبر" حصّہ دوم کا کچھ حصہ چھپ رہا تھا اور کچھ کی کتابت ہو رہی تھی کہ مولانا خوش قسمتی سے یکایک کراچی آگئے اور میرے گھر کے قریب اپنے بھتیجے ابو محمودؔ صاحب کے ساتھ سعود آباد دلیر میں مقیم ہوئے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مولانا سے ملاقات ہوئی، بزرگانہ شفقت سے پیش آئے اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، فرمانے لگے "میں دو ڈیڑھ ماہ ٹھہروں گا اور مضمون دو چار دن میں مکمل کرکے دے دوں گا"، مجھے اطمینان ہوگیا لیکن افسوس ہے کہ وہ اپنا مضمون پورا نہ کرسکے اور جب یہاں سے رخصت ہونے لگے تو میرے اصرار پر بولے "آپ یہ ڈیڑھ صفحے رکھ لیجئے تاکہ آپ کو اطمینان رہے اور یہ اطمینان دلاکر رخصت ہوگئے۔ دوسرے ہی دن مولانا کا خط ملا۔ اس میں مضمون کا عنوان درج تھا، ڈیڑھ صفحوں کے علاوہ ابتدائی پیراگراف کا اضافہ تھا اور بقیہ مضمون جلد بھیج دینے کا وعدہ . . . . لیکن مولانا خدا جانے کن الجھنوں میں پھنس گئے کہ مضمون مکمل نہ کرسکے۔ "نیاز نمبر" کا دوسرا حصّہ بھی شائع ہوگیا اور مولانا کا مضمون نہ آنا تھا نہ آیا۔

مجھے "نیاز نمبر" میں اس مضمون کی کمی آج بھی محسوس ہو رہی ہے اور یہی احساس ہے جو اس نامکمل مضمون کو شائع کرنے پر مجبور کر رہا ہے اس سے کچھ اور ہو یا نہ ہو لیکن نیازؔ کے متعلق قارئین نگار کو ایک ایسے شخص کی رائے ضرور معلوم ہو جائے گی جو بہ ہر طور محرم راز ہے۔

(فرمانؔ فتح پوری)

نیازؔ آخر الزّماں پر لکھنا آسان مشکل ؟ جن نیاز صاحب کو میں جانتا ہوں وہ

"چاہ ستارہ" اور جو نیازؔ صاحب عام طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں وہ سیمائی نمود!
مدت سے ان کی شخصیت واقع ہوگئی ہے سہ گانہ۔ وہ ہیں اور اپنے آپ کو دکھاتے
ہیں کچھ اور سمجھے جاتے ہیں کچھ اور "نہ جانے کیا کیا" لیکن مجھے لکھنا ہے اپنے دیکھے بھالے
نیاز صاحب کے متعلق مدعانہ سہ رنگ حضرت نیازؔ کو جھٹلانا ہے اور نہ یکرنگ نیازِ آخرالزماں کو

نیازؔ صاحب سے میری ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی میں اس زمانے میں اپنے بڑے
بھائی (ابومحمد صاحب مرحوم) کے سایۂ عاطفت میں بھوپال میں مقیم تھا اور نیازؔ
صاحب سررشتۂ اوقاف میں معاون مہتمم۔ اوقاف کا دفتر ہمارے گھر سے پاس ہی تھا
بہت سے بہت ایک فرلانگ، پہلے سے کوئی سلسلہ تعارف نہ تھا، میں نے رقعہ بھیجا
سادہ تخاطب، تسلیم و کورنش سے معرا، "نیازؔ صاحب! ملاقات کا اشتیاق ہے،
مجھے وقت دیجئے یا آپ تشریف لائیے"، نیاز صاحب تشریف لے آئے۔

کھلتا شیام رنگ، عفتِ کردار سے شاداب درویش۔ آنکھوں میں گھنیری
ذہانت و ذکاوت اور چنچل پن بھی، گھنی داڑھی کی خوش نما سنجاف، اک
کیفِ استغنا۔

اور معنویت میں آفرید! میں کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ شاید معارف یا نقادؔ،
نیازؔ صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے "چونکایا" یہ کیا پڑھ رہے ہو!
"ساقی نامہ" پڑھو "ابرِ گہربار" پڑھو اور بات فارسی کلاسک میں چل نکلی۔
کچھ اس قرینے سے عام ادبی مباحث جیسے شفیق مربی مدت کے بعد اپنے دستِ
گرفتہ سے ملے اور تہ بہ تہ باتوں سے بھانپے کہ تربیت رائیگاں تو نہیں گئی، اور
طرحداری سے یہ ایما بھی کہ درسی کلاسک کو ایک بار پڑھ لینا کافی نہیں، ذہن
میں ادبی رچاؤ کے لئے مزاولت ضروری ہے۔

یہ کیا پڑھ رہے ہو! کیا پڑھا؟ سب تحلیل ہو گیا۔ کتابوں کے بغیر کتابوں
کی سیاحت، ادبی بات چیت میں لاہوت سے ناسوت تک سبھی کچھ، اور
یہ سب کچھ اسی حسنِ مراعات کے ساتھ جس کے اقتضا سے مجاز کو حقیقت میں ملفوف

کیا گیا تھا اور یوں ملاقات کے ساتھ ہی راہ و رسم خسروانہ نیازمندی اور بزرگانہ شفقت میں ڈھل گئی۔ بزرگی میں دوستی کا دل کش امتزاج، بے تکلفی میں اک تکلف، تکلف میں اک بے تکلفی، چھوٹا سا غیر مبہم ایک خط! حدِ فاصل بھی اور حدِّ اشتراک بھی۔

یہ خصوصیت کچھ میرے ہی ساتھ نہیں تھی، قمرالحسن (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی یہی حسنِ تادیب تھا، ابوالاعلیٰ سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی، قمر، قدیم داستانی ادب کے رسیا تھے، پورب دیس کے لوک گیت کہانیاں ان کو بہت یاد تھیں۔ ان کی آمد سے ادبی سیاحت میں ایک اور افق پیدا ہوا۔ ابوالاعلیٰ کو کلامیات سے شغف تھا، مساحت کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ ہماری شامیں نیاز صاحب کی خواجہ تاشی میں گزرتی رہیں۔ پھر نیاز صاحب نے ہمیں لکھنے پر اُبھارا: صرف باتیں ہی نہیں کچھ کام بھی ہونا چاہیئے۔ تم لوگ لکھو اور پڑھ کے سُنایا کرو، ہر مہینے کم سے کم ایک مضمون۔ ہم تینوں کے لئے حسبِ ذوق مستقل موضوع بھی مقرر کئے۔ لکھنا اور سُنانا اٹل تھا۔ مجھے نیاز صاحب ملک الموت نظر آنے لگے۔ لیکن زجرِ مشفقانہ سے مفر بھی نہ تھا۔ گھاس کاٹنی ہی پڑتی۔ مستعدی سے ہر مہینے صرف ابوالاعلیٰ ہی لکھتے سُناتے۔ یہ لکھنا سُنانا ان میں ایسا رچا کہ لکھ کے سنانے کی طرح پڑھنا ان کی عادتِ تحریر بن گیا۔ . . . . . . ''

سلہ یہ مضمون ابتدائے ستمبر ۱۹۶۳ء کے نگار پاکستان میں شائع ہوا۔ جب کہ علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالخیر مودودی دونوں حیات تھے

رئیس احمد جعفری

نیاز صاحب اور اُن کی شخصیت

نیاز صاحب سے میرے تعلقات کی نوعیت کچھ عجیب سی ہے۔ وہ میرے بزرگ بھی ہیں، راہ نما بھی، اور محسن بھی۔ بزرگ اس اعتبار سے کہ وہ میرے بزرگوں کے دوست ہیں۔ راہ نما اس لحاظ سے کہ مجھے جو تھوڑا بہت لکھنا آتا ہے اس میں ان کے سحر آفریں اندازِ تحریر کے تاثر کا پہلو اتنا زیادہ ہے کہ میں اُسے فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے، ایک مؤرخ کی حیثیت سے، ایک نقّاد کی حیثیت سے، ایک محقق کی حیثیت سے اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی تحریروں کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے اور یہ میں نے انہی سے سیکھا کہ افسانہ کی زبان اور ہوتی ہے، تاریخ کی اور تنقید، تحقیق اور تاریخ کی الگ، وہ میرے محسن اس حیثیت سے ہیں کہ بعض بڑے کٹھن مواقع پر انھوں نے میرا خیال کیا اور مجھے یاد رکھا۔ تعلقات کی یہ گراں بار حیثیتیں میرے اور ان کے ذہنی و فکری اختلافات میں مانع نہ ہو سکیں۔ اور اس چیز نے بہت بعد میں، لیکن پوری قوّت سے، مجھے یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بہت اچھے اور بہت بڑے انسان بھی ہیں۔ میں ان کے اندازِ فکر سے اختلاف کر سکتا ہوں اور بارہا کر چکا ہوں، میں ان کے افکار و خیالات، تحقیق و نظریات، اور داعیات سے اختلاف کر سکتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ایسا کیا بھی، لیکن جس چیز سے کبھی انکار نہیں کر سکتا وہ ہے ان کی عالی ظرفی اور مقامِ انسانیت "

میں نے نیاز صاحب کو دور سے بھی دیکھا ہے اور قریب سے بھی، اور میں اسے اپنی بد قسمتی سمجھتا ہوں کہ ان کے علاوہ بھی مجھے بعض بزرگوں کو قریب سے دیکھنے کا

موقعہ ملا۔ کاش یہ موقعہ مجھے نہ ملا ہوتا، کوئی حرج نہ تھا اگر میں نیاز صاحب کے مقام انسانیت کا زمزمہ سنج نہ ہوتا، لیکن جن کی عقیدت سے دل سرشار تھا ان سے بدظنی تو نہ ہوتی، وہ میری نگاہوں سے گر تو نہ جاتے! عقیدت کا سرمایہ جب لٹتا ہے تو انسان کو بڑی ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور یہ سطریں لکھتے وقت میں اسی ذہنی اذیت سے دوچار ہوں۔

نیاز صاحب کے خلاف، ان کے نام نہاد الحاد، دہریت اور بے دینی کے خلاف جو طوفان لکھنؤ میں اٹھا تھا، اگرچہ اس وقت میری عمر ۱۸ - ۱۹ سال سے زیادہ کی نہ تھی اور میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا، لیکن اس طوفان میں، پورے جوش وخروش کے ساتھ میں نے حصّہ لیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا، زمین وآسمان نیاز صاحب کے دشمن ہو رہے تھے، دوست کٹ گئے تھے، رفیقوں نے منہ موڑ لیا تھا، ساتھی کترانے لگے تھے، لیکن جب مطلع صاف ہوا، حالات بدلے، اور طوفان کے آثار نابود ہوئے، تو نیاز صاحب پھر نیاز صاحب بن گئے، وہی دبدبہ، وہی شان، وہی "نگار" کی حشر سامانیاں، وہی انشائیے، نیاز کی سحر طرازیاں، وہی فکر ونظر کے نئے زاوئے — گویا:۔

ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

دو سال کرسمس کی تعطیل میں، میرا لکھنؤ جانا ہوا، نیاز صاحب سے ملنے کا جی چاہا اور قدم بے ساختہ اُن کے دفتر کی طرف اٹھنے لگے، میں پہونچ گیا، وہ اس طرح ملے، اس شفقت اور محبّت کے ساتھ کہ گویا مجھ سے کسی غلطی اور گستاخی کا اظہار ہی نہیں ہوا تھا،...... یہ پہلا نقش تھا، نیاز صاحب کی عالی ظرفی کا جو میرے دل پر قائم ہوا۔

ماہ وسال گزرتے رہے، میں جامعہ ملیّہ سے بمبئی پہونچا، اور روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر بن گیا۔

بمبئی اور لکھنؤ میں کئی سو میل کا فاصلہ تھا لیکن اس فاصلہ کو "خلافت"

اور "نگار" کے تبادلہ نے بہت کم کر دیا تھا۔ بمبئی میں کم و بیش ۱۶ سال تک میرا قیام رہا۔ اس مدّت میں متعدد بار میں نے نیاز صاحب کے افکار و خیالات سے اختلاف کیا، اور اس اختلاف میں کبھی کبھی تلخی اور درشتی بھی پیدا ہو گئی۔ لیکن جب بھی لکھنؤ جاتا، نیاز صاحب سے ضرور ملتا اور وہ اس شفقت سے پیش آتے کہ میں ایک طرح کی ندامت سی محسوس کرنے لگتا۔

سیاسی طور پر بھی میرے، اور نیاز صاحب کے خیالات میں بعد المشرقین تھا، لیکن جب ہندوستان تقسیم ہوا اور حکومت ہند کے موجودہ وزیر مالیات مرارجی ڈیسائی نے جو اس وقت بمبئی کے وزیر داخلہ تھے مجھ سے صاف الفاظ میں فرمادیا کہ "اب آپ کی ہندوستان میں جگہ نہیں ہے۔ پاکستان تشریف لے جائیے"۔ اور میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی وقت نیاز صاحب کا ایک خط مجھے ملا جس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا،

انجمن اتحاد و ترقی کی طرف سے اردو کا ایک روزنامہ نکالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں "، آپ اگر اپنے خیالات میں ذرا سا لوچ پیدا کر سکتے ہوں تو لکھنؤ آجائیں"،

یہ خط نیاز صاحب نے اس شخص کو لکھا تھا جس کے "اینٹی نیشنلسٹ"، افکار و آرا سے وہ اچھی طرح واقف تھے، لیکن ان کے سمندر کے سے وسیع دل میں اس کے لئے اتنی گنجائش تھی کہ اپنے حلقۂ اثر میں اس کے لئے ایک باعزت جگہ پیدا کرنے کو تیار تھے . . . کیا یہ نیاز صاحب کی وسعتِ قلب کا یہ واقعہ ناقابلِ فراموش نہیں ہے؟ کیا میں اسے بھول سکتا ہوں۔

ہندوستان میں اپنی ہر چیز دفن کر کے میں پاکستان آگیا۔ یہاں آکر نئی زندگی بنانا پڑی، از سر نو زندگی کا آغاز کرنا پڑا ــــ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں،

اور مجھے وہ طریقے بھی نہیں آتے تھے جنھیں برت کر لوگ اپنی پرستش کرا لیتے ہیں، مکان، دوکان، دفتر کوئی چیز بھی میں الاٹ نہ کرا سکا،

کشاکشِ حیات کے بحرِ ناپیدا کنار میں مجھے کود جانا پڑا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ انسان دوسروں کا کیا ذکر اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے، میں نے سب کو فراموش کر دیا۔ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ لیکن نیاز صاحب اپنے ایک بے مایہ خورد کو نہ بھول سکے۔ کئی سال ہوئے وہ کراچی تشریف لائے۔ میں کراچی میں مقیم تھا مجھے خاص طور پر یاد فرمایا، اس دلسوزی اور شفقت سے حالات دریافت کئے، مشورے دیئے، تعلق خاطر کا اظہار کیا کہ میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ باتیں صرف ایک بزرگ خاندان ہی کر سکتا ہے اس بے لوث خلوص، اور بے ریا تعلق خاطر پر میرا دل خراج محبت پیش کرنے پر مجبور ہو گیا، اور اُنکی بلند و بالا شخصیت کے جو نقوش میں قبول کر چکا تھا۔ ان میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا۔

اب گزشتہ چند سال سے میرا زیادہ تر قیام لاہور میں رہتا ہے دو سال کی بات ہے۔ نیاز صاحب لاہور تشریف لائے۔ طفیل صاحب مدیر نقوش کی خواہش تھی کہ لاہور میں سب سے پہلی پارٹی نیاز صاحب کو وہ دیں۔ دعوت نامہ میرے پاس بھی آیا یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ان سے میرے دیرینہ مخلصانہ تعلقات ہیں۔ لیکن تعجب اس پر ہوا کہ شرکت کے لئے انکا ایک تاکیدی خط آیا۔ میں گیا، نیاز صاحب شاعروں اور ادیبوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ میں دیر سے پہونچا۔ آخر میں ایک کرسی خالی تھی۔ اس پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باتیں کرتے کرتے نیاز صاحب نے حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی مجھے انھوں نے دیکھ لیا۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ انھوں نے اپنے پاس جگہ پیدا کی اور بٹھا لیا اور اسطرح باتیں کرنے لگے جیسے میرے منتظر ہی تھے، میو گارڈن میں ایک ریلوے افسر کے ہاں قیام تھا، تاکید کی کہ وہاں ملنے آنا۔ تھوڑی دیر بعد پارٹی ختم ہو گئی دروازے پر طفیل صاحب سے ملاقات ہوئی، کہنے لگے آپکو میرا خط مل گیا تھا؟ میں نے جواب دیا ملگیا تھا لیکن اسکی ضرورت کیا تھی؟ دعوت نامہ کافی تھا، کہنے لگے نیاز صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ رئیس کو ضرور بلانا!" یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے! نیاز صاحب کی شخصیت کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں اور بہت اچھے مسلمان بھی، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں لکھنے بیٹھا ہوں تو جی چاہتا ہے لکھتا ہی چلا جاؤں لیکن کہاں تک؟ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

نیازؔ فتح پوری سے نیاز

نیازؔ صاحب یا "نگارؔ" (کیوں کہ نیازؔ صاحب نگار ہیں اور نگارؔ نیازؔ) ۔ شہر لکھنؤ کی ذہنی زندگی کے عجائبات میں سے ہے ۔ اونچے طبقے میں صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق ہونے کی پہچان یہ تھی کہ نگارؔ کا خریدار ہو اور نیازؔ صاحب کی رائیوں پر بحث کر سکتا ہو ۔ "نگارؔ محض ادبی جریدہ نہیں بلکہ ایک ادارہ ایک رجحان اور ایک قدر تھا" ۔ "نگار" کا نام ندوۃ العلماء سلطان المدارس اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ لیا جاتا تھا اور نگارؔ میں مضمون چھپ جانا ویسا ہی تھا جیسے کہ ان علمی اداروں سے سند مل جائے ۔ چنانچہ جب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مجھ سے کہا ۔ "نیازؔ صاحب نگارؔ کا انتقاد نمبر نکال رہے ہیں ۔ تم یورپ میں تنقید کے ارتقاء پر ایک مضمون لکھ دو" ۔ تو میں اُچھل پڑا ۔ "ارے بھئی نگارؔ میں مضمون اور میں اور پھر مجھے اردو لکھنا بھی نہیں آتی ۔ تم جانتے ہو کہ میں انگریزی میں ہی لکھتا رہا ۔ اور اب تک اُردو کا ایک جملہ بھی سیدھا کھڑا نہ کر پایا ۔" نورل صاحب خاموش ہو گئے ۔ مگر کچھ دن بعد پھر بولے "نیازؔ صاحب نے کہا ہے جیسی بھی اُردو لکھ سکتے ہوں ویسی اُردو میں لکھ دیں ہم ٹھیک کر لیں گے ۔" اور میں نے اُردو میں لکھنے کی کوشش شروع کر دی ! ور مضمون لکھ ڈالا ۔ وہ مضمون اُردو میں یہاں تک تھا کہ جو اُردو میں گھر میں بولتا آیا تھا ۔ اسے لکھنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ مگر اس میں فقرے الفاظ اکثر جملے انگریزی کے تھے ۔ یہ مضمون لے کر میں نیازؔ صاحب کے پاس گیا ۔ اور نہایت انکساری

سے عرض پرداز ہوا۔" مجھے اردو بالکل نہیں آتی ۔" نیازؔ صاحب نے مضمون پر نظر ڈال کر کہا" کیا ہے آجائے گی انگریزی میں لکھنے کی کافی مشق ہے اور پھر اردو آپ کی مادری زبان ہے آخر۔" یہ بات نیازؔ صاحب نے ایسے لہجہ میں اور اس اطمینان کے ساتھ کہی کہ مجھے ایک قسم کا یقین ہوگیا کہ میں بھی اردو لکھنے لگ جاؤں گا ۔ جب میں واپس آرہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ نیازؔ صاحب سچ مچ زوردار ہستی کے مالک ہیں اور ان میں وہ قابلیت ہے جس سے دوسرے کے دل میں اعتماد پیدا ہو جائے ۔ یہ میری نیازؔ صاحب سے پہلی ملاقات تھی ۔ میں نے انہیں خود اعتمادی کا مجسمہ پایا اور ان سے مل کر مجھ میں بھی ایک مخصوص اعتماد کی لہر دوڑ گئی ۔ میرا وہ مضمون انتقاد نمبر کا سب میں پہلا مضمون تھا ۔ اس امر نے بھی میرے اعتماد کو ترقی دی ۔ میں نے اس مضمون کو پڑھا اور یہ محسوس کیا کہ میری انگریزی زدہ اردو کو کس آسانی سے مستند اردو میں تبدیل کیا جاسکتا ہے ۔ اور مجھے یہ شوق ہوا کہ اردو میں بھی لکھوں ۔ اب سے میں نیازؔ صاحب کے پاس ہر دوسرے تیسرے جاتا رہا ۔ ان سے مختلف قسم کی باتیں کرنے ہی سے ان کی ہستی کا اثر مجھ پر غالب آتا رہا ۔ ایک دن باتوں باتوں میں میر انیسؔ کا ذکر آیا اور انگریزی کی ایک اور ڈرامائی شاعری سے مزاثی کے تعلق تک بات پہنچی ۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ۔ نیازؔ صاحب نے فرمایا" ان کو لکھتے کیوں نہیں"۔ میں ہچکچایا ۔ وہ کہنے لگے "جیسے بھی ہو لکھ کر مجھے دیتے رہیں ۔ میں دیکھ لوں گا ۔ چنانچہ آٹھ مہینے تک میں "مرثیہ نگاری اور میر انیسؔ" کے حصے کو لکھ لکھ کر نیازؔ صاحب کو دیتا رہا ۔ اور وہ ضروری اصلاح کے بعد انھیں "نگارؔ" میں چھاپتے رہے مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک دم سے مشہور ہوگیا ۔ اردو کے جرائد میں میرا ذکر آنے لگا ۔ اردو کے پروفیسر میری رایوں پر اظہارِ خیال کرنے لگے ۔ لکھنؤ میں مرزا جعفر علی خاں اثرؔ نے طویل اردو لکھی جو مجھے انجمن اربابِ ذوق" کی ایک نشست میں بلا کر سنائی گئی ۔ شہر لکھنؤ میں مجھے قاتلِ انیسؔ کا لقب دیا گیا ۔ اور ایک روز میری

مورہ کو گلیہ کو مجھے اپنی طرح مارنے کی بھی کوشش کی گئی۔ کچھ عرصے میں وہ ہنگامہ فرو ہوگیا۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اُردو لکھنا آگئی۔ یہ سب نیاز صاحب کا کرشمہ تھا۔ میں نے انہیں اُستاد مانا اور ہمیشہ مانتا رہوں گا۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے اُردو ادب میں گھسیٹ لائے، سہارا دے کر مجھے اُبھارا اور اس مقام پر پہنچایا کہ میری تصانیف کی کوئی وقعت ہو یا نہ ہو میں اُردو کا نمایاں مصنّف ضرور ہو گیا۔

ساتھ ہی ساتھ نیاز صاحب کی زور دار انفرادیت نے مجھ پر ایک اخلاقی یا رُوحانی اثر بھی کیا۔ میں ان کے یہاں اس طرح جاتا رہا جیسے پُرانے زمانے میں مرید لوگ اپنے پیروں کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی خاص ادبی مسئلہ پر بات چیت ہوتی اور نیازؔ صاحب کی ہستی کے کوئی نہ کوئی پہلو پر روشنی پڑتی۔ نیازؔ صاحب مجھے اپنی تصانیف دیتے رہے اور میں ان کے پڑھنے کے بعد ان پر اپنی رائے دیتا رہا۔ اس طرح مجھے ان کی علمی اور ادبی حیثیت کا پورا اندازہ ہوگیا۔ ان کی کتابیں ہر علم اور ادب کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتی تھیں اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک ENCYCLOPAEDIST ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ہمارے جدید اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں تعلیم نہیں پائی۔ مگر وہ تمام مضامین جو ان سب اداروں میں لاحاصل طریقے پر زیرِ درس لائے جاتے ہیں، نیاز صاحب کی نظر میں اس طرح سے آئے کہ انہوں نے ان سے متعلق بہترین کتابوں کا مطالعہ کیا اور پھر ان پر اپنی انفرادی نظر ڈال کر انہیں اس طرح پیش کیا کہ ایک طرف وہ ان کا اپنا علم معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اُردو داں طبقہ کے مذاق اور سمجھ کے مطابق ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نیازؔ صاحب کی مختلف موضوعات پر کتابیں ہمیں علمی اداروں سے زیادہ علم سے قریب لے آتی ہیں۔ مثلاً جنسی نفسیات پر ان کی کتاب "شہوانیات" بظاہر تو ہمیں وہ سب کچھ دیتی ہیں جو اس موضوع پر انگریزی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں

کہ اس میں جدید ترین نظریات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے مگر جس عمدہ طریقہ پر اس کتاب میں جنسی نفسیات کے بنیادی اصول ہمارے سامنے لائے گئے ہیں وہ ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔ ہر علم کے سلسلے میں ان کی خاص قابلیت اپنانا "جو دید تعلیم سے حاصل ہو جانا ضروری نہیں" یہ ایک انفرادی اور خداداد صفت ہے۔ اس کی بنا پر نیاز صاحب کی سب علمی کتابیں ان کی بالکل اپنی معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک مخصوص روشنی جو ہمیں پہلے کہیں نہیں دکھائی دی تھی علمی مسائل پر اس طرح پڑ رہی ہے کہ ان کی باریکیاں ہمارے سامنے آتی چلی جا رہی ہیں' ان کی POPULARITIES سے بھی قابلیت کا زبردست مظاہرہ ہوتا ہے اس دور میں علم کے لئے اس قدر مواد جمع ہو گیا ہے کہ ہر علم کچھ مخصوص لوگوں کا ہوا جا رہا ہے۔ اس لئے یورپ کے مصنفین نے یہ ضرورت محسوس کی کہ علوم پر عام فہم کتابیں دل کش طرز پر لکھیں۔ برنارڈ شا اور ایچ جی ویلز تک نے تاریخ اقتصادیات۔ سیاسیات۔ سائنس وغیرہ پر ایسی کتابیں چھوڑی ہیں نیاز صاحب کی علمی کتابیں بھی اس دائرے میں آتی ہیں۔ یہ بھی مصنف کی علمی دلچسپی کا علم کو دلچسپ بنانے کی قابلیت کا اظہار کرتی ہیں اور اس طرح جدید اردو ادب میں بڑا اہم اضافہ ہیں۔ علمی کتابیں جلد فرسودہ ہو جاتی ہیں کیونکہ علم آج کل بڑی تیز رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ نیاز صاحب کی کتابوں میں بھی اکثر جگہ جدید ترین اضافے معدوم نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کمی نگار سے پوری ہو جاتی ہے۔ جس میں ہر علم کے جدید ترین مسائل اور نظریوں پر نیاز صاحب کے مضامین نکلا کرتے ہیں۔ ان سب کو ملا کر اگر دیکھا جائے نیاز صاحب ایسے انفرادی قسم کے عالم اور معلم معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں اب تک شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ وہ ہمارے ادب کی پہلی ہستی ہیں۔ جنہوں نے علم کو کتب خانوں اور مکتبوں سے باہر لا کر شاہراہ عام پر کھڑا کیا اور ہر فرد بشر کو اس کی روشنی سے لطف اندوز ہونے کا سامان بہم پہنچایا۔ کچھ عرصہ ہوا

کہ لکھنؤ کے ایک ناشر نے مجھے بتایا کہ سب سے زیادہ کتابیں نیازؔ صاحب کی بکتی ہیں ۔ مجھے تعجب ہوا کہ محض علمی کتابیں عامیانہ ناولوں سے زیادہ کیونکر بک سکتی ہیں ۔ مگر پھر بھی مجھے احساس ہوا کہ نیازؔ صاحب میں مقبول ہونے کی کتنی قابلیت ہے ۔ اور جس سے انہوں نے قوم کو کس قدر فائدہ پہنچایا ہے ۔ اگر اسی بنا پر ان کی حقیقی قدر کی جائے کم ہے ۔

مگر میری نگاہ میں نیازؔ صاحب ایک مذہبی عالم کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ، پرانے مذہبی لوگ انہیں برا کہتے ہیں ۔ یہ کوئی بات نہیں ہے ! ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی " من ویزداں " والی جلدیں بڑی اہم ہیں ۔ مجھے انہوں نے یہ سب جلدیں دیں اور میں نے ان سب کو پڑھا ۔ ان میں زیادہ تر مضامین ان غلط فہمیوں کو صحیح کرنے کے لئے لکھے گئے تھے جو ہمارے یہاں کم علمی اور توہم پرستی کی وجہ سے عام ہو گئے ہیں ۔ نیازؔ صاحب نے ان پر عقل اور فلسفہ کی روشنی ڈالی ہے ۔ فرد فرد مضامین سے زیادہ میں پوری تصنیف کے مجموعی اثر سے مرعوب ہوا ۔ یعنی نیازؔ صاحب کی ہستی کے مذہبی پہلو سے ، اسلام اخلاقی مذاہب میں سے ہے اور محض عقائد سے زیادہ عمل الصالحات پر زور دیتا ہے ۔ ہمارے یہاں آخر الذکر کو پس پشت ڈال کر اول الذکر جس عوامی اور توہم پرست طریقہ پر برتا جا رہا تھا اس کے خلاف نیازؔ صاحب نے قلم اٹھایا ۔ مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے مختلف فرقوں کے پچاس عالموں کے نام خطوط بھیجے اور دریافت کیا کہ نیک عمل کافر اور بد عمل مسلمان ، ان دونوں میں سے کون بخشا جائے گا ۔ سب عالموں نے یہی جواب دیا کہ مسلمان بخشا جائے گا ۔ چاہے وہ کتنا ہی بد عمل ہو ۔ اس معاملہ پر نیازؔ صاحب نے میری بھی رائے لی ۔ اور میں نے بھی یہی رائے دی کہ مسلمان ہی بخشا جائے گا ۔ عرصہ گزر گیا ۔ میں لکھنؤ سے کراچی آیا اور یہاں پر مسلمانوں کے عمل کی جن جن صورتوں سے دوچار ہوا ان سب نے مجھے

نیازؔ صاحب کا استدلال یاد دلایا۔ اس سال جب نیازؔ صاحب کراچی آئے اور میں ان سے ملنے گیا تو پہلی بات جو میں نے ان سے کہی وہ یہ تھی کہ اس معاملے میں میں اب بالکل آپ کی رائے پر آ گیا ہوں۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کے سلسلے میں نیازؔ صاحب کتنی بلند نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ مجسمۂ اخلاق غیر مسلم کو بد اخلاق مُسلم سے زیادہ بخشش کا اہل سمجھتے ہیں۔ اس لئے مسلمان انہیں مسلمان کہنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان کو اخلاق و عمل سے کوئی غرض نہیں ہے محض پارٹی بندی اور چار آنے کی ممبری ہی خدا کے یہاں بھی چلے گی۔ کیونکہ میں مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا' میں بھی لاشعوری طور پر اس بات پر عقیدہ کرتا تھا اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عقل اور دلائل سے کام لیتا تھا۔ مگر مسلمانوں اور مذاہب کا اور قریب سے مطالعہ کرنے پر میں نیازؔ صاحب کی رائے سے زیادہ سے زیادہ قریب آتا گیا۔ غرض میں نیازؔ صاحب کو بڑے کھرے مسلمانوں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے مذہب کی کیا تعریف کی جائے تو انہوں نے کہا" میں بالکل سُنّی مسلمان ہوں اس سے کچھ زیادہ نہ کم"۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ خالص سُنّیت کی مثال بتاؤ تو میں نیاز صاحب کا نام لے دوں گا۔ ان کی سُنّیت وہی ہے جو مولانا رومؔ کی ہے یعنی کامل غیر جانب داری۔ مذہب بندی اور فرقہ بندی سے بالاتر۔ ایک دفعہ میں نے نیازؔ صاحب پوچھا کہ محمد صلعم کے جانشین . . . . کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے اپنے زور دار طریقہ پر کہا" رسول اللہ صلعم علی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے اور علی ان کے مناسب جانشین ہوتے۔" میں نے کہا" پھر حضور صلعم نے صاف صاف اس طرح علی کو اپنا جانشین کیوں نہ بنا دیا۔ جیسا کہ اکبر مرتے وقت جہانگیر کو بنا گیا تھا۔ نیاز صاحب نے کہا" اس کے حالات سے آپ واقف نہیں ہیں۔ "عربوں کے حالات ایسے ہو گئے کہ اکبر کا سا قدم اٹھایا جاتا تو اسلام میں

رخنے پڑ جاتے۔" میں نے کہا "غرض اس معاملے میں آپ شیعہ نقطۂ نظر سے بہت قریب ہیں۔" وہ بولے "آپ کی طرح میں اسے مذہب کا جزو نہیں سمجھتا۔ آپ کے لئے علی کی ولایت مذہب کا عقیدہ ہے بغیر اس کو مانے مذہب پورا نہیں ہوتا۔" میرے لئے اللہ اور رسول اللہ سے آگے اور کچھ ماننا ضروری نہیں ہے۔" چنانچہ اکثر ان سے رسول اللہ کے بابت بھی باتیں ہوئیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ آنحضرت کو کامل ترین انسان مگر انسان بتایا۔ خدا کے بابت بھی بڑی دلچسپ باتیں رہیں۔ وہ خدا کے بابت ہر قسم کے نظریات سے بہت اچھی طرح واقف نظر آئے مگر اسی سلسلے میں ایک روز انہوں نے عرفی کا یہ شعر پڑھا۔

؎ حد کُنہِ تو با دراک نہ شاید دانست ۔۔۔ دیں سخن نیز باندازۂ ادراک منست

اور بولے "پہلا مصرعہ تو کچھ نہیں دوسرا مصرع کمال ہے۔ بات اسی دوسرے مصرع سے بنتی ہے۔" اور پھر مذہب سے ادب کی طرف گریز ہوگیا۔ عرفی پر باتیں ہونے لگیں۔ عموماً میرے اور نیاز صاحب کے درمیان موضوع بات چیت ادب ہی ہوتا تھا۔ مذہب۔ سیاسیات۔ گھریلو باتیں اور بزنس بھی باتوں باتوں میں آجاتا تھا۔ مگر خدا پر عقیدہ کے سلسلے میں میں نے بہت پڑھا بہت سوچا اور بہت بحث کی۔ لیکن آخر کار مجھے نیاز صاحب کا یہ شعر سنانا یاد آتا ہے اور ان کا اس بات پر زور کہ "خاص بات دوسرے مصرع میں ہے۔ اس سے آگے کوئی شاعر نہیں جا سکا" اور پھر میں ادب کی طرف آجاتا ہوں جو میرا مخصوص دائرہ ہے اور جو نیاز صاحب کا بھی اتنا ہی مخصوص دائرہ ہے۔

ان کی فطرت کی ہمہ گیری جیسی علم کے سلسلے میں نمایاں ہوئی ویسی ادب کے سلسلے میں بھی مجھ پر روشن ہوئی۔ نیاز صاحب نے شاعری بھی کی مگر اپنی شاعری کو میرے سامنے کبھی اہمیت نہیں دی۔ تاہم نقّاد کی حیثیت سے وہ اس وقت تمام نقّاد سے آگے نظر آئے۔ شعر کی پرکھ، الفاظ کی خوبی کی پہچان، فصاحت اور بلاغت کے مذاق میں ان سے آگے مجھے کوئی نقّاد نہ دکھائی دیا۔

انہوں نے مجھے "انتقادیات" کی بھی ایک جلد دی جس کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ذوقِ شعر کسے کہتے ہیں۔ اور اس ذوق سے ہمارے جدید نقاد جو انگریزی تنقید سے ایک ہلدی کی گرہ لے کر پنساری بن گئے ہیں کس قدر بے بہرہ ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد آتا ہے۔ ایک دن میں نیاز صاحب کے یہاں پہنچا تو وہ اپنے یہاں برآمدے میں بیٹھے ہوئے پی جی وڈ ہاؤس P.G. WODE HOUSE کی ناول یوکرج UKERIDGE پڑھ رہے تھے۔ میں نے کتاب کو دیکھ کر کہا "پی جی وڈ ہاؤس کا مزاح دیرا ثر نہیں ہے" نیاز صاحب نے کہا "جگر صاحب کی شاعری کی طرح" میں نے کہا "جگر صاحب شاعری تو مجھ پر بالکل اثر نہیں کرتی" نیاز صاحب مسکرائے اور بولے "یہ بات ہر ایک سے کہنے پھرنے کی نہیں ہے۔" غرض دوسرے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ایک دن جگر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں جگر صاحب نے اپنے پسندیدہ اشعار میں سے شعر سنایا ؎

اپنی اپنی وسعتِ فکر و نظر کی بات ہے، جس نے جو دنیا بنا ڈالی اُسی کا ہو رہا

دوسرے دن میں نیاز صاحب کے پاس جا پہنچا۔ جگر صاحب سے ملاقات ہونے کا حال بیان کر کے یہ شعر سنایا اور بولا "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے نے سارا مزا کرکرا کر دیا ہے۔" نیاز صاحب نے کہا "میں اس شعر پر تنقید کر چکا ہوں۔" اور نگار کا ایک پرانا نمبر لاکر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں جو مضمون تھا اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ قواعد اور محاورے الگ ہو جانے پر شعر کا اثر کس طرح جاتا رہتا ہے۔ اس وقت تک میں جدید نقاد کی ہم نوائی الفاظ اور عروض پر نکتہ چینی کو ایک فرسودہ عمل سمجھتا تھا مگر اس مضمون نے، پھر متعدد بار نیاز صاحب نے بات چیت سے یہ ثابت کر دیا کہ شاعری پر تنقید کے سلسلے میں زبان پر تنقید سب سے زیادہ بنیادی چیز ہے۔ اس بات نے میری انگریزی تنقید پر نظر کو بھی گہرا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ

انگریزی کا ہر نقاد پرانے زمانے سے لے کر آج کل کے ٹی۔ ایس ایلیٹ تک شروع زبان ہی سے کرتا ہے اور اس سے اصولِ کلیات اور نظریات تک پہنچتا ہے۔ ہماری سطحی اور سرسری تعلیم ہمیں محض اصول سے مس کرتی چلی جاتی ہے۔ اور ان ہی اصولوں کو ہم اُلٹا سیدھا سر پر لاد کر نقاد بنے پھرتے ہیں۔ اور جدید تنقید کا ڈھونگ رچا کر زبان پر تنقید کو مطعون کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ہماری نظر سطحی رہ جاتی ہے اور اگر کوئی شعر ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ برخلاف اس کے نیاز صاحب قطعی رائیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور اپنی رائیوں کو نہایت زور کے ساتھ استدلال سے ثابت بھی کر لیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کی تنقید جدید تنقید کی ہچکچاہٹ اور گول مول باتوں سے بالکل خالی ہے اور ان کی اس صفت نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ جب میری تصنیف مرثیہ نگاری اور میر انیس قسط وار نگار میں چھپ رہی تھی تو میں لکھنؤ میں اس کے بابت ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے اس کے آخری ابواب نیاز صاحب کو دیئے انہوں نے پڑھنے کے بعد کہا "کچھ زور کم ہو گیا۔ شاید ہنگامے سے متاثر ہو گئے" میں نے اس وقت کچھ جواب نہ دیا۔ مگر بعد میں سوچتا رہا کہ کیا جس جسارت سے میں نے اس کتاب کو شروع کیا تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کو ختم ہو گئی۔ بہر حال میں کچھ ہوں مگر نیاز صاحب کے بابت مجھے یقین ہے کہ ان سے زیادہ جسارت اردو کے کسی نقاد نے نہیں دکھائی۔ یہ جسارت ان میں اپنے تنقیدی اصولوں پر کامل اعتماد سے پیدا ہوئی ہے۔ مگر زیادہ اس کی بنیاد ان کی زور دار انفرادیت معلوم ہوتی ہے۔ جدید تعلیم نے جو بے یقینی پیدا کر دی ہے اس سے وہ بہت دور ہیں۔ جس زمانے میں میں نیاز صاحب کے یہاں جایا کرتا تھا اسی زمانہ میں میری سرور صاحب سے بھی گاڑھی چھنتی تھی۔ سرور صاحب کو میں جدید طریقۂ تنقید میں سب سے زیادہ آگے سمجھتا تھا۔

اور نیاز صاحب اور سرور صاحب کا تقابل کچھ شعوری اور کچھ لاشعوری طور پر کرتے لگا تھا۔ سرور صاحب کا گول گول باتیں کہہ کر ٹھہر جانا اور قطعی رائے دینے سے انکار کرنا اور نیاز صاحب کے زور کے ساتھ اٹل رائے دے دینا ایک ایسا تضاد تھا جو مجھے نیاز صاحب کو ان پر ترجیح دینے پر مجبور کرتا۔ ایک معاملے میں مجھے نیاز صاحب کی تنقید کمزور نظر آئی۔ ہوا یہ کہ سرور صاحب اور میں ساتھ ان کے یہاں گئے۔ انہوں نے سرور صاحب کو ایک موٹی سی کتاب واپس دیتے ہوئے کہا۔" زبان کے لحاظ سے یہ کتنی ہی بڑی کتاب ہو مگر مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہوئی۔" میں نے اس موٹی کتاب کو ہاتھ میں لے لیا۔ وہ دستوفسکی کی" براور کارامانزاف" تھی۔ میں نے تعجب سے نیاز صاحب کو دیکھا اور کہا۔" اوّل تو ناول کے سلسلے میں زبان کی خوبی کوئی معیار نہیں پھر اس ناول کی زبان سے ہمیں کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ ترجمہ ہے روسی زبان سے، جس کی الف بے تک سے ہم واقف نہیں۔ اس کی خوبی کردار نگاری کی گہرائی میں ہے۔ جس تک دُنیا کا کوئی اور ناول نگار نہیں پہنچ سکا۔" سرور صاحب نے کہا۔" اسے دُنیا کی عظیم ترین ناول کہا گیا ہے۔" میں نے کہا" وسعتِ نظر میں ٹولسٹوئے کی" وار اینڈ پیس" اس سے زیادہ عظیم ہے مگر گہرائی میں یہی آگے۔ مجموعی طور پر میں اسے دُنیا کی ناول نگاری میں دوسرا مقام دوں گا۔ ناول کے فن سے بد مذاقی کی دلیل ہے۔" خیر موضوعِ سخن بدل گیا۔ مگر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یورپ کے مخصوص فن کی روح سے نیاز صاحب دُور ہی رہے۔ ان کا دائرہ ہماری روایات کے فن تک محدود ہے مگر اس دائرے کے اندر وہ کامل ضرور ہیں اور اس لئے ہماری تنقید نگاری میں ان کا مستقل مقام ضروری ہے۔

اس کے علاوہ نیاز صاحب نے افسانہ نگاری کے بھی اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے مجھے" شہاب کی سرگزشت" خاص طور پر پڑھنے کیلئے

دی۔" "شاعر کا انجام" "جمالستان" کے افسانے بھی میں نے پڑھے۔ ظاہر ہے
کہ نیاز صاحب واقعاتی ناول اور افسانہ کی مخصوص صفات سے بہت دُور ہیں۔
ان کی زندگی پر نظر اسی ٹھپے کی ہے۔ جیسی نذیر احمد اور شرر کی تھی۔ ان
کا مقصد درسی اخلاق ہے اور اس قسم کی نفسیات نگاری سے جس کا
عظیم ترین شاہکار "برادر کار مانتراد" ہے۔ ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ان
افسانوں میں بیانات اور مسائل کی وضاحت ہی ہماری توجہ کا مرکز ہوتے
ہیں۔ یہاں ایک راز کھلتا ہے جو نیاز صاحب کی جینیس (GENIUS)
کے مخصوص رجحان کو ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ ان کی فطرت اگر کسی صنف
ادب کے لئے مخصوص طور پر موزوں ہے تو وہ صنف (ESSAY) ہے۔
انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ گھوم پھر کر مضمون نگاری کے دائرے میں آجاتا
ہے اور اس صنف کا اگر میں ان کو اپنے ادب میں سب سے بڑا ماہر کہوں
تو بے جا نہ ہوگا۔ سرسید نے جس کام کو شروع کیا تھا وہ نیاز صاحب کی
تصانیف میں کمال پر پہنچتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مخصوص حصے بیانیہ
مضامین کے وہ شہ پارے ہیں جن کی مثال اُردو میں ملنا مشکل ہے۔ ان کے
مذہبی اور سیاسی مضامین بحث اور وضاحت کرنے والے مضامین کے شاہکار
ہیں۔ جن جن اقسام کے مضامین ہمیں دُنیا کے ادب میں نظر آتے ہیں ان سب
کی بہترین مثالیں اگر ہمارے یہاں ڈھونڈی جائیں تو وہ نیاز صاحب ہی کی
تصانیف میں ملیں گی۔ یوں تو ان کے سب ہی مضامین دلچسپ ہیں مگر ان میں
سے بہترین کو چھانٹ کر ایک جلد تیار کی جاسکتی ہے۔ جو ان کی مضمون نگاری
ہی کی نمائندگی نہ کرے گی۔ بلکہ یہ بھی دکھائے گی کہ اس صنف میں ہمارے
ادب میں کہاں تک کمال حاصل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نیاز صاحب کے بہترین
مضامین دُنیا کے مضمون نگاروں کے بہترین مضامین کے مقابلہ میں پیش
کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں مضمون اور خیالات میں وہ زور ملے گا جو بیکن Bacon

کے مضامین میں بے اخلاق ہماہمی اور طنز و مزاح کا وہ رنگ ملے گا ۔ جو اڈیسن کے مضامین کی جان ہے ۔ اور انفرادیت کا وہ اثر ملے گا جو ولیم ہیزلٹ کے مضامین کو اعلیٰ مقام دیتا ہے ۔ مضمون کی صنف (جس کو اب کچھ لوگوں نے انشائیہ کے نام سے جاننا چاہا ہے) ہمارے یہاں مختصر افسانے میں اور تنقیدی مضمون میں غائب ہو گئی ۔ پھر مذہب اقتصادیات ۔ سیاسیات وغیرہ عام ادب سے خارج کر دیئے گئے اور ان کے الگ الگ دائرے بنا دیئے گئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختصر صنف جو انفرادی طور پر کسی مصنّف کی دلچسپ ذاتی رائے دینے کے لئے مخصوص تھی ۔ اور جو بقول "بیکن" تمام علوم کو اپنے دائرے میں لے لیتی تھی" توجہ کا مرکز نہ رہ گئی ۔ تنقیدی مضمون ہی کو مضمون کہا جانے لگا ۔ نیاز صاحب کے یہاں تنقیدی مضمون بھی ہیں مگر ان سے کہیں زیادہ تعداد زندگی کے مسائل پر مضامین کی ہے اور ان کی طرف توجہ کرنے سے ہمارے ادب میں مضمون نگاری کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی ۔

ان سب معاملات میں نیاز صاحب کو اہمیت دیتا ہوں ۔ مگر سب سے زیادہ میں انہیں زبان دان کی حیثیت سے اہم سمجھتا ہوں ۔ اس دَور میں ان سے بڑا زبان دان مجھے کوئی نہ ملا ۔ زبان دانی بڑی وسیع اصطلاح ہے اور اس کے ہر ہر پہلو سے میں نے نیاز صاحب کو دیکھا اور کامل پایا ۔ ہماری زبان عربی اور فارسی کی مرہونِ منت ہے اور ان دونوں زبانوں کا ان سے بڑا اُستاد مجھے کوئی نہ ملا ۔ آج کل ہم لوگ انگریزی زبان سے خیالات حاصل کرتے ہیں جو انگریزی الفاظ میں ہوتے ہیں ۔ ان الفاظ کے ترجمہ کے لئے عربی دانی ضروری ہے اور مجھے جب بھی کسی انگریزی لفظ کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی تو میں نیاز صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے جو لفظ مجھے بتایا وہی میرے دل کو سب سے زیادہ لگا ۔ سب میں پہلا لفظ جس کا انہوں نے میرے لئے ترجمہ کیا وہ انگریزی لفظ SENSUOUS مرثیہ نگاری

اور میرانیس کے سلسلے میں یہ لفظ میرے ذہن میں بار بار آیا۔ اس کے ترجمے موجود تھے مگر سب نامکمل معلوم ہوتے تھے، نیاز صاحب نے اس کا ترجمہ "امتساسی" اور میرے خیال میں اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں۔ اصطلاحیں بنانے کے سلسلے میں بھی میں ان کی مدد لیتا رہا۔ جب سے میں پاکستان آیا، ان کی اس مدد سے محروم ہو گیا تھا، مگر اب وہ بھی پاکستان آگئے اور میرے ہم محلہ ہیں؟ لہٰذا کل کا ہی ذکر ہے کہ میں ان کے پاس جدید نفسیاتی اشارتی۔ ناول کے لئے ایک اصطلاح قائم کرانے گیا۔ میں نے عرض کیا۔ کہ ناول کا لفظ عجیب عجیب چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر پست اور سنسنی خیز قصہ گوئی سے وابستہ ہو گیا۔ جدید معنی خیز فلسفی ناول نگاری کے لئے میں کوئی اور لفظ چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جدید ناول (SEYMBOLIC) ہوتی ہے اور (SYMBOL) کے لئے لفظ اشارہ استعمال ہوتا ہے اگر میں اسے اشاریہ کہوں تو کیسا رہے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ اشاریہ۔ INDEX کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ ٹھیک نہیں رہے گا اور کچھ غور کر کے کہا "آپ اسے رمزیہ کہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر لفظ نہیں ہو سکتا اور رمزیہ کے عنوان پر ایک مضمون لکھنے والا ہوں لسانیات دوسرے امور جیسے محاورے، قواعد، ترتیب الفاظ، تراکیب، ساکن اور متحرک حروف وغیرہ وغیرہ کے بابت بھی وہ میری بہترین رہنمائی کرتے رہے مگر زبان دانی کا سب سے اونچا درجہ طرز ادا ہے۔ اور اس میں مجھے اردو کا کوئی نثر نگاری ان سے آگے نہ دکھائی دیا۔ ان کے طرز میں ایک عجیب رنگینی کے ساتھ ایک عجیب شگفتگی اور عجیب رومانی ہے جو کسی نثر نگار کے یہاں نہیں ملتی۔ متعلق موضوعات کو ان کا قلم جس طرح دلچسپ بناتا ہے وہ سر سید تک کو نصیب نہ ہوا۔ اس وقت میں ان کی معجز بیانی کی تنقیدی تحلیل نہیں پیش کرنا چاہتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہماری نثر سر سید سے شروع ہو کر جس اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ سکتی تھی اس پر نیاز صاحب نے اسے پہنچایا ان کے یہاں ہمارے تمام نثار کی خوبیاں یک جا ہو گئی ہیں اور ان پر یہ مصرع پورا اترتا ہے۔ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔" ہم زندہ کاملین کو مرے ہوؤں پر ترجیح دینے سے ڈرتے ہیں اور جب میں نیاز صاحب کو اردو کا بہترین نثر نگار کہتا ہوں تو لوگ بھڑک جاتے ہیں مگر یہ میری اٹل رائے ویسی ہی اٹل ہے جیسی نیاز صاحب کی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

نیاز کا مذہب

مولانا نیاز فتح پوری کی گوناگوں شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں میں سے اُن کے مذہبی خیالات کو خصوصیت کے ساتھ موضوعِ بحث بنانے کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نیاز صاحب کے مذہبی نقطۂ نگاہ کا ان کی ادبی تنقید پر اور ان کے مذہب کا ان کے ادب و انشاء اور اسلوب پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس فرصت میں میں بحث کے اس پہلو کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ دوسری وجہ جس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ گمراہ کن پروپیگنڈا ہے جو ایک خاص طبقے کی طرف سے نیاز کے خلاف شدومد کے ساتھ اس وقت سے کیا جا رہا ہے جب سے "نگار" جاری ہوا یا جب سے میں نے "نگار" پڑھنا شروع کیا۔ میں اس سے بھی بے نیازانہ گزر جاتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ نیاز کے خلاف اس پروپیگنڈے نے نیاز کو ہمارے معاشرے کو یا خود مذہب اسلام اور اس کی اشاعت ہی کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ پاکستان میں اُردو زبان و ادب کو بھی اس سے بڑا دھکا لگا ہے۔ داستان تلخ ضرور ہے لیکن سُنانی ہی پڑے گی۔

مئی ۱۹۵۱ء میں نیاز صاحب میری کتاب "اُردو زبان کا ارتقاء" شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ سے میرٹھ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ان سے نیاز حاصل ہوا تو انہوں نے فرمایا: "میں ترکِ وطن کرنا چاہتا ہوں۔ ڈھاکہ میں قیام کروں گا۔ اور وہیں سے "نگار" نکالوں گا۔ "نگار" کے لئے ایک مکان کی ضرورت ہوگی۔ فضلی صاحب

سے (جو اس وقت مشرقی پاکستان میں معتمد تعلیمات تھے) کہیئے میں کچھ نہیں چاہتا۔ "نگار" کے لئے کوئی مکان یا بدرجۂ اقل مقام کا انتظام کر دیا جائے۔ جہاں بیٹھ کر میں اُردو زبان و ادب کی خدمت کر سکوں۔" نیازؔ صاحب کی یہ درخواست لے کر میں ڈھاکہ پہنچا تو ایک بزرگ سے جن کا میں احترام کرتا تھا اس کا ذکر آیا۔ میں نے کہا خوشی کی بات ہے۔ نیازؔ صاحب پاکستان آنا چاہتے ہیں اور انہوں نے غالباً اُردو کی خدمت کی غرض سے پاکستان کے اس حصّے کو منتخب کیا ہے۔ فضلیؔ صاحب کے نام میں ان کا پیغام لایا ہوں۔ نگار کے لئے کوئی مناسب مکان مل جائے۔ تو وہ ڈھاکہ چلے آئیں گے۔ یہ سُن کر وہ صاحب برہم ہوگئے اور کہنے لگے "نیازؔ صاحب کا یہاں آنا مناسب نہیں۔ ان کے مذہبی خیالات سے تم واقف ہی ہو۔ یہاں آ کر وہ بے دینی پھیلائیں گے۔" میں نے نیازؔ صاحب کی تائید میں کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔" تم ابھی مشرقی پاکستان کے حالات سے واقف نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ ہرگز اس امر کی اجازت نہ دوں گا کہ تم فضلیؔ صاحب سے اس کا ذکر کرو۔"

ہر چند میں ان بزرگ کی اس رائے سے متفق نہ تھا لیکن ان کا احترام مدِ نظر تھا۔ مجھے ان کی خاطر عزیز تھی۔ اس لئے ان کی اجازت کے بغیر فضلیؔ صاحب تک نیازؔ صاحب کا پیغام پہنچانے کی میں جسارت نہ کر سکا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نیازؔ صاحب کو پاکستان آنے کے لئے گیارہ سال انتظار کرنا پڑا اور مشرقی پاکستان جیسے نیازؔ جیسے اُردو نواز انشاء پرداز کی سخت ضرورت تھی۔ نیازؔ و نگارؔ کی ادبی و لسانی خدمات سے محروم رہ گیا۔ کیا اس سے اُردو کو نقصان نہیں پہنچا؟"

میں اپنے بزرگ سے نیازؔ صاحب کے مذہبی معتقدات کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس فرصت میں" نگار" کے ذہین قارئین کی خدمت میں پیش کر دوں تو شاید بے محل نہ ہو۔ نیازؔ صاحب اہلِ قلم بھی ہیں اور اہلِ علم بھی ان کے علم کی بناء "بصیرت" پر ہے جو متاعِ عزیز کی طرح آج کم یاب ہے۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں یہ کم یاب نہ تھی بلکہ ہر مسلمان کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے" علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی " میں (رسول کریم) اور میرا پیرو (مسلمان) ہم سب بصیرت کے مالک ہیں اور ہمارے مسلک کی بنیاد بصیرت ہے۔ بصیرت کا مقابل بصارت ہے۔ بصارت آنکھ کی روشنی یعنی بینائی یا مشاہدہ ہے جو معلومات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ بصیرت دل کی روشنی ہے جس سے حقیقت تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے ایک سے زیادہ مقامات پر سمع (سننے کی قوت) اور بصر (دیکھنے کی قوت) کے ساتھ قلب و فواد (دل) کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز آنکھ، کان اور دل کو ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے بازپرس کی جائے گی۔" دل " سے قرآن کی مراد وہ صنوبری شکل کا گوشت کا لوتھڑا نہیں جو ہر شخص کی بائیں پسلی کے نیچے لٹکا ہوا رات دن دھڑ دھڑ کرتا رہتا ہے بلکہ قرآن کی زبان میں سوچنے سمجھنے کی قوت کا نام دل ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بصیرت ہے۔ اس کا ثبوت ذیل کی آیت سے ملتا ہے:۔

لهم قلوب لا یفقهون بها	کفار کے دل ہیں جن سے وہ نہیں
ولهم اعین لا یبصرون بها	سمجھتے، آنکھیں ہیں جن سے نہیں دیکھتے،
ولهم اذن لا یسمعون بها۔	کان ہیں جن سے نہیں سنتے۔

جس طرح آنکھ کا کام دیکھنا اور کان کا کام سننا ہے۔ اسی طرح دل کا کام سوچنا سمجھنا ہے۔ مسلمانوں نے دل سے کام لیا۔ یعنی سوچ سمجھ کر اپنے لئے ایک راہ بنائی۔ کفار اپنے باپ، دادا کی تقلید میں قدیم رسم و راہ پر جمے رہے، اس لئے نبی کی زبانی، قرآن نے اعلان فرمایا کہ نبی اور اس کے ساتھی بصیرت والے ہیں۔

قرآن نے تین لفظ استعمال کئے ہیں جو عقیدے کے تین مدارج کو ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم مسلک پر محض اس لئے جمے رہنا کہ وہ باپ دادا کا مسلک ہے کفر ہے۔

انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا	ہمارے باپ دادا کا ایک مسلک تھا

علیٰ آثارھم لمھتدون۔ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

اکابرِ قوم اور رؤسا و شیوخ کی دیکھا دیکھی سمجھے بُوجھے بغیر کوئی راہ اختیار کرنا" اسلام" ہے۔

قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا بل قولوا اسلمنا۔ بدوی آپ سے آکر کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئے۔ آپ ان سے کہہ دیں تم تم ایمان نہیں لائے، اسلام لائے ہو۔

کیوں اس لئے کہ

لما یدخل الایمان فی قلوبکم ابھی ایمان تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔

اچھی طرح غور و فکر کرنے اور سوچنے سمجھنے کے بعد جب کوئی راہ اختیار کی جائے تو وہ ایمان ہے۔ ایمان اندھا نہیں علیٰ بصیرت ہوتا ہے۔ اور بصیرت تفکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ قرآن نے اہلِ بصیرت کی شان یہ بتائی ہے کہ:۔

یتفکرون فی خلق السمٰوات و الارض اُٹھتے بیٹھتے وہ زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرتے رہتے ہیں۔

بات میں سے بات پیدا ہوتی ہے۔ نیاز صاحب کے مذہبی نقطۂ نگاہ کو واضح کرنے کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ اسلام کی رُو سے فکر فی آیات اللہ ایک پکا اور سچے مومن بننے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری ذکر اللہ ہے۔

فکر فی آیات اللہ کے دو معنی ہیں۔ انفس و افاق یعنی حیات و کائنات کی پردہ کشائی اور ان کے گوناگوں اسرار و رموز اور حقائق و دقائق تک رسائی۔

سنریھم آیاتنا فی الافاق وفی انفسھم ہم اپنی آیات کائنات میں بھی انھیں دکھائیں گے اور حیات میں بھی۔

دوسرے قرآنی نصوص میں غور و فکر اور ان کے معانی و مطالب کی دریافت اوّل مطالعہ اعمال ہے۔ دوم مطالعہ اقوال اور شاید عام مطالعہ کرنے والوں کو اس کا احساس نہ ہو کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کی ستائش کی ہے جو اس کے

کلام یعنی قرآن کا آنکھ کھول کر مطالعہ کرتے اور اس کے مطالب و معانی کی دریافت کے لئے فکر و نظر سے کام لیتے ہیں۔

اذا ذکروا بآیات اللہ لم یخروا علیھا صما و عمیانا۔ (خدا کے نزدیک بندے وہ ہیں) کہ جب انہیں خدا کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے ہو کر ان پر ٹوٹ نہیں پڑتے۔

بہرے اور اندھے ہو کر خدا کی آیات پر ٹوٹ پڑنا اس کے سوا کیا ہے کہ عوام کالانعام کی طرح ان پر اعتقاد ہو۔ اور غور و فکر کو ان میں راہ نہ ہو۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نیاز صاحب کے مذہب اور ان کے عقائد کو قرآن کی تعلیم کی روشنی میں سمجھا جا سکے۔ نیاز کا نقطۂ نگاہ علم و ادب کے باب میں تنقیدی رہا ہے۔ ان کی ادبی تنقید تاثراتی ہے جس نے ان کی اعلیٰ انشاپردازی کی آغوش میں پرورش پائی اور ان کی علمی و دینی تنقید تفکراتی ہے۔ ایک عام مسلمان اور عالم دین دونوں سے ان کی راہ الگ ہے۔ عام مسلمان سے اس لئے کہ نیاز کے اسلام کی بنیاد فکر پر ہے۔ اور ایک عام مسلمان کے اسلام کی بنیاد جذبے پر۔ نیاز کا اسلام اپنا ہے جسے انہوں نے کائنات اور آیات کے گہرے مطالعہ کے بعد حاصل کیا۔ ایک عام مسلمان کو یہ نعمتِ عظمیٰ آباؤ اجداد سے ترکے میں ملی۔ عالمِ دین اور نیاز کے اسلام میں یہ فرق ہے کہ نیاز کے عقائد کے اجزاء و عناصر کا ایک بڑا حصہ اجتہادی ہے اور عالمِ دین کے مسلمات تمام تر تقلیدی ہیں۔ نیاز کے یہاں درایت کو روایت پر ترجیح ہے۔ اور ایک عام عالمِ دین کے نزدیک اس کے برعکس روایت درایت پر مرجح ہے۔ اور سطورِ بالا میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نیاز کا نقطۂ نگاہ قرآنی آیات و نصوص کے مطابق اور اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پر مبنی ہے۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو نیاز اور ان کے ہم خیال دوسرے اہلِ علم کو بے دین نہیں کہا جا سکتا۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ توضیح کی غرض سے صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

علمائے اسلام کا خیال کہ قرآن کے مطالب اور اس کے الفاظ و کلمات وحروف منزل من اللہ ہیں۔ نیازؔ کہتے ہیں مطالب خدا کی طرف سے ہیں۔ الفاظ و کلمات رسول کے ہیں۔ مطالب کو الفاظ کا جامہ رسول نے پہنایا۔ یہ بحث آج کی نہیں۔ اس کے پہلے بھی علمائے دین کے مابین اس پر ردو قدح ہوئی ہے۔ اور بعض فرقوں نے علماء کے شدید اختلاف کے باوجود اس مسلک کو صحیح بتایا ہے۔ جو نیازؔ کا ہے۔ اس وقت اس کی صحت یا عدم صحت زیر بحث نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نیازؔ اور ان کے اہم نوا غلطی پر ہوں اور صحیح وہی ہو جو اہل سنت کہتے ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نیازؔ کا یہ عقیدہ ان کے ذہن کی تخلیق نہیں قرآن کی آیات پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات پر بصراحت لکھا ہے کہ :-

نزل بہ الروح الامین علی قلبک — روح الامین نے قرآن کو آپ کے قلب (دل) پہ اُتارا۔

اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ قلب پر لکھی لکھائی کتاب نازل نہیں ہوتی۔ مضامین اور خیالات کا القا ہوا کرتا ہے۔ جیسا کہ غالبؔ نے لکھا ہے :-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

میں پھر عرض کروں گا کہ اس استدلال کی قوت اور صحت سے بحث نہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی آیات اور احادیث سے غور و فکر کے بعد اگر کوئی رائے قائم کی جائے جو علمائے اسلام کے مسلک کے خلاف ہو تو کیا رائے غلط ہوگی۔ اور رائے رکھنے والا بے دین سمجھا جائے گا۔ اور اس کی یہ روش کہ علمائے اسلام کی تقلید کرنے کی جگہ وہ براہِ راست قرآن اور اسلام کے مطالعے کے بعد ایک نتیجہ پر پہنچا ہے، بے دینی، الحاد، زندقہ اور گمراہی کہلائے گی۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کے معنی قرآن و حدیث پہ ایمان رکھنا اور سمجھ کر ایمان رکھنا نہیں، علمائے اسلام کی تقلید اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا اسلام ہے۔

نیاز علمار کی تقلید نہیں کرتے قرآن اور حدیث پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا اسلام خالص اسلام ہے۔ وہ نہ شیعی ہیں نہ سنّی، نہ مقلد ہیں نہ غیر مقلد نہ دیوبندی ہیں نہ بریلوی، نہ قرآنی ہیں نہ اہلِ حدیث۔ وہ محض مسلمان ہیں اور چونکہ ان میں سے کسی فرقے سے بھی ان کا تعلق نہیں اس لئے ہر فرقہ انہیں بے دین ٹھہراتا ہے۔ شیعہ سُنّی، سمجھتے ہیں۔ سنّی شیعہ تصور کرتے ہیں۔ مقلدوں کا خیال ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں۔ غیر مقلد، تقلید کا طعنہ دیتے ہیں۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

ان میں سے کسی فرقے نے بھی انھیں اپنے دامن میں پناہ نہ دی اور ان کے مسلک کی یہ خوبی ان کی سب سے بڑی خامی شمار ہوئی۔ یہ دور فرقہ بندی کا دور ہے۔ اس میں افراد ٹکڑیوں میں بٹ کر اور ٹولیاں بنا کر زندگی بسر کرتے اور کارزارِ حیات سر کرتے ہیں۔ حضورِ اکرم نے فرقہ بندی کو مسلمانوں کے لئے ناپسند کرنے کے باوجود یہ پیشین گوئی کی تھی کہ میری اُمّت میں بہتر فرقے ہوں گے۔ چنانچہ آج یہ فرقے موجود ہیں۔ اسلام کا نام ونشان نہیں۔ جس طرح پاکستان میں بنگالی بھی ہیں، پنجابی بھی ہیں، پشتون بھی ہیں، بلوچ بھی ہیں، سندھی بھی ہیں، مہاجر بھی ہیں، سبھی ہیں لیکن پاکستانی کہیں نظر نہیں آتا اور اگر نظر آیا ہے تو پریشان و پشیمان اقبال کا یہ شعر زبانِ حال سے پڑھتا ہوا کہ

درجہاں یارب ندیم من کجاست　　طورِ سینایم کلیم من کجاست

مذہب کی یہ روایت کہ سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن وسنّت سے بے واسطہ ہدایت حاصل کی جائے بڑی پرانی روایت ہے قرآن کا فرمان ہے :-

فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول　　اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو خدا (کی کتاب) اور رسول (کی سنت) کی طرف رجوع کرو۔

حضورِ اکرم ارشاد فرماتے ہیں "میں تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے انھیں جکڑ کر پکڑ لیا تو کبھی بے راہ نہ ہوگے۔ یہ دو چیزیں کیا ہیں۔؟ ایک اللہ کی کتاب (قرآن) دوسرے میری سنّت (حدیث صحیح) افسوس ہے اس روایت کا تسلسل تاریخ

نے برقرار نہیں رکھا۔ ہدایت کے اصلی سرچشمے نظر انداز ہو گئے۔ ان کی جگہ اشخاص و افراد نے لے لی۔ اسلامی تاریخ کا یہ ایک باب ہے میں اس کے ورق اُلٹنا نہیں چاہتا۔ البتہ یہ عرض کروں گا کہ برِصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب اور اس کے بعد سر سید احمد خاں نے اس مُردہ روایت کو زندگی بخشی اور علماء کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر آکر قرآن و حدیث کا بے واسطہ مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ میں سر سید احمد خاں سے شاید لغزشیں بھی ہوئی ہوں اس لئے کہ جو چلتا ہے وہ ٹھوکر بھی کھاتا ہے۔ لوگ ان کی لغزشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ انہوں نے ایک اچھی روایت کو جو مر چکی تھی زندہ کیا۔ اور سوچنے سمجھنے والوں کو ایک راستہ دکھایا۔ نیازؔ سرسید کے پیرو نہیں، لیکن راستہ دونوں کا ایک ہے۔ نیاز بھی اسی راہ کے رہبر ہیں۔ سرسید مُصلح قوم تھے۔ نیازؔ نقّاد ہیں۔ سرسید نے اصلاح کے خیال سے عام عقائد کے چشمے کو خس و خاشاک سے پاک کیا۔ نیازؔ نے اس پر ناقدانہ نظر کی اور آج کے اسلام کو قرآن و حدیث کے معیار پر پرکھا۔

پروفیسر آل احمد سرورؔ

نیازؔ کی یاد میں

" نگار" پاکستان کی تازہ ترین اشاعت سے حضرت نیاز فتح پوری کی خطرناک علالت کی خبر ملی تھی اور ان کی خیریت معلوم کرنے کا ارادہ تھا دوسرے دن ریڈیو پر اعلان ہوا کہ وہ چل بسے۔

نیازؔ کی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت، ایک اسلوب، ایک نسل، ایک رجحان، ایک وضع، ایک انداز کی موت ہے۔ علم وفضل، فکر و نظر، انفرادیت و بصیرت، ادب و انشا، عزم و استقلال کی کتنی ہی حکایتیں ان کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ رہے نام اللہ کا۔

آج میری عمر کے جتنے اشخاص ادب کے کوچے میں گامزن ہیں انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو نیازؔ کے چرچے سُنے۔ میں غازی پور میں آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا جب ششماہی امتحان میں درجے میں سب سے زیادہ نمبر لانے کے باوجود حساب میں فیل ہوگیا تو نارمل اسکول کے ایک اُستاد حساب پڑھانے کے لئے رکھے گئے۔ یہ حضرت "نگار" کے خریدار تھے اور نیازؔ کے عاشق۔ حساب سیکھنے کے دوران میں استاد کے شوق کا علم ہوا تو میں نے بھی ان سے مانگ کر "نگار" کے پرچے پڑھنے شروع کئے اور میں بھی "نگار" اور اس کے ایڈیٹر کا پرستار ہوگیا۔ حسنِ اتفاق سے نیازؔ کے ایک دوست عبدالرؤف غازی پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے میرے والد سے ملنے کبھی کبھار آتے تھے۔ ان سے اکثر نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کچھ دن بعد نیازؔ ان سے ملنے غازی پور آئے۔ وہیں میں نے انھیں پہلی دفعہ دیکھا

اور کچھ خاموش اور مغرور سے آدمی معلوم ہوئے، مگر ان کے اسلوب کا جادو چل چکا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ نیاز آٹھویں درجے کے ایک طالب علم کی طرف خاص طور سے توجہ کرتے۔ رؤف صاحب کا یہ جملہ آج تک یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز کے یہاں عورت اور شباب کے سوا کوئی دوسرا موضوع نہ تھا۔

یاد نہیں پڑتا کہ لکھنؤ کے قیام سے پہلے نیاز صاحب سے کب کھل کر باتیں ہوئیں۔ ہاں یہ یاد ہے کہ نیاز صاحب نے جب ۱۹۴۰ء کے خاص نمبر میں شعراء کا اپنا انتخاب شائع کیا تو اس کے بعد چند نقادوں کے ساتھ مجھ سے بھی درخواست کی کہ میں اس نمبر پر تبصرہ کروں یہ تبصرہ ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد نیاز صاحب کی فرمائش پر میں نے ریاض نمبر کے لئے مضمون لکھا۔ نیاز صاحب کے وہ خطوط جو "نگار" میں شائع ہوتے تھے، بڑے رنگین اور شوخ ہوتے تھے لیکن مضمون نگاروں کو وہ کاروباری خط لکھا کرتے تھے، فلاں نمبر نکل رہا ہے فلاں تاریخ تک مضمون لکھ سکیں تو عنایت ہوگی۔ اس کے بعد ایک خط یاد دہانی کا کہ وقت گزرا جا رہا ہے اور پرچے کی کتابت شروع ہونے والی ہے۔ اس کے بعد بھی میری طرف سے خاموشی ہوتی تو نیاز صاحب بھی سکوت اختیار کر لیتے۔ پرچہ وقت پر چھپ جاتا خواہ اس میں بیشتر مضمون نیاز کے ہی کیوں نہ ہوتے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان جب کبھی لکھنؤ جانا ہوا تو نیاز صاحب سے ملا بھی لیکن سرسری سی ملاقات رہی۔

۱۹۴۶ء میں لکھنؤ پہونچا تو کام شروع کرنے کے فوراً بعد نیاز صاحب کے یہاں حاضری دی۔ اب کے دیر تک اور کھل کر باتیں ہوئیں۔ نیاز صاحب نے جس طرح میرے یونی ورسٹی میں آنے پر مسرت کا اظہار کیا اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ یونی ورسٹی کے اور لکھنؤ کے ادیبوں کے قصے سناتے تھے۔ وہ لکھنؤ والوں سے خوش نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ادب میں نئے خیالات کی قدر کرتے تھے مگر نئے لکھنے والوں کی فن سے بے پروائی پر سخت برہم تھے ترقی پسند

ادب کو وہ ترقی پسند زیادہ اور ادب کم سمجھتے تھے۔ مذہب میں عقلیت کو رہبر مانتے تھے مگر اسلام کی عظمت کے قائل تھے۔ ان سے باتیں کر کے حیرت ہوئی کہ لوگوں نے ان پر الحاد کا الزام کیسے لگایا۔ جوش و جگر دونوں کے قائل نہ تھے۔ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ مگر انھیں معاوضہ دینے کی ضرورت کم ہی سمجھتے تھے۔ چونکہ نگار میں کسی کی تخلیق کا چھپ جانا ہی ادبی شہرت کا باعث ہوتا تھا اس لئے انھیں مضمون مل ہی جاتے تھے۔ گو وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ علمی مضمون، ادبی تنقید، افسانہ انشائیہ، تبصرہ، ترجمہ کسی میں بند نہ تھے۔ جتنے عرصہ تک جیسی پابندی سے اور جس معیار کے ساتھ انھوں نے رسالہ "نگار" نکالا اس کی مثال ہماری ادبی دنیا میں کم ہی ملے گی۔ وہ "نگار" کے ایڈیٹر ہی نہیں منیجر بھی تھے اور طابع و ناشر بھی۔ اور اس کے کلرک بھی۔ اپنی بیشتر کتابیں انھوں نے اپنے پریس میں چھاپیں اور اپنی بک ڈپو سے فروخت کیں لکھنؤ کے دس سالہ قیام میں نیاز صاحب سے خاص قربت رہی۔ ان کے ساتھ کئی انگریزی فلم دیکھے۔ ادبی جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ وہ اکثر گھر پر تشریف لاتے تھے۔ ہوش بلگرامی مرحوم سے ملاقات انھیں کی وساطت سے ہوئی۔ انھوں نے اصرار کر کے "تنقیدی اشارے" کا ایک ایڈیشن نگار بک ڈپو کی طرف سے شائع کیا۔ ان کی فرمائش پر میں نے نگار میں "لکھنؤ اور اردو ادب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کو انھوں نے بہت پسند کیا۔ ان سے ہندوستان، پاکستان، روس، امریکہ، گاندھی، ابوالکلام آزاد، یگانہ، اثر لکھنوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، جوش جگر، نئی شاعری، غالب، اقبال غرض دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ ریڈیو کے لئے ساتھ بیٹھ کر مباحثے لکھے۔ ان کے ساتھ چہل قدمی کو گیا۔ مگر نیاز صاحب سے بے تکلفی نہیں ہو سکی، مجھے محسوس ہوا کہ نیاز صاحب لئے دیئے رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک خاص مزاج ہے۔ پسند اور ناپسند کے واضح معیار ہیں — افکار کے سلسلے میں بھی اور اشخاص کے سلسلے میں بھی، ان کا ذہن آگے دیکھنے کا عادی تھا۔

دلِ لکھنؤ کی اس فضا سے بسا ہوا تھا جب در و دیوار سے عبیر و گلال برستا تھا اور فضا میں رامش و رنگ کی بارش تھی ۔ ان کے کوبڑ دو تھے ۔ مولوی اور عورت ۔ مولوی سے انھیں نفرت تھی ۔ عورت کے وہ آخر عمر تک پرستار رہے ۔

نیازؔ صاحب مل کر کام نہیں کر سکتے تھے ۔ وہ تنہا چلنے کے عادی تھے ۔ وہ واقعی قاموسی علم رکھتے تھے ۔ عربی فارسی ادب پر تو انھیں گہرا عبور تھا ہی ، کلاسیکل اردو شاعری کے ہر رمز و ایما سے آشنا تھے ۔ عروض کے ماہر تھے ۔ زبان و بیان کے ایسے نباض تھے کہ نباض
ذرا سی لغزش بھی فوراً محسوس کر لیتے تھے ۔ مغربی ادب میں جدید میلانات سے زیادہ واقف نہ تھے لیکن مغربی ادب خصوصاً انگریزی ادب کے مشاہیر کے متعلق خاصا علم رکھتے تھے بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے ۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا ۔ ادب کی آمدنی پر ہی ان کا دار و مدار تھا ۔ انھوں نے اپنے رسالے اور کتابوں کی آمدنی پر خاصی صاف ستھری زندگی بسر کی مگر آن بان ہر حال میں قائم رکھی ۔ ان کے یہاں بڑی وضعداری تھی ، دوستی اور تعلقات کو ساری عمر نباہتے رہے ۔ ایک زمانے میں فلم کا کاروبار بھی کیا ۔ حضرت گنج میں کچھ کمرے کرائے پر لئے ۔ ٹھاٹ کا دفتر قائم کیا ۔ خود ایک کہانی لکھ رہے تھے ۔ ذوقی صاحب ان کے مددگار تھے ۔ یہ سلسلہ چند مہینے چل کر ختم ہو گیا ۔ نیازؔ صاحب اس کوچے کے اسرار و رموز سے واقف نہ تھے ۔

نیازؔ صاحب کے پاکستان جانے کا مجھے بڑا رنج ہوا ۔ نیاز صاحب سے یہ امید نہ تھی ۔ میرا خیال تھا کہ نیازؔ کبھی کبھار عزیزوں اور احباب سے ملنے پاکستان کا پھیرا کرتے رہیں گے لیکن ان کا قیام ہندوستان ہی میں رہے گا ۔ حکومت ہند نے ان کی ادبی عظمت کے اعتراف میں انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا ۔ چند ماہ بعد وہ چلے گئے ۔
مومن کے عاشق کو مومن کا یہ شعر شاید یاد نہ آیا ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پاکستان جاتے ہی نیازؔ نے پہلا کام یہ کیا کہ ، نگار پھر جاری کیا ، "نگارِ پاکستان" کے نام سے یہ پرچہ بھی نگار کی طرح باقاعدہ نکلتا رہا ۔ اسی کے نیاز نمبر میں ان کے متعلق

بہت سے اچھے مضامین شائع ہوئے بالآخر کینسر کے موذی مرض نے انھیں دبا لیا۔ اور آخر اسی مرض میں انتقال ہوا۔ نیازؔ کے ساتھ اس دور کی سب سے جامع، سب سے ہمہ گیر ادبی شخصیت ہم سے رخصت ہوگئی۔

نیازؔ کے کارناموں کو سمجھنے کے لئے سرسیّد کی تحریک کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ سرسیّد نے مولوی شبلی کو علامہ شبلی بنایا ہو یا نہ بنایا ہو۔ نیاز محمّد خاں کو علاّمہ نیاز فتح پوری بنادیا۔ سرسیّد کے اثر سے عقلیت، حقیقت پسندی، نئی مشرقیت اور علم و ادب سے ایک نیا شغف عام ہوا۔ عبدالقادر کے "مخزن" میں نئی نسل کے فکر و نظر کے سارے نقوش مل جاتے ہیں۔ اس نے اقبال کو سوزِ یقیں دیا۔ یلدرمؔ اور نیازؔ کو زبان دی محمد الدین احمد کو ابوالکلام آزاد بنایا، عبدالقادر کو مضمون نگاری سکھا دی۔ نیازؔ کی تعلیم پرانے نہج پر ہوئی تھی۔ مگر ان میں ایک باغیانہ روح تھی۔ باپ کے اثر سے وہ قدیم طرزِ فکر سے بیزار تھے۔ شباب انھیں عورت کی طرف کھینچتا تھا۔ چنانچہ ادب کی دنیا میں جو تجربے ہو رہے تھے وہ ان کے لئے باعثِ کشش بن گئے۔ ٹیگور کی گیتا نجلی کی خنک موج نے ان کی لگی اور بھڑکا دی۔ اور وہ ادبِ لطیف اور انشائے لطیف کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے پہلے نقاد کے صفحات پر گل کاریاں کیں اور پھر "نگار" نکالا کوئی اور ہوتا تو دو چار سال کے تلخ تجربوں کے بعد ہمت ہار بیٹھتا۔ مگر نیاز بڑے مضبوط ارادے کے آدمی تھے اور حالات سے ہار ماننا جانتے ہی نہیں تھے۔ کیوپڈ اور سائیکی۔ کہکشاں کا ایک سانحہ، ایک شاعر کا انجام، آج ہمیں زیادہ متاثر نہیں کرتے مگر اُس زمانے میں یہ بڑے ہیجان انگیز ثابت ہوئے تھے۔ ان میں الفاظ سے ایک نیا عشق تھا اور الفاظ کا ایک نیا نشہ تھا۔ ادب کی ایک نئی پرستش تھی اور حسن کاری کی ایک نئی راہ۔ اس لئے نیازؔ کے افسانے، افسانے کم ہوتے تھے ادب اور انشا کا چمن زیادہ ان میں اردو خاصی اردوئے معلیٰ ہوتی تھی۔ مگر بہر حال نئے خیالات و جذبات کے لئے نئی زبان استعمال کرنے کی کوشش تو قابلِ قدر کہی جا سکتی ہے، یہ اچھی نثر نہ تھی مگر اس نے اچھی نثر کے لئے راستہ ضرور صاف کیا۔ ترجمے پر نیازؔ کو شروع سے قدرت تھی

اصطلاحوں کے ترجمے میں بھی عربیت کے باوجود ایک حسن تھا جینیس کے لئے نابغہ اور ماسٹرپیس کے لئے اختراع فائقہ عام فہم نہ سہی اصل مفہوم کو تو اسیر کر لیتے ہیں۔

نیاز کا علم قاموسی تھا اور انھیں مذہبی معاملات میں عام خیالات سے ہٹ کر چلنا پسند تھا اسی لئے باب الاستفسار کے ذریعے سے انھوں نے عام عقائد اور نظریات پر ضرب لگانی شروع کی جس کی قدامت پسند طبقے سے خاصی مخالفت ہوئی نیاز نے اپنے دور میں دین اور شریعت میں فرق کیا تھا۔ آج یہ فرق خاصا واضح ہو گیا ہے مگر جس زمانے میں انھوں نے ان خیالات کا اظہار کیا اس زمانے میں اتنا واضح نہ تھا اسی لئے ان کی زندگی کا خاصا حصّہ مولویوں سے معرکہ آرائی میں گذرا۔ من ویزداں میں نیاز نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں خاصی روشن خیالی ہے۔ مگر مذہب کی روح اور انسانیت پر ایک ایمان بھی ملتا ہے۔ اس کا اسلوب نگارستان اور جمالستان یا مکاتیب نیاز کا سا نہیں۔ اچھی اور علمی نثر کا کامیاب اسلوب ہے۔ میرے نزدیک نیاز کی انشائے لطیف کی اہمیت تاریخی ہے۔ مگر من ویزداں ایک مستقل قدر و قیمت رکھتی ہے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ من ویزداں کے تمام خیالات سے اتفاق کیا جائے۔

نیاز نے باب الاستفسار کے ذریعے سے اردو دنیا کو عالمی علوم اور افکار سے آشنا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں ان کا دار و مدار بہت کچھ انسائیکلو پیڈیا اور دوسرے حوالوں کی کتابوں پر ہوتا تھا۔ مگر وہ ان معلومات سلیقے سے اپنا لیتے تھے۔ بہرحال ان کے ذریعہ سے اردو داں طبقے کا افق ذہنی ضرور وسیع ہوا ان کے مکاتیب دراصل مکاتیب کم ہیں، انشائیہ زیادہ۔ ان میں بڑی خوبصورت زبان ہے۔ فارسی اور اردو کے اشعار کا بڑا برمحل استعمال ہے اور موضوعات بڑے رنگین اور شوخ ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ یہ خط لکھے گئے بھیجے نہیں گئے اور جو خط بھیجنے کے لئے نہیں لکھا جاتا وہ خط نہیں انشائیہ ہوتا ہے۔

"نگار" نے اردو ادب کو جو کچھ دیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں ہے اس کے

ذریعے بہت سے نئے لکھنے والے ابھرے۔ بہت سے ادبی مسائل پر کھل بحث ہوئی بہت سے علمی پہلو سامنے آئے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ شروع سے آخر تک یہ ایک علمی و ادبی رسالہ رہا۔ اس کے خاص نمبروں کے ذریعے ہمارے مشاہیر کی دوبارہ پرکھ ہوئی۔ اس میں انتہا پسندی بھی ہوئی مگر مجموعی طور پر ادب کو اس سے فائدہ پہونچا۔ مثلاً مومن کی عظمت کو نمایاں کرنے میں حسرت کے بعد نیاز کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ نیاز کی طرح کوئی تمام شعراء کے دیوانوں میں سے مومن کا انتخاب نہ کرے گا۔ مگر نیاز کی وجہ سے بھی مومن پر پہلے سے زیادہ توجہ ضرور کرے گا نیاز نے عملی تنقید کے بھی بڑے اچھے نمونے پیش کئے۔ گو انھوں نے جوش و جگر کے ساتھ انصاف نہیں کیا مگر جوش و جگر کی خامیوں پر جس طرح نظر ڈالی اس کی وجہ سے ان کی بے جا مداحی کم ضرور ہو گئی۔ تنقید کے اصولوں کی وضاحت کرکے بھی انھوں نے فکر کے لئے نئی راہیں نکالیں۔

ایک نقاد کی حیثیت سے نیاز کا کیا درجہ ہے؟ ان کی تنقید میں ایک دورنگی ہے۔ ایک طرف وہ نئے تنقیدی افکار سے متاثر ہیں اور دوسری طرف فن کے معاملے میں بہت کٹر ہیں۔ وہ تنقید کے اچھے خاصے معلم ہیں مگر ان کی عملی تنقید ذرا محدود قسم کی ہے اس میں بت شکنی کا جذبہ ضرورت سے زیادہ ہے اچھا نقاد نہ بت گر ہوتا ہے نہ بت شکن۔ وہ ادب کی روح کا نباض ہوتا ہے۔ جب وہ جمود یا تقلید دیکھتا ہے تو تجربے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب ادب کی دنیا میں مزاج کا نظارہ کرتا ہے تو ایک تنظیم اور ترتیب پر زور دیتا ہے وہ روایات کی قدر کرتا ہے مگر روایت پرست نہیں ہو سکتا۔ وہ تجربے سے ہمدردی رکھتا ہے مگر تجربے کی خاطر فن کا خون گوارا نہیں کر سکتا۔ نیاز کی فکر میں وسعت تھی۔ مگر ان کا فن کا تصور مانوس حسن تھا۔ وہ عقلیت پرست تھے مگر جذباتیت سے بلند نہیں ہو سکے اس لئے تنقید میں تاثراتی لے ان سے چھوٹ نہیں سکی۔ کلاسیکی ادب کے سلسلہ میں نیاز کی رائے کی بڑی اہمیت ہے۔ ادب کے سلسلہ میں وہ

زیادہ سے زیادہ ایک اچھے نقیب کہے جا سکتے ہیں۔ بعض باتوں میں وہ سیموئیل جانسن کی طرح ہیں۔

نیاز ان ادیبوں میں سے نہ تھے جن کی دل چسپی صرف علم و ادب تک ہو حالات حاضرہ پر بھی وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ ان سے آج کے ادیب بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ادب سے عشق، ادب کی خاطر ریاض۔ ادب کا ایک خاصا جامع تصوّر، فن کا احترام مگر تجربوں سے ہمدردی، گرد و پیش کے مسائل سے آگہی، آئے دن کے انقلابات میں زندگی اور انسانیت کے بنیادی حقائق پر اصرار ایک شوخی اور زندہ دلی جسے حوادث بھی ختم نہ کر سکے۔ قاموسی علم اور ایک چلبلا قلم۔

اردو ادب کو نیاز نے اتنا کچھ دیا ہے کہ انھیں بھلایا نہ جا سکے گا۔ وہ ہمارے ادب کے محسنوں اور معماروں میں سے ہیں بلکہ ہم انھیں معمارِ اعظم کہہ سکتے ہیں۔

نیاز فتحپوری

والد مرحوم میں اور نگار[1]

جب نیاز نمبر کی ترتیب کے سلسلہ میں فرمان صاحب نے مجھے بھی دعوتِ شرکت دی تو یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی، کیونکہ نگار کی یہ خصوصی اشاعت میری ہی ذات سے متعلق ہے اور اس میں میرا حصہ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اوّل تو میں اپنے اندر کوئی قابلِ ذکر بات پاتا ہی نہیں اور اگر دوسروں کی نگاہ میں ہو بھی تو اس کے اظہار کا حق اُنہیں کو پہنچتا ہے، مجھے نہیں ۔شکر ہے۔ یہ بات فرمان صاحب کی سمجھ میں آگئی، انہوں نے اپنے اصرار کا رُخ بدل دیا اور اس خیال کے پیشِ نظر کہ ایسی تمام خصوصی اشاعتوں کا ایک پہلو تاریخی بھی ہوا کرتا ہے انہوں نے اپنی فرمائش کو میرے سوانح اور خاندانی حالات قلمبند کرنے کی حد تک مختصر کر دیا۔ گو مجھے اس کی تعمیل میں بھی پس و پیش تھا، کیونکہ جس حد تک میری داستانِ حیات کا تعلق ہے وہ اتنی طویل اور پیچ در پیچ ہے کہ

سر ایں رشتہ ندانم زکجا بکشایم

اور اتنی ہی تکلیف دہ بھی کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر "یادِ رفتگاں" سے ہے اور یہ بڑی دکھ پہونچانے والی بات ہے۔ علی الخصوص اس شخص کے لئے جو "طویل العمری" کے خراج میں سیکڑوں اعزہ احباب کو اپنے ہاتھ سے سپردِ خاک کر چکا ہو!

تاہم قطعی انکار بھی ممکن نہ تھا، کیونکہ سوال "آزردگیِ دلِ دوستاں" کا تھا

---

[1] مطبوعہ نگار پاکستان نیاز نمبر ۱۹۶۳ء

اور میری فردِ عمل میں یہی ایک وہ معصیت ہے جو شاید سب سے کم نظر آئے گی۔ بہر حال طوعاً نہیں کرہاً مجھے کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے خواہ وہ کتنا ہی لایعنی کیوں نہ ہو۔

خاندانی حالات کے سلسلہ میں عموماً و رسماً تین باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:۔ علوئے نسبت، جاہت و ثروت اور علم و فضل، سو بد قسمتی سے میں اور میرا تمام خاندان ان میں سے کسی بات پر فخر نہیں کر سکتا۔ نہ بہ لحاظِ نسب میں اپنے آپ کو فاروقی، صدیقی، یا تیموری و چنگیزی کہہ سکتا ہوں، نہ دولت و امارت کے لحاظ سے اپنے خاندان کے کسی فرد کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔ رہا علم و فضل سو اس کا ذکر ہی فضول ہے کیونکہ میرے آبا و اجداد سب معمولی پڑھے لکھے تھے اور سب سے پہلے جس کی ذات سے صحیح معنی میں علم کی روشنی میرے گھر میں پہنچی وہ میرے والدِ محترم تھے۔ اس لئے میں اس داستان کا آغاز انہیں کے نام سے کرتا ہوں، خواہ وہ کتنی ہی غیر مربوط و غیر مسلسل کیوں نہ ہو۔

والد مرحوم میرے والد محمد امیر خاں (جنہیں امیر محمد خاں بھی کہتے تھے) کا آبائی وطن فتح پور تھا (جو کانپور اور الہ آباد کے تقریباً وسط میں واقع ہے) یہ قدیم شہر ہے جو کسی وقت قنوج کی حکومت سے وابستہ تھا یہاں کے ہندو فرمانروا جو راجگان اجگل کہلاتے تھے۔ قنوج کے باجگذار تھے۔ جب ۱۱۹۳ء میں معز الدین بن سام غوری نے اس حکومت کو ختم کیا تو اس کے آخری فرمانروا جے چند نے اپنا خزانہ یہیں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے عہد میں یہ حکومت جونپور اور صوبہ کوڑا سے متعلق ہو گئی (پندرہویں صدی عیسوی) لیکن راجگان راگل کا وجود پھر بھی باقی رہا۔ اس کے بعد عہدِ مغلیہ میں جب ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سلسلۂ جنگ شروع ہوا تو راجہ اجگل نے شیر شاہ کا ساتھ دیا اور آخر کار مغل حکومت نے اسے ختم کر دیا۔

اکبر کے زمانہ میں ضلع فتح پور کا نصف مغربی حصّہ سرکار کوڑا سے متعلق تھا اور نصف مشرقی حصّہ سرکار کڑا سے ۔ عہدِ مغلیہ میں یہاں بہ مقام کھجوا دوبارہ جنگ ہوئی ۔ پہلے اورنگ زیب اور شاہ شجاع کے درمیان (۱۶۵۹ء) میں پھر فرخ سیر اور عز الدین جہاندار کے بیٹے کے درمیان اورنگ زیب کے زمانہ میں نواب عبدالصمد خاں یہاں کے حاکم تھے ۔ جن کا مقبرہ اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے ۔ زوالِ عہدِ مغلیہ میں صوبہ دار اودھ کا تسلط یہاں قائم ہوگیا ۔ ۱۷۳۶ء میں جاگیر دار کوڑا کے اشارہ سے مرہٹوں نے تاخت کی اور یہ ۱۷۵۰ء تک یہاں قابض رہے ۔ اس کے بعد یہ علاقہ خوانین فتح گڈھ کے قبضہ میں آگیا لیکن تین سال کے بعد نواب صفدر جنگ متصرف ہوگیا ۔ اس کے بعد ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کو مل گیا ۔ لیکن جب وہ مرہٹوں کا دستِ نگر ہوگیا تو انگریزوں نے اسے ۵۰ لاکھ میں نواب وزیر اودھ کے ہاتھ فروخت کر دیا لیکن چونکہ نواب وزیر رقم خراج ادا نہ کر سکا تھا اس لئے ۱۸۰۱ء میں سرکار کوڑا اور سرکار الٰہ آباد پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ۔

جب ۱۷ر جون ۱۸۵۷ء کو کانپور میں ہنگامہ شروع ہوا اور ۸ ر کو الٰہ آباد کے خزانہ کا گارد فتح پور سے گزرا تو اسے لوٹ لیا گیا اور یہاں بھی لوٹ مار شروع ہوگئی ۔ انگریز حکام یہاں سے بھاگ کر باندہ چلے گئے اور پورے ایک مہینہ تک پورا ضلع انقلاب پسندوں کے قبضہ میں رہا ۔

۱۱ر جولائی کو جنرل ہیولاک نے انہیں بمقام بلندہ شکست دے کر پھر اپنا تسلط قایم کر لیا ۔ اور لکھنؤ کی حکومت ختم ہونے کے بعد اس طرف کے سارے علاقہ پر انگریزوں کی مستقل حکومت قایم ہوگئی ۔

یہ ہے فتح پور کی تاریخی حیثیت ۔ اب رہا یہ سوال کہ میرے آباؤ اجداد کون تھے ، کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ فتح پور کی سکونت انہوں نے کب اور کیوں اختیار کی ۔ اس کا حال مجھے نہیں معلوم ۔ والد کو یہ کہتے ہوئے البتہ بارہا

سُنا کہ قانون بستم کے زمانہ میں (معلوم نہیں یہ قانون کس عہد میں رائج تھا) اوّل اوّل ان کے نانا، یہاں کوتوال تھے اور باوجود اس کے کہ ان کا مشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھا، بڑی مطمئن زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے اکثر اعزہ و اقربا، جاہل قسم کے پٹھان تھے اور ایک گڑھی سی بنا کر اس میں رہا کرتے تھے۔ (جس کی یادگار اب صرف وہ ٹوٹا پھوٹا مکان رہ گیا ہے۔ جسے میں اپنا گھر کہتا ہوں) ان کا پیشہ صرف سپہ گری تھا، اور تلوار ہی ان کا ذریعۂ معاش۔ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب نواب عبدالصمد خاں یہاں کے حاکم تھے اور ان کی فوج زیادہ تر پٹھان سپاہیوں پر مشتمل تھی جن کی اولاد نے فتح پور اور قرب وجوار کے قصبات میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

میرے خاندان میں سب سے پہلے جس نے تعلیم حاصل کی وہ میرے والد تھے۔ یہ داستان بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ جس زمانہ میں میرے والد پیدا ہوئے، خاندان میں کوئی ذمہ دار مرد باقی نہ رہا تھا اور اگر تھا بھی تو علم سے ناآشنا تھا۔ میرے دادا البتہ زندہ تھے لیکن چند دن بعد وہ بھی نہ رہے، بزرگوں میں تنہا میری دادی رہ گئی تھیں اور باوجود اس کے کہ وہ خود بھی ان پڑھ تھیں۔ معلوم نہیں کیوں میرے والد کی تعلیم کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا اور وہ بھی اس شدّت کے ساتھ کہ انھوں نے اپنا زیور اور گھر کا تمام اثاثہ بیچ بیچ کر اس ارادہ کو پورا کیا۔ میں نے اپنی دادی کو دیکھا ہے، بڑی گوری چٹّی پٹھانی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ رُوئی کے گالے سے انہیں بنایا گیا ہے۔ بھولی اس قدر تھیں کہ روپیہ کے پیسے (انگریزی یا مدّد شاہی) اور پیسوں کی کوڑیاں (جن کا میرے لڑکپن میں کافی رواج تھا) صحیح نہ گن سکتی تھیں۔ لیکن میرے والد کی تعلیم کے بارے میں انہوں نے بڑے ہوش و گوش سے کام لیا۔

میرے والد فتح پور ہی میں پیدا ہوئے، لیکن کس سنہ میں، یقین کے ساتھ نہیں

کہہ سکتا ۔ تاہم چونکہ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب میں (جیسا کہ انہوں نے بارہا ظاہر کیا) جوان بھی تھے اور برسرِ کار بھی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ولادت ۱۸۳۵ء میں یا اس سے ایک دو سال پہلے ہوئی ہوگی ۔

مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی تعلیم کی ابتدا کیوں کر ہوئی، لیکن اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ انہوں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم فتح پور ہی کے کسی صاحب سے حاصل کی جو محلۂ ابونگر میں رہتے تھے اور اچھے فارسی داں سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ والد مرحوم کو اس زبان سے فطری مناسبت تھی اس لئے انہوں نے اسے بڑے شوق سے حاصل کیا اور اس کے بعد اونچی تعلیم کے لئے میری دادی نے انہیں لکھنؤ بھیج دیا اور پھر دلّی ۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ انہوں نے لکھنؤ اور دلّی میں کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ لیکن ایک بار برسبیل تذکرہ انہوں نے دلّی جاکر مولانا صہبائی سے استفادہ کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اس وقت ایران کا کوئی شاہزادہ "اعجاز خسروی" پڑھنے دلّی آیا ہوا تھا ۔ (کیونکہ اس کتاب کا درس دینے والا ایران میں کوئی نہ تھا۔) اور وہ میرے والد کا ہم سبق تھا ۔

میرے والد فارسی کے بڑے اچھے انشا پرداز تھے اور وطن میں اس لحاظ سے انہیں خاص شہرت حاصل تھی ۔ فارسی نظم و نثر پر بڑی ماہرانہ قدرت رکھتے تھے ایران کے تمام کلاسکل شعراء کا انہوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور فردوسی، خاقانی انوری، نظامی، سعدی، عرفی، نظیری، جامی، حافظ، غالب، بیدل وغیرہ کے ہزاروں اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ نثر میں وہ ظہوری کو زیادہ پسند کرتے تھے، شاید اس لئے کہ فطرتاً وہ خود بھی بہت مشکل پسند واقع ہوئے تھے ۔ ہندوستان کے مثنوی نگاروں میں غنیمت ان کو بہت پسند تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مثنوی "حسن و عشق" کا درس شروع ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ "غنیمت بڑا گرم نویس ملّا تھا"

ان کا تخلص امیر تھا اور خطوط میں ہمیشہ اپنے آپ کو "فقیر امیر" لکھتے تھے غزل

کی طرف انہوں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ ان کا فن صرف "قصیدہ نگاری" تھا اور وہ بھی محض نعت و منقبت کی حد تک۔ انہوں نے کسی امیر یا رئیس کی مدح میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ لیکن رسول اللہ اور خلفائے اربعہ کی شان میں متعدد قصائد کہے اور متعدد نظمیں نعتیہ غزلوں کی لکھیں۔ وہ مذہباً حنفی تھے، لیکن آلِ فاطمہ سے انہیں بہت بڑا شغف تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہفت بند کاشی کے جواب میں بھی کئی ترجیع بند لکھے۔ رباعی کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی لیکن قطعات بہ کثرت لکھے۔ قصیدہ گو شعراء میں وہ عرفی کے بڑے مداح تھے اور اکثر قصائد اسی کی زمینوں میں لکھے۔ چنانچہ عرفی کے مشہور قصیدہ

جہاں بگردم و دردا بہیچ شہر و دیار
نہ یافتم کہ فروشند بخت در بازار

کی زمین میں جو قصیدہ انہوں نے تصنیف کیا تھا، اس کا مطلع مجھے اب تک یاد ہے

بہ تیر نالہ بہ بندم اگر پر و سوفار
خرد بہ گوشۂ قوس آسمان ناوکبار

وہ بڑے اچھے خطاط بھی تھے اور انہوں نے اپنا تمام فارسی کلام جو سیکڑوں صفحات پر مشتمل تھا مع اس کی شرح کے (کیونکہ بغیر شرح کے ان کا کلام سمجھنا مشکل تھا) خود اپنے قلم سے لکھا تھا جو افسوس ہے کہ ضائع ہو گیا۔ پنشن لینے کے بعد ان کا مشغلہ صرف شعر و سخن تھا یا مذہب و تاریخ کا مطالعہ۔ میں نے کبھی ان کو بے کار بیٹھے نہیں دیکھا وہ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو لکھنے بیٹھ جاتے۔ اور جب لکھتے لکھتے ہاتھ جواب دے دیتا تو پھر مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی تھا اور جو کچھ انہوں نے پڑھا وہ سب مستحضر تھا۔ اساتذۂ فارسی کا کلام ان کو اتنا یاد تھا کہ محاورات فارسی کی سند میں وہ بے تکلف کلام اساتذہ پیش کر دیا کرتے تھے۔ ان کا مذہبی و تاریخی مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اچھے اچھے علماء کی صحبت میں بھی وہ سب پر

چھا جاتے تھے۔ وہ مقرر بھی اتنے ہی اچھے تھے جتنے اچھے انشاپرداز اور چونکہ فطرتاً مزاح پسند بھی تھے اس لئے ان کی گفتگو بھی بڑی دلچسپ ہوتی تھی اور محفل ان کی گرویدہ ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے فارسی داں احباب کو ہمیشہ فارسی ہی میں خط لکھتے۔ مولانا محمد علی بہاری بانی ندوۃ العلماء سے ان کے دوستانہ مراسم بہت گہرے تھے اور ان سے بھی خط و کتابت ہمیشہ فارسی میں ہوتی تھی۔ جس کی نقل رکھنا میرے ہی سپرد تھا۔

اُردو شاعری سے انہیں بہت کم لگاؤ تھا۔ امیر مینائی کے وہ بے شک معترف تھے۔ لیکن شاید اس لئے کہ وہ ان کے دوست تھے اور ذی علم انسان بھی۔ داغ کو وہ جاہل سمجھتے تھے اس لئے کہ اس کا کلام انہوں نے کبھی پڑھا ہی نہیں۔ ایک بار میں "گلزارِ داغ" کی ورق گردانی کر رہا تھا" پوچھا کیا ہے۔ میں نے عرض کیا "گلزارِ داغ" بولے "داغ بھی کوئی شاعر تھا؟" میں نے کہا میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں" فرمایا "کچھ سناؤ"۔ اس وقت اس کی نظم "شہر آشوب" میرے سامنے تھی میں نے وہی پڑھنا شروع کی اور دو بند پڑھ کر خاموش ہو گیا۔ فرمایا "پوری نظم پڑھو"۔ اور جب میں اُسے ختم کر چکا تو بولے کہ "حرام زادہ اچھا کہتا تھا" میں ان کا یہ فقرہ سُن کر خوشی سے اُچھل پڑا کیونکہ اس سے بہتر داد داغ کو شاید ہی کبھی ملی ہو۔ میر کے بھی بعض اشعار میں نے گاہ گاہ ان کی زبان سے سُنے۔ ایک دن میں نے ان کو میر کا یہ شعر گنگناتے ہوئے سُنا۔

تُجھی سے ہیں اے میر یہ خواریاں
نہ بھائی، ہماری تو طاقت نہیں

اُردو کے شاعر تو وہ نہیں تھے، لیکن نثر بڑی دلکش لکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے "روزنامچے" (مُلازمت پولیس کے زمانہ کے) انگریز افسران بھی ادب پاروں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ ان کی قوتِ استدلال بھی بڑی زبردست تھی۔ اس لئے جب پنشن لینے کے بعد وہ رام پور میں وکالت کرنے لگے تو چند دن میں مرجع عام ہو گئے۔

رام پور کا ذکر آ گیا ہے تو کچھ باتیں اس زمانہ کی بھی سُن لیجئے۔ رام پور میں میرے والد کے خاص احباب میں ایک مولوی فرخی تھے (جو نواب حامد علی خاں کے اتالیق و اُستاد تھے اور فارسی و عربی کا بڑا اچھا عمل رکھتے تھے) دوسرے مولانا عرب محمد طیب (مدرسہ عالیہ رام پور کے صدر اور علومِ عربیہ کے بے مثل فاضل و ماہر) تیسرے سنجر ایرانی (درباری شاعر) جن سے میرے والد کے بڑے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ سنجر اچھا شاعر تھا، فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ میرے والد اسے ہمیشہ "سنجرِ دریوزہ گر" کہہ کر چھیڑتے رہتے تھے۔ کیونکہ اس کی شاعری کا سرمایہ امرار کے مدحیہ قصائد کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک دن اسے دربارِ حامدی سے کسی قصیدہ پر قبائے زرکار ملی تو اینڈتا، بررتا، والد کے پاس آیا اور قبا دکھا کر بولا "خان صاحب، دیکھ یہ کیا ہے"۔ والد نے فرمایا کہ "یہ ایک کپڑا ہے جسے ہمارے یہاں صرف عورتیں یا خنیا گر استعمال کرتے ہیں"۔ بولا "ابھی ابھی بازار میں تین ہزار کا سودا کر کے آیا ہوں، لیکن ابھی اسے فروخت نہ کروں گا۔ مبادا نواب کسی دن پوچھ بیٹھے کہ وہ خلعت کہاں ہے۔ جب دوبارہ کوئی خلعت ملے گی تو اس کو بیچ دوں گا"۔ والد نے فرمایا "حیف بر تو اے مرغِ زریں"۔ وہ یہ سُن کر برافروختہ ہو گیا اور بولا کہ "تم بڑے بے وقوف ہو میں نواب کی مدح کرتا ہوں تو وہ مجھے سکّہ ہائے زر دیتا ہے، لیکن تم جو ابوبکر و عمرؓ کی تعریف میں جھک مارتے رہتے ہو، تو وہ تمہیں کیا دیتے ہیں؟" الغرض سنجر اور میرے والد کے درمیان ہمیشہ اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ اس واقعہ کے چند دن بعد وہیں ایک بڑی تقریب میں، مولوی فرخی، سنجر اور میرے والد یک جا بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے کے دروازے سے ایک صاحب داخل ہوئے جو تھے تو ہندو لیکن اپنی سفید داڑھی، وضع قطع سے بالکل مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ والد ان کو جانتے تھے لیکن سنجر واقف نہ تھا۔ والد نے سنجر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "سنجر اُٹھ اور ان کا خیر مقدم کر بہت بڑے شخص ہیں"۔ سنجر فوراً آگے بڑھا،

اور ایرانی تہذیب کے مطابق "آقائے من، قبلۂ من" کہتا ہوا، انہیں اپنی جائے نشست کے قریب لا کر بٹھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد مقابل کی صف سے کسی اور صاحب نے ان نو وارد بزرگ کو مخاطب کیا کہ "لالہ صاحب مزاج تو اچھا ہے" اور اب سنجر کو معلوم ہوا کہ یہ صاحب ہندو ہیں اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ساری محفل کو حیران کر دیا۔ وہ میرے والد کے پاس آیا اور ان سے مخاطب ہو کر چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ "خان صاحب تف بر من کہ ایں ہندو بچہ را۔ جناب گفتم۔ ایں کافر بچہ را قبلہ گفتم" وہ یہ کہتا جاتا تھا اور اپنا منہ پیٹتا جاتا تھا۔ میرے والد اور مولوی فرخی کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا اور سارا مجمع سنجر کی اس دیوانگی پر حیران تھا۔ لالہ صاحب تو خیر اسی وقت اُٹھ کر چلے گئے لیکن اس کے بعد دیر تک محفل پر سناٹا سا چھایا رہا۔

والد مرحوم نماز کے بڑے پابند تھے اور جو اصولِ زندگی انہوں نے بنالئے تھے ان سے کبھی تجاوز نہ کرتے۔ وہ بہت تڑکے صبح صادق کے وقت بیدار ہوتے اور حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد چوکی پر بیٹھ جاتے، وہیں نماز پڑھتے اور اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اس کے بعد کھانا بھی کھا لیتے۔ یہی معمول نمازِ مغرب کے بعد کا بھی تھا۔ وہ چائے یا ناشتہ کے عادی نہ تھے۔ اور (صبح و بعد مغرب) کھانا کھانے کے بعد پھر کچھ نہ کھاتے تھے۔ ان کا یہ معمول آخیر عمر تک قایم رہا۔ اور کبھی اس سے انحراف نہیں کیا۔ اگر کبھی اتفاق سے کسی وقت آدھ گھنٹہ کی بھی دیر ہو جاتی تو پھر وہ دوسرے وقت تک کچھ نہ کھاتے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا وہ اوراد و وظائف کے سخت پابند تھے۔ اور نماز کے بعد دلائل الخیرات، دُعائے عکاشہ وغیرہ پڑھنا ان کے لئے ضروری تھا۔ وہ بلند آواز سے سیفی بھی پڑھتے اور کلمہ کی اُنگلی پر دم

کرکے، اسے سر کے چاروں طرف پھراتے۔ بعض سیفیاں عجیب وغریب تھیں اور شاید انھیں کی وضع کی ہوئی تھیں۔ ایک دن صبح کو میں نے انہیں یہ سیفی پڑھتے ہوئے سُنا۔

"ہر کہ مرا بد گوید و بد بیند و بد اندیشد۔ کرم ایوب در بطن او۔ آرۂ ذکریا بر سر او۔ مُہر سلیمان بر دہانِ او۔ عصائے موسیٰ بر سر او۔ طوفانِ نوح بر قوم او۔ ذو الفقار علی بر گردنِ او۔ قہر خدا بجان اوؑ۔ بحق یا بدوح!"

جب فارغ ہو گئے تو میں نے کہا کہ "نماز کے بعد تو ہمیشہ دُعا پڑھنا چاہیئے لیکن یہ تو بڑی سخت بددعا تھی، اور محض بددعا سے دُشمن کا کیا بگڑتا ہے"۔ فرمانے لگے "تم نہیں سمجھتے، اس سے دشمن کو گزند پہونچے یا نہ پہونچے، لیکن اس سے خود اعتمادی ضرور پیدا ہوتی ہے جو دفاع و مقابلہ کے لئے ضروری ہے"۔۔۔۔ یہ نفسیاتی نکتہ میرے ذہن میں اس وقت نہ آیا تھا۔

والد مرحوم ۱۸۵۷ء سے قبل ہی اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے۔ اور مُلازمت کی جستجو میں تھے۔ لیکن اس دَوران میں ہنگامۂ اِنقلاب شروع ہو گیا اور میری دادی نے انہیں گھر سے باہر نہ نکلنے دیا۔ جب ۱۸۵۸ء میں انگریزی تسلط پھر قائم ہو گیا تو والد مرحوم فتح پور سے کانپور آئے۔

اس وقت لکھنؤ اور کانپور میں شورش تو ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اسے اثرات کے بعد تے لوگوں میں بڑی بے چینی پیدا کر رکھی تھی اور اطمینان کسی کو نصیب نہ تھا۔ ہنگامۂ گیر و دار چار طرف برپا تھا اور مارشل لا کے نفاذ نے طبقۂ اکابر و امراء میں سخت سراسیمگی پیدا کر رکھی تھی۔ ایک ایک مجسٹریٹ کو پھانسی دینے کے اختیارات حاصل تھے۔ اور ہر طرف سُولیاں ہی سُولیاں نظر آتی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جب والد مرحوم کانپور پہونچے۔ اس وقت جتنے انگریز سولین ولائت سے آئے تھے۔ عموماً فارسی داں ہوا کرتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت جو انگریز ضلع کا انچارج ہو کر آیا تھا،

وہ فارسی زبان کا بڑا اچھا ادیب تھا۔ جب والد مرحوم اس سے جا کر ملے اور فارسی میں گفتگو کی تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ فوراً پیشکار کی جگہ دے دی۔ اور سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ جو حکم یہ لکھ دیتے وہ آنکھ بند کر کے دستخط کر دیتا۔ اپنے اس دورِ اقتدار میں۔ صوبۂ آئین و اودھ علی الخصوص لکھنؤ، کانپور کے کتنے اکابر و امرار کی جانیں انہوں نے بچائیں اور کتنے ہدیہائے تہنیت انہیں پیش کئے گئے۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ملازم ہوتے ہی ان کا دورِ خوشحالی فراغ شروع ہو گیا اور وہ صحیح معنی میں امیر ہو گئے۔ اس کا اندازہ آپ صرف ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ نواب دھنیا مہری جو لکھنؤ سے کانپور آ گئے تھے ان سے میرے والد کی پتنگ بازی ہوا کرتی تھی اور ہر پیچ کی ایک اشرفی مقرر تھی۔ منوریخ بنارس سے آتی تھی اور درجنوں پتنگ باز ملازم تھے۔ بٹیر بازی اور مرغ بازی البتہ انہوں نے کبھی نہیں کی لیکن ان کے علاوہ (بادہ خواری چھوڑ کر) اور بہت سی بازیاں جن کا ایک شاعرِ رنگیں مزاج شایق ہو سکتا ہے، ضرور انہوں نے اختیار کیں۔ شعر و سخن کے علاوہ رقص و سرود سے بھی انہیں خاص دلچسپی تھی اور شہر کے تمام عمائد و امرار ان محافل میں شریک ہوتے تھے، یہاں تک کہ خود مجسٹریٹ بھی اس میں حصہ لیتا تھا۔

والد مرحوم فطرتاً بڑے فیاض و دریا دل واقع ہوئے تھے۔ انہیں ہمیشہ تمنا رہتی تھی کہ کوئی شخص ان سے کچھ طلب کرے اور وہ اسے نہال کر دیں۔ چنانچہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ وطن کا ایک نائی کانپور پہونچا اور اپنی لڑکی کی شادی کے لئے مدد چاہی۔ انہوں نے ایک ہزار روپیہ تو اسی وقت دے دیا اور شادی کی تاریخ پر خود فتح پور پہنچ کر نائی کی طرف سے سارے شہر کی دعوت کر دی جس میں ہندو مسلم سب شریک تھے۔ اس کے بعد گھر کی تمام اہم تقریبوں میں "سارے شہر کو

کھانا کھلانا" ان کا معمول ہوگیا تھا جس نے "خان صاحب کی دعوت" کے نام سے روایت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ لیکن باوجود اس خوشحالی کے اپنے اور اپنے خاندان کے مستقبل کی طرف سے وہ ہمیشہ بے پروا رہے۔ لاکھوں کمائے، لاکھوں اڑائے لیکن گھر کا مکان تک درست نہ کرایا۔ حالانکہ میں نے خود اپنے لڑکپن میں لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ "اگر خان صاحب چاہتے تو سونے کی اینٹوں کا محل بنوا لیتے"۔

والد کی زندگی کا دَورِ فراغ تو عرصہ تک قائم رہا لیکن اس کی رنگینی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی، کیونکہ (جیسا کہ خود والد مرحوم نے ظاہر کیا) اسی زمانۂ عیش و مسرّت اور عرُوج کامرانی میں انہوں نے ایک رات خواب میں مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی کو دیکھا کہ وہ انہیں یاد کرتے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ "کبھی ہم سے بھی آکر مل جاؤ" اس خواب کا اتنا شدید اثر اُن پر ہوا کہ صبح بیدار ہوتے ہی وہ کانپور سے چل پڑے۔ اور شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے مُرید ہوگئے۔ ہسوا سے کانپور لوٹے تو بالکل دوسرا عالم تھا۔ نہ اب وہ رنگ رلیاں باقی رہیں نہ زربفت و کمخواب کا لباس، نہ مشاغل لہو و لعب سے دلچسپی باقی رہی، نہ محافلِ رقص و سرود سے، کیونکہ اب وہ "نقشبندی مجددی" ہوگئے تھے اور اس مسلک میں اس نوع کے تمام لذائذ ممنوع ہیں — یہ تھا والد مرحوم کی زندگی کا دوسرا موڑ جس سے انہوں نے آخر دم تک انحراف نہیں کیا اور شعایرِ مذہبی کی پابندی رفتہ رفتہ ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی، لیکن اس ذہنی انقلاب کے بعد بھی انہوں نے اپنی وضع و صورت نہیں بدلی۔ چڑھی ہوئی داڑھی (جس پر وہ روز صبح کنگھا کر کے سکھوں کی طرح ڈھاٹا باندھ لیتے تھے) مینڈھے کی سینگ کی طرح بل کھائی مُونچھ۔ مہندی و وسمہ کا خضاب، کمر میں پٹکا اور اس میں ایک پیش قبض۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بڑے جری اور شیر دل انسان تھے۔

۱۸۹۲ء کی بات ہے، میری عمر اس وقت ۸ سال کی تھی۔ وہ اس وقت

ضلع مرزا پور کے تھانہ " اورائی " کے انچارج تھے ۔ اسی تھانہ کے علاقہ میں ایک گاؤں تھا کھمریا (پٹھانوں کی بستی) اور دوسرا گھسیا " (مسلمان قالین بافوں کا مرکز) ہندو راجپوتوں کی بھی آبادی کافی تھی ۔ نیا نیا طاعون ایکٹ نافذ ہوا تھا ۔ اور ہندو بہت برہم تھے ۔ اس سلسلہ میں چونکہ مسلمانوں نے ان کا ساتھ کم دیا تھا اس لئے وہ مسلمانوں سے بھی کشیدہ ہو گئے تھے، اتفاق سے اسی زمانہ میں بقر عید پڑ گئی ۔ ہندوؤں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ گائے کی قربانی نہ ہونے دیں گے ۔ افسرانِ ضلع فکرمند تھے کہ کیا کیا جائے ۔ والد مرحوم سے پوچھا تو انہوں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ضلع مجسٹریٹ سے کہہ دیا کہ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے اور فکر نہ کیجئے ۔ احتیاطاً ایک انسپکٹر پولیس بھی مع ایک گارڈ کے بھیج دیئے گئے تھے ۔ لیکن جب بقر عید کا دن طلوع ہوا تو خوف کی وجہ سے انہیں بخار آ گیا ۔ والد مرحوم نے ان سے کہا کہ " آپ کے جانے کی ضرورت نہیں، یہیں آرام کیجئے " ۔ اس کے بعد وہ گھر آئے اور میری والدہ اور گھر والوں سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ " زندگی ہے تو لوٹ کر آجاؤں گا، ورنہ فکر مت کرنا، خدا سب کا مالک ہے ۔"

کانٹے کی بات یہ تھی کہ قربانی بھی ہو جائے اور فساد بھی نہ ہو ۔ یہی منشار حکام ضلع کا تھا میرے والد محض پٹھان ہی نہ تھے بلکہ بڑی سوجھ بوجھ رکھنے والے صاحبِ تدبیر انسان بھی تھے ۔ چنانچہ ایک دن پہلے ہی والد مرحوم نے گھسیا کے مسلمانوں کو اور کھمریا کے پٹھانوں سے کہلا بھیجا کہ وہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی قربانی کر لیں اور گاؤں سے باہر نہ نکلیں، میں ہندوؤں کو روک رکھوں گا ۔

چنانچہ چند سپاہیوں کو لے کر وہ بہت صبح چل پڑے اور تمام سربرآوردہ ہندوؤں کو پولیس چوکی پر اکٹھا کیا اور دیر تک انہیں سمجھاتے رہے، مقصود یہ تھا کہ انہیں دیر تک الجھا رکھا جائے اور قربانی ہو جائے ۔ اسی دورانِ گفتگو میں ایک بار پھر ہندوؤں میں جوش پیدا ہوا اور انہوں نے کھمریا کا رُخ کرنا چاہا ۔ یہ رنگ دیکھ کر والد مرحوم کڑک کر بولے کہ " جاتے کہاں ہو پہلے مجھ سے

تو بنیٹ لو اور تلوار کھینچ کر سامنے آگئے ۔ چونکہ وہ فنونِ سپہ گری کے بھی ماہر تھے (شمشیر زنی تو ان کا خاص فن تھا جو انہوں نے لکھنؤ میں کسی میر صاحب سے سیکھا تھا) اس لئے ان کے بینترے دیکھ کر ہندو تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک گئے اور والد مرحوم نے اس موقع سے نفسیاتی فائدہ اٹھا کر محبت و شفقت کے انداز میں گفتگو شروع کردی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قربانی بھی ہوگئی اور فساد بھی نہ ہونے پایا۔ اس کے بعد انہیں بھدوہی بھیج دیا گیا جو بنارس اسٹیٹ کا مشہور قصبہ مسلمانوں کا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کانپور میں وہ کب تک رہے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ کانپور کی ملازمت کے بعد وہ محکمۂ پولیس میں منتقل ہوگئے اور غالباً سب سے پہلے مظفر نگر میں ان کا تقرر ہوا۔ یہاں سے ان کا تبادلہ سنئی گھاٹ (بارہ بنکی) کا ہوگیا (جہاں میں پیدا ہوا) اس کے بعد وہ مرزا پور تبدیل ہو کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پیش کار رہے۔ اس کے بعد دو سال اورائی میں رہے اور پھر بھدوئی بھیج دیئے گئے۔ یہیں میری انگریزی تعلیم شروع ہوئی ۔ یہیں انہوں نے خطاطی، شہسواری اور فنونِ سپہ گری کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ اُستاد مقرر کئے۔ میرے والد چاہتے تھے کہ دُنیا کے تمام علوم و فنون مجھے حاصل ہو جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے کچھ نہ آیا۔ یہاں سے ان کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا۔ حسن گنج و سعادت گنج کے انچارج رہے ۔ اور یہیں سے ۱۹۰۴ء میں ان کی پنشن ہوگئی۔

اس کے بعد وہ رام پور چلے گئے۔ چند دن ملازمت کی اور پھر وکالت شروع کردی ۔ جب ان کی صحت گرنے لگی تو ۱۹۰۸ء میں فتح پور آگئے اور دوسرے سال ان کا انتقال ہوگیا۔

فتح پور آنے کے بعد مولانا ظہور الاسلام (بانی مدرسہ اسلامیہ) اور مولانا نور محمد (مدرسِ اعلیٰ) سے ان کے تعلقات بہت وسیع ہوگئے ۔ یہ دونوں حضرات میرے والد کی صاف گوئی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اور ان کے لطائف سے بہت لطف اُٹھاتے تھے۔

ایک بار مولانا نور محمد صاحب نے نمازِ مغرب کے وقت میرے والد سے کہا کہ "آج نماز مغرب کی امامت آپ کیجیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ "معاف فرمائیں" امام کی۔ ۔ ۔ ۔ سے دو ڈورے گزرتے ہیں (اس سے مُراد ان کی تسبیح کا امام تھا) اور اس کا تحمّل میرے بس کی بات نہیں یہ پیشہ آپ ہی کو مبارک ہو۔"

ایک بار مولانا نور محمد صاحب نے کہا "خان صاحب میرے دل کی سیاہی آج کل کچھ بڑھتی جا رہی ہے"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا نور محمد صاحب کے تعلقات وہاں کے ایک مشہور مختار (وکیل) سے بہت وسیع ہو گئے تھے۔ اور مولانا اکثر کھانا بھی اُنہیں کے ساتھ کھاتے تھے۔ والد مرحوم نے جواب دیا کہ "مولانا حرام کا لُقمہ چھوڑ دیجیے"۔ کیونکہ ان کی رائے میں وکالت کی کمائی (جس میں زیادہ تر جھوٹ سے کام لیا جاتا ہے) حلال کی کمائی نہ تھی۔

رام پور سے فتح پور آنے کے بعد مجھے اور دوسرے کچھ طلبہ کو فارسی پڑھانا شروع کی جس میں۔ ۔ ۔ مولانا حسرت موہانی بھی میرے شریک تھے (اس کا اجمالی ذکر اسی اشاعت میں کسی اور جگہ نظر آئے گا۔)

میرے والد نے تین شادیاں کیں۔ پہلی لکھنؤ (محلہ صدر) کے کسی گھرانے میں؛ اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی فتح پور ہی کے کسی گاؤں میں ہوئی، تیسری مظفر نگر میں میری والدہ سے ۔ ۔ ۔ پہلی شادی سے ایک لڑکی ہوئی میں نے ان کو اور ان کی لڑکیوں کو بھی دیکھا ہے اس کے بعد میری والدہ سے دو بچے پیدا ہوئے ایک بڑی بہن (جو یہیں پاکستان میں مدفون ہیں) دوسرا میں میری والدہ تقریباً دس سال زندہ رہیں اور بھوپال میں ان کا انتقال ہوا۔ میرے بعد دوسری بیوی سے ۱۹۰۰ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا تاریخی نام انہوں نے محمد نجابت علی خاں رکھا تھا۔ لیکن کم عمری ہی میں اس کا انتقال ہو گیا میں اس سے پانچ سال پہلے ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا تھا اور میرا تاریخی نام انہوں نے لیاقت علی خاں رکھا تھا۔

میں نے اپنے بچپن میں اپنی دادی کو بھی دیکھا اور والد کے ماموں، ان کی اولاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کو بھی۔ بڑا آباد گھر تھا۔ (کم از کم بیس افراد ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے) جو دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے بالکل اُجڑ گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ صرف ایک سنسان کھنڈر رہ گیا ہے۔

رام پور میں میرے والد کا قیام جھولے والی املی میں تھا اور مولوی فرخی (اُستاد نواب حامد علی خاں) سنجر، ایرانی شاعر۔ مولوی عرب محمد طیب (صدر مدرس مدرسۂ عالیہ) اور مولوی وزیر محمد خاں سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ نواب حامد علی خاں مرحوم بھی کبھی کبھی یاد کر لیا کرتے تھے۔ نواب مرحوم آخر عمر میں غالی شیعہ ہو گئے تھے اور جب کوئی شخص ان سے ملتا تھا تو وہ سب سے پہلے مذہبی ذکر چھیڑ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے میرے والد سے سوال کیا کہ "معاویہ کی خلافت کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے" میرے والد کو یہ بات ناگوار ہوئی اور پوچھا "کیا آپ حضرت امیر معاویہ کے بارے میں دریافت فرماتے ہیں"۔ نواب نے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے جواب دیا کہ "ہاں انہیں کے متعلق" والد مرحوم نے کہا کہ "جناب امیر معاویہ کی اہلیت خلافت کے بارے میں مجھ سے نہیں، امام حسنؓ سے پوچھیے جنہوں نے ان کی خلافت تسلیم کر لی تھی۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ والد مرحوم کی زندگی اور ان کے ذہنی رجحانات کا، مختصر اس لئے کہ اس وقت میرا مقصود ان کے "سوانح عمری" لکھنا نہیں ہے اور اگر ایسا چاہوں بھی تو ممکن نہیں کیونکہ اوّل تو میں اس وقت پیدا ہوا جب ان کا عالمِ انحطاط تھا۔ علاوہ اس کے جو کچھ سُنا سنایا حافظہ میں موجود ہے وہ بھی بڑی طویل داستان ہے جس کے لئے علیحدہ ایک مستقل دفتر درکار ہے۔

اب رہا خود میں اور میرے حالات، سو اوّل تو وہ ہیں کیا جو میں
بیان کروں اور اگر ہوں تو بھی مجھے اس کا کیا حق حاصل ہے کہ ان کے
بیان سے دوسروں کا وقت ضائع کروں تاہم رسماً کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔
میں میرا تاریخی نام لیاقت علی خاں ہے جس کے اعداد ۱۳۰۲ ہوتے
ہیں اور میں اسی ہجری سن میں پیدا ہوا۔ اس سے میری موجودہ عمر کا
اندازہ ہو سکتا ہے۔

مجھے اپنی زندگی کی سب سے پہلی بات جو یاد ہے وہ اس وقت
کی ہے جب میری عمر ۴ سال کی تھی۔ اور میری علالت سے متعلق تھی۔ اس
کے دوسرے سال میری بسم اللہ ہوئی۔ اور اس وقت سے لے کر اِس
وقت تک جو کچھ مجھ پر گزرا وہ سب یاد ہے۔ اس لئے اگر میں اپنے
تمام تاثرات لکھنے بیٹھوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً ۷۵ سال
کی داستان آپ کے سامنے دُہراؤں اور یہ بات آسان نہیں، لیکن چونکہ
اس وقت مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میری ذہنی زندگی کن کن
ہستیوں سے متاثر ہوئی۔ اور اس تاثر کی نوعیت کیا تھی۔ اس لئے
موضوع نسبتاً مختصر ہو جاتا ہے اور میں اس پر ایک حد تک لکھنے کی
جرأت کر سکتا ہوں۔ ایک حد تک میں نے اس لئے کہا کہ یہ داستان
بھی اپنی جگہ بہت طویل ہے۔ لیکن چونکہ یہ اس سلسلہ میں ان تمام ہستیوں
کا ذکر کرنا جو میری زندگی کے بنانے یا بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔ ضروری
نہیں ہے بنابریں میں ان میں سے صرف چند کے ذکر پر اکتفا کروں گا جنہوں
نے واقعی میری زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔

قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر آؤں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں
غیر معمولی قبل از وقت پختہ ہو جانے والی فطرت لے کر آیا تھا۔ اور
اس میں شک نہیں کہ میرے ذہنی انقلاب کا ایک بڑا سبب یہی میری فطرت تھی۔

عمر کے اس حصّہ میں جب کہ عام طور پر بچّے صرف کھیلتے کودتے ہیں۔ میں تعلیم کے ان منازل سے گزر رہا تھا جو عموماً سنِ بلوغ میں طلبہ کے سامنے آتی ہیں۔ اور میری یہی فطری خصوصیت تھی جس نے آگے چل کر مجھے قدامت پرستی کا (خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو یا کسی اور ذہنی رجعت پسندی سے) مخالف بنا دیا۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ باوجود اس ذہنی خشونت کے میرا (جمالیاتی) ذوق بھی مجھے اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ اچھی صورت اور اچھی آواز میری کمزوری تھی، جو ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ اس نے میری زندگی کو رنگینی بھی بخشی اور داغ داربھی کیا۔ میری راہ میں کانٹے بھی بچھائے اور پھول بھی برسائے۔ لیکن اس وقت میں اپنی زندگی کے اس پہلو کا ذکر نہیں کروں گا۔ گو میری ادبی زندگی کا انقلاب زیادہ تر اسی کا مرہونِ منّت ہے۔

میں اپنی ابتدائی تعلیم کی تفصیل بھی بیان نہیں کروں گا، کیونکہ وہ موضوع زیرِ بحث سے خارج ہے۔ آپ لوگ سمجھ لیجئے کہ میری عمر کا بارھواں سال ہے اور میں اپنے وطن (فتحپور) کے مدرسۂ اسلامیہ میں تعلیم کی غرض سے آجاتا ہوں۔ یہ مدرسہ عربی کا تھا جسے مولانا سید ظہورالاسلام نے قائم کیا تھا، اور جہاں صرف درسِ نظامی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کے ایک خواجہ تاش مولانا نور محمد صاحب تھے اور انہیں کو مولانا ظہورالسلام نے اس مدرسہ کا نگراں اور مختارِ کل بنا دیا تھا۔ یہ پنجاب کے کسی مقام (شاید قصور) کے رہنے والے تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے متّقی انسان تھے۔ لیکن سراپا ہیبت و جبروت، یکسر تقشف و عبوس!

برخلاف اس کے مولانا ظہورالاسلام بڑے رقیق القلب انسان تھے، وہ فارسی کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان کے اس ادبی رجحان نے ان میں زاہدانہ احتساب و داروگیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو و درگزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

مولانا نور محمد صاحب انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے، اور مولانا ظہورالاسلام صاحب موافق، اور اس ذہنی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسۂ اسلامیہ میں عرصہ تک

انگریزی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا نور محمد صاحب حج کو چلے گئے، اور ان کی اس غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مولانا ظہور الاسلام نے دفعتاً انٹرنس تک درجے کھول دیئے۔ مولانا نور محمد صاحب کی ذہنیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ حج سے واپس آئے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ مدرسہ کی تو بالکل کایا پلٹ گئی ہے، ٹاٹ اور بوسیدہ دری کی جگہ کرسی اور بنچوں نے لے لی ہے تو ان کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ان تمام چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا اور وہ اسے برداشت نہ کر سکے کہ جہاں صرف یزداں کی حکومت تھی وہاں اہرمن کا عمل دخل ہو جائے۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ اور مولانا ظہور الاسلام، مولانا نور محمد صاحب کی اس ذہنیت سے بڑے آزردہ تھے، انہوں نے نہایت متانت و خوش اسلوبی سے یہ سب کچھ جھیلا۔ اور مدرسہ کی عربی شاخ کو علیحدہ کر کے مولانا نور محمد صاحب کو اس کا مالک و مختار بنا دیا اور انگریزی تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے اپنی عربی تعلیم کا بڑا حصہ اس دو عملی میں بسر کیا اور میری ذہنیت پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ میں ایک ہی وقت میں مولانا نور محمد صاحب سے عربی بھی پڑھتا تھا اور انگریزی شاخ میں انگریزی بھی۔ اور دو مختلف کیفیات لے کر گھر لوٹتا تھا۔

مولانا نور محمد صاحب عربی کے عالم تھے، لیکن محض صرف و نحو، فقہ و حدیث کی حد تک۔ ان کو منطق و فلسفہ کا ذوق کم تھا اور ادبیت کا بالکل نہیں۔ وہ عالم ضرور تھے، لیکن ان کا علم حاضر نہ تھا اور جب وہ کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو ہمیشہ شروح و حواشی سے مدد لیتے تھے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے لیکن سختی کا یہ عالم تھا کہ طلبہ کو سخت جسمانی ضرر پہونچانے سے بھی ان کو دریغ نہ تھا۔ یہ میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ

میری ذہنیت میں مذہب و مذہبیت سے انحراف کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری ایک حد تک اس ماحول پر بھی تھی۔ میں مولانا کا بہت ادب کرتا تھا (اور ادب نہ کرتا تو کیا کرتا) مگر مولانا کی طرف سے محبت کبھی کسی طالب علم کے دل میں پیدا نہ ہوئی۔ وہ اس رمز سے واقف ہی نہ تھے۔

درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را

میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مولانا کی اس سخت گیری اور طبعی کرختگی کا سبب محض ان کا مذہبی تقشف تھا اور میں اس کمسنی میں بھی بارہا سوچا کرتا تھا کہ اگر عبادت اور مذہبی تعلیم کا صحیح نتیجہ یہی ہے تو مذہب و مذہبیت کوئی معقول بات نہیں۔ دوسری چیز جس نے مجھے مذہبیت کی طرف سے بددل کیا، اس مدرسہ کا حافظ خانہ تھا۔ یہ بڑا قدیم ادارہ تھا جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اور اس بے دردی کے ساتھ کہ اس کے خیال سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ حفظِ قرآن کے باب میں میرے والد کا مسلک کچھ اور تھا اور وہ اس کے سخت مخالف تھے کہ بچوں کو اوّل اوّل کسی غیر زبان میں تعلیم میں لگایا جائے۔ اس لئے خدا کا شکر ہے کہ حافظ خانہ سے مجھے واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوا کرتا تھا اس سے میں کیا، شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار اور بچوں کی آہ و بکا سے مجھے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی میں والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچہ کا جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بیکار کر دیا جائے، تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے۔

لیکن میرا ماحول سب کا سب ایسا تھا کہ وہ ان باتوں کو محسوس ہی نہ کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ حفظِ قرآن اتنے بڑے ثواب کا کام ہے کہ اگر اس سلسلہ میں انسان توازنِ دماغ کھو بیٹھے تو بھی تو اسے انعامِ آخرت کی توقع پر برداشت کرنا چاہیئے۔ بہرحال مدرسہ

اسلامیہ میں مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری و تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا، میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز پیدا کردی تھی، اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی معقول مذہب نہیں۔

میں نماز کا پابند تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ تاہم یہ مجھے خوب یاد ہے کہ جب مولانا نور محمد صاحب نماز پڑھاتے تھے تو میرا جی بالکل نہ لگتا تھا کیونکہ وہ بدآواز و بدلہجہ شخص تھے، برخلاف اس کے جب کبھی مولانا ظہورالاسلام کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو ذہن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی۔ ان کے لہجے کی نرمی و رقت اور اس کے لحن کا میرے دل پر بڑا اثر ہوتا۔

جس وقت تک مولانا سے صرف و نحو، منطق و فقہ کی تعلیم حاصل کی اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ درس نظامی کی کتابیں ان علوم و فنون پر چند مسلّمہ قواعد و اصول پر لکھی گئی ہیں اور ان کو پڑھنا محض پڑھ لینا یا یاد کرنا تھا۔ لیکن جب معانی و بیان اور عقاید و حدیث کی کتابیں سامنے آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا اس میدان کے مرد نہ تھے۔ مختصر المعانی کا درس شروع ہوا تو بالکل میکانکی قسم کا، کیونکہ وہ ادیب نہ تھے، عقائد و احادیث کی کتابوں میں بھی مجھے اکثر سوال کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن محض سوال میں خوف کی وجہ سے نہ کرسکتا تھا اور اگر کبھی اس کی جرأت کی تو اس کا تشفّی بخش جواب نہ پایا۔ ایک بار "شرح عقائد نفسی" کے درس میں "لایجوز اللعن علی الیزید" کا مسئلہ سامنے آیا۔ میں نے سوال کیا اس مسئلہ کا تعلق عقائد سے کیا ہے۔ کیونکہ عقائد کا اطلاق صرف ان باتوں پر ہوسکتا ہے جن پر مذہب کا انحصار ہے اور یزید کے بُرا یا اچھا کہنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

واضح رہے کہ اس وقت میری عُمر ۱۳ سال سے زیادہ نہ تھی اور میرے ساتھی طلبہ سب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے (جن میں سے ایک مولانا حسرت

موہانی کے بڑے بھائی روح الحسن بھی تھے)، لیکن ان میں سے کوئی اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ وہ میری ہاں میں ہاں ملائے ۔ شاید اس لئے کہ وہ واقعی لعن یزید کے مسئلہ کو اس قدر اہم سمجھتے تھے یا یہ کہ مولانا کا رعب ان کو لب کشائی کی اجازت نہ دے سکتا تھا ۔ میں اس قسم کی بحث کے لئے بدنام تھا اور باوجود مولانا کی خشونت و برہمی کے مجھ سے رہا نہ جاتا تھا اور میں مشکل ہی سے کسی ایسی بات کو تسلیم کرتا تھا جو میری سمجھ میں نہ آئے ۔ میری اس گفتگو پر مولانا کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے، انہوں نے اصولاً یہ تو تسلیم کر لیا کہ لعن یزید کا مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ اس پر کفر و الحاد کی بنیاد قائم ہو ۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اس کی اہمیت پر کافی زور دیا گو اس کا سبب وہ اس کے سوا کچھ نہ بتا سکے کہ یہ مسئلہ چونکہ مفہوم "معصیت" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا ذکر ضروری تھا اس کے بعد میں نے پھر اصل مسئلہ کو لیا کہ "لعن یزید" کیوں جائز نہیں ہے ۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ ممکن ہے خدا نے یزید کی غلطی یا معصیت کو معاف کر دیا ہو ۔

میں نے پھر دریافت کیا کہ لعن کا صحیح مفہوم کیا ہے ۔ اس سوال پر مولانا کی خشونت بڑھ گئی ۔ فرمانے لگے کہ لعن بھیجنے سے مراد ایک شخص کو بُرا سمجھ کر اس کے حق میں بددُعا کرنا ہے ۔ میں نے کہا پھر یزید کیا معنیٰ، ہر اس شخص کی لعنت کا سوال سامنے آتا ہے جس کو ہم بُرا سمجھیں، یہاں تک کہ خود یزید پر لعنت بھیجنے والا بھی اس میں شامل ہو سکتا ہے ۔ اگر خدا یزید کو معاف کر سکتا ہے تو وہ یزید کو بُرا کہنے والے کو بھی معاف کر سکتا ہے ۔ علاوہ اس کے میں سمجھتا ہوں کہ لعن کا تعلق دراصل ہماری ذاتی رائے اور تحقیق سے ہے اور یہ نتیجہ ہے ایک ایسے احتساب کا جو ہمیں ایک رائے قائم کرنے اور اس رائے کے اظہار کی بھی اجازت دیتا ہے ۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص جو یزید کے کردار کو قابلِ مذمت قرار دیتا ہے اسے

ظاہر نہ کرے خاص کر ایسی صورت میں جب کہ یہ ایک حیثیت سے قومی، سیاسی، اجتماعی و ملکی اہمیت بھی رکھتا ہے۔

میرے ساتھ درس میں اور بھی متعدد طلبہ تھے جو عمر میں سب کے سب مجھ سے بڑے تھے اور بعض تو میرے والد کی عمر کے تھے۔ مثلاً عزیز الحسن غوری جو وہیں فتح پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، شاعر بھی تھے اور مجذوب تخلص کرتے تھے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو میری ہاں میں ہاں ملاتا۔ یہ سب کے سب بڑی سخت رجعت پسندانہ و مقلدانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ اور وہ مذہبی کتابیں اس لئے نہ پڑھتے تھے کہ انہیں سمجھیں بلکہ صرف اس لئے کہ انہیں پڑھیں اور اس یقین کے ساتھ کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی جماعت میں تکوین کر رہ گیا اور مجھے دیکھتے ہی مولانا کی پیشانی پر شکنیں آجاتی تھیں۔

اس سلسلہ میں ایک بڑا پُر لطف واقعہ پیش آیا۔ ایک دن مولانا نے میرے والد سے شکایت کی کہ آپ کا لڑکا بڑا حجتی ہے اور کوئی بات آسانی سے اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے اور طلبہ کا بھی حرج ہوتا ہے۔ میرے والد نے اس کی تفصیل دریافت کی تو مولانا نے یہی لعنِ یزید والی بحث پیش کر دی۔

میرے والد پُرانے زمانہ کے سخت قسم کے پٹھان تھے۔ وہی سپاہیانہ وضع و صورت اور وہی لب و لہجہ، مذہباً وہ حنفی تھے لیکن علیؓ و حسینؓ کے باب میں ان کا مسلک ایک حد تک تفضیلیہ تھا۔ اور مذہب کا تاریخی مطالعہ ان کا بہت وسیع تھا۔ مولانا سے یہ قصہ سنتے ہی، ان کی تیوریاں چڑھ گئیں وہ بڑے صاف گو انسان تھے، بولے کہ "مولانا یہ بتائیے کہ لعنِ یزید اگر ناجائز ہے تو یزید کو بُرا کہنے والا کسی گناہِ صغیرہ کا مرتکب ہوگا یا گناہِ کبیرہ کا۔

نیز یہ کہ اگر لعنِ یزید "گناہِ صغیرہ" ہے تو عقاید کی کتاب میں صرف ایک اسی گناہِ صغیرہ کا ذکر کیوں اس قدر اہتمام سے کیا گیا اور دوسرے ہزاروں معاصی صغیرہ کو چھوڑ دیا گیا۔ اور اگر گناہِ کبیرہ ہے تو دوسرے معاصی کبیرہ کی طرح اس کی کوئی حد یا سزا کیوں نہ مقرر کی گئی۔ مولانا معاف فرمایئے، آپ صرف درسِ نظامی کے مدرس ہیں اور اسی کے مُعلّم، آپ کا علم صرف چند مخصوص درسی کتابوں تک محدُود ہے۔ نہ آپ لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور نہ فلسفۂ تاریخ کا، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخِ اسلام کا سب سے بڑا اہم واقعہ قتلِ عثمانؓ تھا۔ اور یہ اتنا بڑا فتنہ تھا کہ اس نے نہ صرف مسلمانوں میں تفریق پیدا کر دی بلکہ تاریخِ اسلام کے ساتھ ساتھ نفسِ اسلام و عقایدِ اسلامی پر بھی بڑا خراب اثر ڈالا۔ اور اسلام نام رہ گیا صرف ان سیاسی عقاید کی تبلیغ کا جو علوئین اور امویئن کی طرف سے پھیلائے جارہے تھے۔ ایک طرف علی اور ان کی اولاد پر لعنت بھیجنا مذہب کا ضروری جزو قرار پایا اور دوسری طرف امیر معاویہ اور ان کے اخلاف کو بُرا کہنا مذہبی فریضہ بن گیا۔ اسلام کی سادگی ختم ہوگئی اور ملک کی مصلحت و ضرورت حق پر غالب آگئی۔ ہر فریق کی موافقت میں حدیثیں گڑھی جانے لگیں۔ مسائل فقہ وضع ہونے لگے، تاریخیں مسخ کی گئیں۔ یہاں تک کہ صحیح اسلام گُم ہوگیا۔ اور دُنیا اس کی مسخ شدہ صورت ہی کو اصل مذہب سمجھنے لگی۔ آپ کو خبر نہیں کہ شرح عقاید نسفی، امویئن کے عہد کی کتاب ہے، جو علوئین کے شدید دشمن تھے اور اسی لئے لعنِ یزید کے مسئلہ کو اس قدر اہتمام کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ دراصل "حسینؓ و یزید" کا معاملہ محض ایک تاریخی چیز ہے۔ جس سے عقاید کو کوئی واسطہ نہیں اور محض ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہیئے۔ پھر اگر کوئی شخص واقعاتی حیثیت یا کردار

کے لحاظ سے اس مسئلہ پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہونچے کہ یزید نے جو کچھ حسین کے ساتھ کیا وہ حد درجہ وحشیانہ تھا اور اس کا اظہار کرے تو کیوں اسے ناجائز قرار دیا جائے۔ لفظ لعن یا لعنت کا استعمال تو اس باب میں صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں مذہبی اہمیت پیدا ہو جائے۔ ورنہ یزید کو بُرا سمجھنے اور کہنے کا تعلق صرف تاریخی استنتاج سے ہے۔ اور اس سے کسی کو باز نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر میرے لڑکے نے آپ سے اس مسئلہ میں کوئی مخالفانہ گفتگو کی ہے تو اس کو اس گفتگو کا حق پہنچتا ہے۔ صرف و نحو یا ادب کا درس تو خیر، مقررہ قواعد و اصول کا پابند ہے، اور ریاضی کی طرح انہیں ماننا ہی ہے لیکن فقہ و حدیث کے درس میں آپ اسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی عقل سے کام نہ لے۔ میں اس کا قائل نہیں کہ خدا کے پاس جتنی عقل تھی وہ سب اسلاف میں تقسیم ہو چکی۔ اب عقل کا دروازہ پہلے سے بہت زیادہ کھُل گیا ہے اور مہربانی فرما کر اس دروازے کو میرے لڑکے پر بند نہ کیجئے۔ میں نے آپ کے پاس اسے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ آپ سے وہ کچھ سمجھ حاصل کر سکے، نہ یہ کہ اس کے جو تھوڑی بہت سمجھ موجود ہے وہ بھی اس سے چھین لیں۔

"رہا اصل مسئلہ یزید کے لعن طعن کا سو مولانا آپ کی عقائد نسفی جو چاہے کہیں لیکن میں یزید کو بُرا کہتا ہوں اور اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں، بلکہ ان کو بھی بُرا سمجھتا ہوں جو اس کے بُرا کہنے کو بُرا سمجھتے ہیں۔"

میرے والد بڑے خوش بیان اور بے باک مقرر تھے۔ بڑے بڑے مولوی مذہبی مباحث میں ان کے سامنے سپر ڈال دیتے تھے۔ ہمارے مولانا تو خیر صرف مدرس ہی تھے وہ کیا جواب دے سکتے تھے۔

یہ واقعہ میری زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ اس سے مجھ میں مذہبی

تحقیق کا ایک نیا رجحان پیدا ہو گیا اور صحیح اسلام کو سمجھنے کا شوق میرے اندر بہت بڑھ گیا۔

میں مدرسۂ اسلامیہ میں عربی کا درسِ نظامی حاصل کر رہا تھا اور گھر پر والد سے فارسی پڑھتا تھا۔ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے میں فارسی میں رسائل طغرا بھی پڑھ رہا تھا (جس میں مولانا حسرت موہانی بھی میرے ہمدرس تھے) اور عربی میں درسِ نظامی کا بڑا حصّہ ختم کر کے اس حد تک پہنچ گیا تھا جب صرف و نحو اور منطق کی ضروری تعلیم کے بعد اونچی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

گھر پر میرے اوقاتِ فرصت میں دو خاص مشغلے تھے، ایک فارسی دواوین کا مطالعہ جن میں بیدل اور غالب سے مجھے خاص شغف تھا۔ میرے والد فارسی کے بڑے مشہور شاعر و انشا پرداز تھے۔ غزل سے انہیں بہت کم دلچسپی تھی، صرف قصائد لکھتے تھے اور وہ بھی نعت و منقبت میں۔ صہبائی کے شاگرد تھے اور غالب کی فارسیت کے شیدائی، اس وقت فارسی تعلیم کا رواج کافی تھا اور صبح کو میرا مکان ایک اچھا خاصا درس گاہ ہو جاتا تھا۔ جہاں زیادہ تر پختہ عمر کے لوگ میرے والد سے فارسی پڑھنے آجاتے تھے۔ وہ فارسی کی ابتدائی کتابیں نہیں پڑھاتے تھے۔ بلکہ ان کی تعلیم شروع ہوتی تھی مینا بازار۔ پنج رقعہ، رسائل طغرا، شبنم شاداب۔ بیدل سکندر نامہ۔ شاہ نامہ۔ اور دفاتر ابوالفضل سے۔

میرا دوسرا مشغلہ غیر مذہبی کتابوں کا مطالعہ تھا۔ جن میں تصوّف کی بعض کتابوں سے مجھے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ابن عربی کی فصوص الحکم کا ترجمہ میں نے شروع کر دیا۔ اور جب مولانا نور محمد صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ نہایت سخت وہابی قسم کے مسلمان تھے اور

ابن عربی کے فلسفۂ تصوّف کو جو ماوراء مذہب کچھ اور چیز ہے، وہ کبھی پسند نہ کرتے تھے۔

اس زمانہ میں مجھے شعر کہنے کا بھی شوق پیدا ہوگیا تھا۔ فارسی میں کبھی کبھی اور اُردو میں اکثر۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا حسرتؔ موہانی فتح پور میں زیرِ تعلیم تھے اور ایک خاص حلقہ میں ان کی غزلوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ میں بھی ان کے رنگِ تغزّل سے کافی متاثر تھا۔ لیکن شعر کہتا تھا غالبؔ کے رنگ میں جس میں فارسیت زیادہ ہوتی تھی۔ حُسن و عشق کی باتوں کا صرف کتابی علم تھا اور ان کے اظہار کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ بعد کو میری شاعری کا یہ رنگ بدلا، یہاں تک کہ میرؔ دل و دماغ پر چھا گیا۔ اس رنگ میں خود تو کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن سَر اسی پر دُھنتا تھا۔ چونکہ حسرتؔ سے روز ملنا ہوتا تھا، ان کی شاعری سے بھی کافی متاثر تھا اور غالباً اسی لئے ان کی فارسی ترکیبیں مجھے پسند تھیں۔ یہ نتیجہ تھا ابتدائی کلاسیکل فارسی تعلیم کا، اور اس فارسی ماحول میں جس میں میری تربیت ہوئی۔ میرے والد ہمیشہ اہلِ علم کو فارسی ہی میں خط لکھتے تھے۔ اور طبقۂ علماء میں صرف مولانا محمد علی بہاری (جو کانپور میں مستقلاً قیام پذیر تھے اور ناظم دارالعلوم ندوہ تھے) ایک ایسے مولوی تھے جو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی میرے والد سے فارسی ہی میں مراسلت کرتے تھے۔ اس مراسلت کی ترتیب و تدوین میرے ہی سپرد تھی۔

اس بیان سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ فارسی ادب کا ذوق مجھ میں بہت کم سنی میں پیدا ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ اُردو ادب کا بھی، لیکن اس کی ابتدا نثر سے نہیں بلکہ شاعری سے ہوئی اور جب میں مدرسہ اسلامیہ میں درسِ نظامی کیلئے بھیجا گیا تو میرا شعور کافی پختہ ہوچکا تھا اور اسی لئے میں اپنے اساتذہ سے بعض دینی مسائل میں جن کو میرا ذہن قبول نہ کرتا تھا حجّت کر بیٹھتا تھا۔

شکر ہے کہ حدیث کا درس ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ لیکن جب اس کا درس شروع ہوا تو ایک بڑا ہنگامہ اپنے ساتھ لایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا نور محمد صاحب حج کو تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا محمد حسین خاں کوئی مقرر کئے گئے۔ یہ دیوبند کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ نازک نقشے کے نہایت گورے چٹے، پستہ قد منحنی انسان، حددرجہ مغلوب الغضب اور خشک و عبوس۔ اُن کے دیکھتے ہی مجھے آتش کا یہ مصرع یاد آگیا۔

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیوں کر بنے

انہوں نے آتے ہی سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا کیونکہ دیوبند والے علومِ دینیہ میں حدیث ہی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس میں وہ زیادہ درک رکھنے کے مدعی ہیں۔ میں نے اس وقت تک حدیث کی کوئی کتاب شروع نہ کی تھی۔ اس لئے جب مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا تو میری آنکھوں سے پردہ سا اُٹھ گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ اسلام میں طامات و خرافیات کا عنصر کہاں سے آیا۔

میں نے پہلے ہی دن یہ سمجھ لیا تھا کہ ان نئے مولانا سے میری نہیں بن سکتی۔ مولانا نور محمد صاحب تو خیر کسی وقت مُسکرا بھی پڑتے تھے، لیکن ان حضرت کی ترکہ پیشانی اس وقت بھی دُور نہ ہوتی تھی جب وہ خدا کے سامنے نماز میں مصروف ہوتے تھے چہ جائیکہ درس و تدریس کے وقت تو وہ بالکل خدائے قہار نظر آتے تھے۔

تقرر کے بعد ایک ہفتہ تک تو ان کی تعلیم کا معمول وہی رہا جو اس سے قبل تھا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنے اوقات اور کتابوں میں کچھ ردوبدل کیا۔ فقہ تو نہیں لیکن منطق، فلسفہ، معانی وادب کی کتابوں کا درس کم کر دیا اور درسِ حدیث کی ابتدا کی جو اس وقت نہ ہوئی تھی۔ آخر کار ایک دن

اعلان کر دیا کہ کل سے مشکوٰۃ شریف کا درس شروع ہو گا، سو ہو گیا۔

اس سے قبل فقہی کتابوں کے درس کے سلسلہ میں احادیث کے حوالے تو بار ہا نگاہ سے گزر چکے تھے لیکن فن کی حیثیت سے کتبِ احادیث کے مطالعہ کا اس سے قبل کوئی موقع نہ ملا تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر کتاب کے درس سے پہلے خود گھر میں اس کا غائر مطالعہ کرتا تھا، اور جو شبہات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے، یا جن حصّوں کو میں سمجھ نہ سکتا تھا ان کو کاغذ پر نوٹ کر لیتا تھا اور دوسرے دن درس کے وقت میں مُعلّم و مدرّس کے سامنے اپنی اُلجھنیں پیش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جس دن مشکوٰۃ کا درس ہونے والا تھا اس سے قبل کی رات میں اس ضخیم کتاب کو میں نے اپنے سامنے رکھا اور غور کرنے لگا کہ اگر حدیث سے راویوں کے سلسلہ کو اُڑا دیا جائے اور صرف "قال رسول اللہ" سے ابتدا کی جائے تو کتاب بھی مختصر ہو سکتی ہے۔ اور یہ "عن فلاں، عن فلاں" کے پڑھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بھی بچ سکتا ہے۔ میں نے دوسرے دن صبح اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا کہ آج مولانا سے ذرا یہ بات تو دریافت کرو۔ لیکن کوئی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر کار جب درس کا وقت آیا تو میں نے مولانا سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ "حدیث کے تقدّس کا پُورا احترام رکھتے ہوئے مجھے ایک بات دریافت کرنا ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں"۔ نہایت خشونت کے ساتھ بولے "کیا کہنا چاہتے ہو کہو"۔ میں نے کہا کتبِ احادیث میں جتنی حدیثیں ہیں ان کی تعلیم اس مفروضہ پر منحصر ہے کہ وہ سب صحیح ہیں"۔ مولانا فوراً بپھر گئے اور نہایت تیز اور بلند آواز سے فرمایا۔

"مفروضہ! مفروضہ کیسا؟ جو حدیثیں کتاب میں درج ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں فرض کرنے کا کیا سوال"۔ میں نے کہا۔ معافی چاہتا ہوں، مفروضہ

کہتے سے میرا مطلب یہی تھا کہ جب یہ تمام احادیث صحیح ہیں تو پھر راویوں کے نام کیوں ان میں درج ہیں۔ کیونکہ اصل حدیث تو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن راویوں کی فہرست کئی کئی سطر تک چلی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وقت اور کاغذ دونوں کی کافی بچت ہو سکتی ہے۔" اس کے جواب میں انہوں نے دانت پیس کر کہا کہ "احمق، راویوں کے نام اس لئے ظاہر کئے جاتے ہیں کہ ان پر حدیث کی صحت کا انحصار ہے۔ اگر راوی ثقہ و معتبر نہیں ہیں تو حدیث کو بھی معتبر نہ سمجھا جائے گا۔"

میں نے عرض کیا" یہ بالکل درست ہے اور یقیناً جامعین حدیث نے راویوں کی چھان بین کرنے کے بعد ہی صحیح احادیث کو یکجا کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو اس فہرست رواۃ سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے جب کہ ہم کو خود ان راویوں کا حال معلوم نہیں۔"

مولانا نے فرمایا" راویوں کا حال معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت بھی کیا ہے۔ جب کہ حدیثوں کی کتابوں میں صرف وہی احادیث درج ہیں جن کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ جب ضرورت نہیں تو پھر کیوں انہیں دُہرایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے "علم الرجال" طلبہ کے لئے یوں بھی بیکار ہے کیونکہ انہیں خود اپنی رائے قائم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"

مولانا اس حجت کو برداشت نہ کر سکے اور انتہائی غیظ کے عالم میں کتاب بند کر کے مجھے حکم دیا کہ" درجے سے نکل جاؤ" اسی کے ساتھ ساتھ اپنا ڈنڈا بھی اٹھایا اور اگر میں فوراً اُٹھ کر چلا نہ جاتا تو وہ یقیناً میرا سر زخمی کر دیتے۔

اس کے بعد میں کئی دن تک مدرسہ نہ گیا۔ لیکن ایک دن پھر میرے والد پہنچا گئے اور میں درسِ مشکوٰۃ میں شریک ہو گیا۔ چوں کہ میں سمجھ چکا تھا کہ مولانا محض لکیر کے فقیر ہیں اور ان کا مذہبی تقشف کسی طرح عقلی حجت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے بر بنائے مجبوری میں اس درس میں شریک

تو رہا لیکن کوئی سوال ان سے نہیں کیا۔ اس حال میں کئی دن گزر گئے اور کوئی صورت ہنگامہ کی پیدا نہیں ہوئی۔

ایک دن دورانِ درس میں ایک حدیث آئی جس میں رسول اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ دُنیا میں سردی و گرمی کیوں ہوتی ہے اور اس کا جواب رسول اللہ نے یہ دیا کہ "آسمان میں ایک اژدہا ہے جب وہ اپنی سانس دُنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو گرمی ہو جاتی ہے اور جب سانس کھینچتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے۔"

یہ حدیث پڑھتے ہی باوجود انتہائی ضبط کے بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کہ "غلط" یہ سُنتے ہی مولانا کا یہ حال ہوا جیسے ان پر کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور بولے کہ "بدتمیز تو رسول اللہ کو غلط کہتا ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں رسول اللہ کو غلط نہیں کہتا۔ بلکہ اس حدیث کو غلط کہتا ہوں، کیونکہ رسول اللہ کبھی ایسی خلافِ عقل لغو بات نہیں کہہ سکتے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے اپنا ڈنڈا اُٹھایا اور میں اُٹھ کر بھاگا۔ مولانا نے کچھ دُور میرا تعاقب بھی کیا۔ لیکن میں ہاتھ نہ آیا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے میرا پیچھا ان سے چھوٹ گیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں میرے والد بسلسلۂ رُخصت لکھنؤ جا رہے تھے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔

فتح پور سے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد بھی میرے مذہبی ماحول میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی اور کافی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرا تجربہ مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ اس طبقہ کی طرف میں کبھی مائل نہیں ہو سکتا۔ ان کی رعونت، ان کا تقشف، ان کا فرعونی اندازِ گفتگو، ان کا یہ عقیدہ کہ مذہب کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں اور ان کا یہ پندار کہ وہ عام سطح سے بہت بلند ہیں اور ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ انہیں دیکھتے ہی سر بسجود ہو جائے

مجھے ان سے متنفر کرتا جارہا تھا اور میں بار بار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ اگر یہ واقعی محض مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے تو مذہب سے زیادہ نامعقول چیز دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتی اور اس سلسلہ میں مجھے مذہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔

میں نے مذہب کا مطالعہ صرف اس نقطۂ نگاہ سے شروع کیا کہ اخلاق کی عملی تعلیم کے لحاظ سے اس کا کیا درجہ ہے اور اُس نے مجھے مولویوں سے اور زیادہ متنفر کر دیا۔ کیونکہ جس حد تک اخلاق کا تعلق ہے، میں نے ان میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جسے بعید ترین تاویل کے بعد بھی اسلام اور بانیٔ اسلام کی بلند تعلیم اخلاق سے منسوب کیا جا سکے۔

میں جس وقت ان کے بطون کا تصوّر کرتا تھا تو وہ مجھے بالکل سیاہ پتھر کی طرح نظر آتا تھا اور میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ ان کی روح بالکل اُجاڑ ہے اور ان کا دل بالکل ویران۔ اور روحانی لُطف اور جمالیاتی تسکینِ ذوق کے لحاظ سے ان کی ہستی بالکل "وادیٔ غیر ذی زرع" کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہاں اس سلسلہ میں مجھے بعض ایسے مولویوں سے بھی واسطہ پڑا جن سے مجھے نفرت کی جگہ اُلفت پیدا ہوئی۔ لیکن یہ وہی تھے جو مولوی کم اور صوفی زیادہ تھے۔ ان میں رام پور کے مولانا وزیر محمّد خاں کو میں نے سب سے بلند پایا۔ یہ بڑے فلسفی و منطقی تھے اور مولانا عبد الحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے لیکن درس و تدریس کی دنیا سے ہٹ کر وہ بڑے پیارے عادات و خصائل کے انسان تھے۔ ان کا علم بڑا حاضر تھا، وہ نہایت اچھے مقرر تھے۔ اور طلبہ کو ہر مسئلہ میں مطمئن کر دینے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ لیکن ان کے شاگردوں میں صرف میں ہی ایک ایسا تھا جو آخر وقت تک ان سے حجّت کرتا رہتا تھا اور ایسے مسائل میں جن کا تعلق عقل یا سائنس سے ہے وہ مشکل ہی سے مجھے مطمئن کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہدیۂ سعیدیہ کے درس میں جب "ابطالِ حرکتِ زمین" کا مسئلہ سامنے آیا،

تو بحث زیادہ ناگوار حد تک پہنچ گئی۔ لیکن یہ ناگواری صرف درس کی حد تک محدود رہی۔ اس کے بعد وہ پھر سراپا لطف و محبت تھے اور میں یکسر انقیاد و اطاعت۔

اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ بڑی طویل داستان ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں مولویوں کے بتائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا۔ اور میرا یہ جذبہ انکار کے اجراء کے بعد اس حد تک شدید ہوگیا کہ آخر کار میں نے اس جماعت کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا اور ان کے عقائد اور ان کے اخلاق پر نکتہ چینی شروع کردی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک کے مولوی میرے دشمن ہو گئے۔ اور مختلف مقامات سے میرے خلاف توہینِ مذہب کے مقدمات دائر کرنے کی تدبیریں شروع ہوگئیں۔

مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی۔ لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا۔ یعنی میں ان سے متاثر تو ہوا، مگر یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تاثر تھا اور اس لحاظ سے میں ان کا شکرگزار ہوں کہ اگر ان سے مجھے واسطہ نہ پڑتا تو نہ میں اپنے مذہبی مطالعہ میں وسعت پیدا کرسکتا اور نہ مسائلِ مذہب میں صرفِ عقل کا سلیقہ مجھ میں پیدا ہوتا۔

اب میں اپنی زندگی کے اس پہلو کو لیتا ہوں جس کا تعلق شعروادب سے ہے۔ اور اس کے بھی دو حصے ہیں، ایک کا تعلق ادیبوں اور شاعروں سے ہے اور دوسرے کا عورت اور محض عورت سے، لیکن وہ کم اور یہ زیادہ۔

شعروسخن سے دلچسپی اور عورت کی طرف میرا انجذاب، ان دونوں کی ابتدا اگر ایک ساتھ نہیں ہوئی تو بھی ان دونوں میں اتنا کم فصل ہے کہ میں اس کی حد بندی مشکل ہی سے کرسکتا ہوں۔

شعر و سخن کا ذوق بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں مجھ میں پیدا ہو گیا تھا اور میں فتح پور کے مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں بھی سنایا کرتا تھا۔ ہر چند ان غزلوں میں عورت یا محبوب کا ذکر محض روایتی حیثیت رکھتا تھا اور میں جنسی جذبہ سے آشنا نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی جب میں لکھنؤ پہنچا تو دفعتہً یہ جذبہ بھی میرے اندر نشو و نما پانے لگا اور جب میرے شباب کا پہلا چاند یہاں طلوع ہوا تو عورت ہی میرے آغوشِ تصوّر میں تھی۔

دفعتاً فضائے مذہب و مولویت سے ہٹ کر عشق و محبّت یا بالفاظِ دیگر جنسی رجحان و ہیجان کی دُنیا میں آجانا میری زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے گزر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ذہنی حیثیت سے میں (PRECOCIOUS) کیفیت لے کر پیدا ہوا تھا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اعصابی حیثیت سے بھی میں کچھ ایسا ہی تھا۔ جس کا علم مجھے فتح پور میں تو نہ ہو سکا، لیکن لکھنؤ آنے کے بعد اس نے پے در پے شہابِ ثاقب کی صورت اختیار کر لی جس کا ذمّہ دار بڑی حد تک اپنے والد کو بھی سمجھتا ہوں۔

میرے والد عجیب و غریب اصول کے انسان تھے۔ اور بچوں کی تربیت کے باب میں وہ اس قدر وسیع الخیال تھے کہ موجودہ عہدِ ترقی میں بھی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اپنے والد کا عہدِ شباب نہیں دیکھا۔ لیکن جو کچھ میں نے سُنا اس سے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنی جوانی بالکل اسی فضا میں گزاری تھی جس کا اصطلاحی نام بعد کو "شامِ اودھ" قرار پایا۔ اور اپنے ذوقِ شباب کی تسکین میں انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک رنگین مزاج، دولت مند انسان لکھنؤ کی نشہ بخش اور عشق خیز سرزمین

میں کر سکتا تھا۔

پھر یہ بھی بالکل اتفاقی بات ہے کہ میرے عہدِ شباب کی وہ جھرجھری جو عورت کے جسم سے مس ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے، سب سے پہلے میرے جسم میں بھی نہیں پیدا ہوئی۔

یہ زمانہ ہر حیثیت سے لکھنؤ کا عہدِ زوال تھا اور جان عالم کے بعد کا بھی وہ زمانہ جسے "لگن کی چنگاریاں" کہہ سکتے ہیں۔ گزر گیا تھا۔ لیکن

ابھی باقی تھی کچھ کچھ دُھوپ دیوارِ گلستاں پر

اور یہاں کی گلیوں میں اب بھی خاک چھاننے کو جی چاہتا تھا۔

میرے والد محکمۂ پولیس سے وابستہ تھے۔ پہلے حسن گنج تھانہ کے انچارج تھے، اور پھر کوتوالی کے تھانہ میں آگئے جو چوک کے سرے پہ واقع تھا۔ لکھنؤ کا وہی چوک جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور نے کیا تھا اور پھر اس کے بعد سرشار نے۔ میں اب بھی زیرِ تعلیم تھا۔ فرنگی محل میں مولانا شاہ عبدالنعیم صاحب اپنی زندگی کی آخری ساعتوں سے گزر رہے تھے اور فرنگی محل کے پل پر مولانا عین القضاہ کا بالا خانہ طلبۂ حدیث کا مرکز تھا جس میں بھی شریک ہوتا تھا۔ لیکن نہایت خاموشی کے ساتھ۔ اس لئے نہیں کہ میں حدیثوں پر ایمان لے آیا تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ میں جانتا تھا، صبح کو جامعۂ احرام کے یہ دیقے مجھے کہاں ڈھونڈتا ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، تربیتِ اخلاق کے باب میں میرے والد کا نظریہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ جنسی داعیات کے دبانے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ان کی تسکین ہی کو ذہنی و جسمانی نشو و نما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے تھے۔ اس لئے جب میں اپنی عمر کے ان حدود میں داخل ہوا، ان کو اپنے نظریہ کا عملی تجربہ کرنا تھا تو انہوں نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن آپ کے لئے اس امر کا تصور بھی مشکل ہوگا کہ اب سے ۷۰ سال قبل لکھنؤ کیا چیز تھا اور

اس میں کسی نوجوان کا آزاد چھوڑ دیا جانا کیا معنی رکھ سکتا تھا۔

لکھنؤ کا وہ حصّہ جسے صحیح معنی میں لکھنؤ کہتے ہیں بڑا رومان آفریں حصّہ تھا اور اس کا مرکز چوک تھا، جہاں شام ہوتے ہی رنگینی، تعطر اور حسن و غنا کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ اور جینے سے زیادہ مرنے کو جی چاہتا تھا۔

پھر اس دورِ آزادی میں میں نے وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن گلیوں کی خاک چھانی، کن کن دیواروں کے سائے میں، کن کن راہ گزاروں کی خاک پر میں نے اپنے لمحاتِ شباب صرف کئے یہ بڑی طویل داستان ہے۔ لیکن میرے اس عہد آشفتہ سری کا وہ حصّہ جو میری جولانگاہ شباب کو ایک خاص حد تک کھینچ لایا اس کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔

اس وقت لکھنؤ کی بلند معاشرت کا ضروری جزو یہ بھی تھا کہ امرازادے محافل رقص و غنا میں آزادی سے شریک ہوں اور بعض مخصوص ڈیرہ دار طوائفوں کی صحبت میں لکھنؤی علم مجلس حاصل کریں۔ ان گھرانوں میں اس وقت چودھرائن کا گھرانا خاص امتیاز رکھتا تھا۔ چودھرائن کا مکان اسی جگہ تھا جہاں اب "رِجا بلڈنگ" ہے اور یہ مکان تہذیب و شائستگی کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

شام کو چودھرائن کا مکان بالکل دربار نظر آتا تھا جس میں شہر کے اکثر خوش ذوق لوگ شریک ہوتے تھے اور اس محفل میں چودھرائن کی حیثیت ایک معلّم کی سی ہوتی تھی۔ جس کی گفتگو اور اندازِ نشست و برخاست سے لوگ صحیح لکھنؤی تہذیب سیکھتے تھے۔ اس محفل میں شعر خوانی، داستان گوئی، لطائف و ظرائف، ضلع جگت، رقص و سرود سب ہی کچھ ہوتا تھا اور جب لوگ یہاں سے لوٹتے تھے تو موسیقی کا صحیح ذوق، زبان کا صحیح استعمال، گفتگو کا خاص انداز، لب و لہجہ کی شیرینی، نشست و برخاست

کا انداز اور خدا جانے کن کن باتوں کا درس لے کر لوٹتے تھے الغرض اس
عہدِ زوال میں بھی لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی اس گھرانے سے بڑی حد تک
قائم تھی ۔ جہاں عشق و محبت کی داستانیں ہر وقت بنتی بگڑتی رہتی تھیں ۔

میرے والد نے بھی مجھے اس دربار میں بھیجنا شروع کیا اور یہیں سے میرے
شباب کا وہ دور شروع ہوا جسے میں اپنے ادبی دور کا بھی آغاز کہہ سکتا ہوں ۔

چودھرائن کے گھر جا کر میں کیا محسوس کرتا تھا، یہاں کے ہنگامۂ حسن و شباب
میں مجھ پر کیا گزر جاتی تھی، میرے جسم کی رگیں وہاں کس طرح ٹوٹتی اور
جڑتی رہتی تھیں، میرے شب و روز کس طرح بسر ہوتے تھے، میرے جذبات
کے ہیجان کا کیا عالم تھا اور کس کس طرح مجھے صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی تھی ۔
اس کا بیان بڑی تفصیل کا محتاج ہے ۔ اس عہدِ وارفتگی کا میری ادبی زندگی
پر جتنا گہرا اثر پڑا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اوّل اوّل جب
میں غزل کہتا تھا تو اس میں لایعنی تکلّفات کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا ۔ لیکن اب
رنگِ تغزل کچھ اور تھا ۔ چنانچہ جب میں اس دیارِ حُسن و عشق سے جُدا ہونے
لگا تو میں نے اپنے اس عہدِ رومان کی یاد میں ایک غزل لکھی تھی جس کا
ایک شعر دَورِ خوش کامی سے متعلق تھا ۔ اور دوسرا دَورِ ناکامی سے جسے
ہم "زہرِ عشق" والی فضا کہہ سکتے ہیں :

آپ تھے، میں تھا، شبِ ماہ تھی، تنہائی تھی
ہائے وہ وقت کہ دشوار تھا جینا مجھ کو

اُف ری مجبوریٔ اُلفت، یہ خبر کس کو تھی
تم کو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھ کو

میرا لکھنؤ چھوڑنا، ٹھیک اس وقت ہوا جب کہ میں شباب کے تجربوں اور

سے بھی خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکا تھا اور یہاں کی فضائے حُسن وعشق میرا دامن چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ تھی ۔ میری زندگی کا یہ پہلا سانحہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا کیونکہ جو زخم میں نے یہاں کھائے تھے وہ مندمل ہونے پر بھی عرصہ تک رِستے رہے اور اپنی آئندہ زندگی میں جب کبھی ان زخموں کے چھیڑنے کی فرصت مجھے ملی، میں نے کبھی تامل نہیں کیا ۔ ذہنی و عملی دونوں حیثیتوں سے ۔ گویا یوں سمجھئے کہ فکرِ فضول بھی جاری رہی اور اسی کے ساتھ جرأتِ رندانہ بھی ۔ گو اب ان میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور دوسری کا صرف ماتم گسار ہوں ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلۂ بیان میں، میں اصل موضوع سے ہٹتا جا رہا ہوں ۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ میرے ذہنی انقلاب اور ادبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر "مولوی" اور "عورت" ہی سے ہے ۔ اس لئے مولوی کے ذکر کی تلخی کے بعد "عورت" کا ذکر آ گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جس کے اظہار کا موقع شاید مجھے پھر نہ مل سکے ۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا ۔ کیونکہ اس کا تعلق دراصل میری سوانح حیات سے ہے ۔ جن کی تفصیل کا موقع نہیں ۔ لیکن چند خاص واقعات جنہوں نے واقعی میری ادبی زندگی کو حد درجہ متاثر کیا ۔ اس وقت یاد آ گئے ہیں اور ان کا سرسری ذکر بغیر کسی تاریخی تسلسل کے غالباً ناموزوں نہ ہوگا ۔

اپنی آوارہ گردی کے زمانہ میں ایک دفعہ میں پٹیا اور جے گڑھ گیا اور یہاں ایک سال رہنا پڑا ۔ یہ سال میری زندگی کا عجیب وغریب سال تھا ۔ اس کا اندازہ آپ ایک خط سے کر سکتے ہیں جو میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا تھا:-

"حزیں کو بنارس میں ہر برہمن بچہ" لچھمن و رام نظر آتا تھا، یہاں قدم قدم پر سیتا اور رادھا کا سامنا ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ

بے پردگی دیوانہ طرح انقلاب افگندنش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی گردنیں تنی ہوئی۔ آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پہ بندی، اب آپ سے کیا کہوں کیا چیزیں ہیں"

یہ تھا ایک عمومی تاثر یہاں کی فضا کا جس سے متاثر ہو کر میں نے چند نظمیں بھی لکھیں، لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے جسے یہاں کی نشہ بخش زندگی کا انتہائے عروج CLIMAX کہنا چاہیئے، مجھے اس سرزمین حُسن و شباب کو چھوڑنا پڑا، جس کی ابتدا کچھ اس طرح ہوئی:۔

"شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں۔ مہاراج (سر رنجور سنگھ) کی طلبی کا انتظار ہے کہ دفعتاً سامنے سے ایک مجسمۂ شباب و رعنائی نظر آتا ہے۔ ذی حیات، متحرک، نگراں، خنداں، ٹھیک اسی وقت چوبدار آتا ہے اور میں اندر محل میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن دو چیزیں دماغ سے محو نہیں ہوتیں، ہلکے سانولے رنگ پر شفق کا انعکاس اور طاؤس کی سی مستیٔ رفتار، یہ نقش بعد کو اُبھرتا رہا، نشہ جنوں میں تبدیل ہوتا رہا اور پھر نامہ و پیام کی صورت اس نے اختیار کر لی۔

اس کے چند دن بعد:۔

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلباری کا اہتمام ہو رہا ہے۔ گلاب اور گیندے کے سُرخ و زرد پھولوں سے آنچل معمور ہیں۔ رسم گل باری شروع ہو جاتی ہے۔

چند دن بعد میں نے جب ایک عزیز دوست کو یہ سارا حال لکھا تو اس کے چند فقرے یہ بھی تھے:۔

" تم کبھی ملو گے تو دکھاؤں گا کہ پھول کی پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے، جو میرے سینے تک پہنچ کر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گئی۔

کتاں خویش می شویم بہ مہتاب

رہا انجام و نتیجہ سو اس کے متعلق کیا لکھوں۔ غالب نے ایک جگہ بنارس کا حال لکھتے ہوئے وہاں کی "قیامت قامتاں" اور مژگاں درازاں" کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

زرنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوشش
بہارِ بستر و نوروزِ آغوشش

سو اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں اس شعر کا صرف دوسرا مصرع لکھ کر ختم کر دیتا۔

میرے عشق و جنوں کا یہ دور مختلف مقامات سے تعلق رکھتا ہے، جن میں لکھنؤ، الٰہ آباد، مسوری، سری نگر، ہانسی، بھوپال، رام پور اور کلکتہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ان تمام مقامات میں، میں اور میرا ذوقِ ادب عورتوں سے کس کس طرح متاثر ہوا اور اس میں کیا تاریخی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، بڑی طویل داستان ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص میرے افسانوں کے مجموعوں کا مطالعہ کرے تو اس سے کچھ اندازہ اس حقیقت کا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس سے زیادہ لکھنے کا موقع یوں بھی نہیں کہ اس کا تعلق میرے سوانح سے ہے اور وہ اس وقت زیرِ بحث نہیں۔

ابتداً عمر و عنفوانِ شباب میں مجھے ادبی رسائل کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اور ان سب میں مجھے مخزن سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید سجاد حیدر یلدرم ترکی "آثارِ عالیہ" کے تراجم پیش کر رہے تھے اور اس کا میرے ذوق پر بڑا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کا "خارستان"

"گلستان و شیرازہ" شایع ہوا تو میں نے متعدد ESSAYS اسی رنگ کے لکھے۔" ایک شاعر کا انجام' پارسی دوشیزہ' رقاصہ اور عورت اسی تاثر کا نتیجہ تھے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۱۱ء) میرا اور سید سجاد حیدر کا اجتماع مسوری میں ہو گیا۔ وہ پولیٹکل ملازمت کے سلسلہ میں افغانستان کے ایک امیر زادہ کی نگرانی پر مامور تھے اور میں اسکسنر اسٹیٹ سے وابستہ تھا۔

مسوری کے دوران قیام میں، میں ہر اتوار ان کے پاس صرف کرتا تھا اور سارا وقت ادبی گفتگو میں کٹ جاتا تھا۔ چند دن کے لئے قاضی سرفراز حسین دہلوی (سیاح چین و جاپان) بھی یہاں آگئے تھے۔ اور وہ بھی اس صحبت میں شریک رہتے تھے۔ اس وقت تک یلدرم کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

ادبی منظومات میں سرور جہان آبادی کی نظمیں مجھے بہت پسند تھیں۔ لیکن اقبال کی نظمیں ایک عمیق شاعرانہ احساس میرے اندر پیدا کر رہی تھیں۔ اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال جاری ہوا اور اس کی "انشاءِ عالیہ" نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اسی زمانہ میں اقبال کا شکوہ شائع ہوا، جس نے مجھے یک لخت نظم نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ اور میری پہلی نظم اسی نہج و اسلوب کی "شہر آشوبِ اسلام" کے عنوان سے الہلال میں شائع ہوئی۔

نظموں کے علاوہ میں نے نثر میں بھی سیاسی و قومی مضامین لکھنا شروع کئے جو زیادہ تر زمیندار میں شائع ہوتے تھے۔

اس وقت کے ادیبوں میں خان بہادر میر ناصر علی کا اسلوبِ تحریر بھی بہت پسند تھا لیکن میں اس کی تقلید نہ کر سکتا تھا۔ ان کی تحریریں اُردو میں (ESSAYWRITING) کا بہترین نمونہ تھیں، لیکن اوّل اوّل اس قسم کے مقالے میں نے انگریزی کے مشہور (ESSAYIST) ولیم ہیزلٹ سے متاثر ہو کر لکھے۔ اسی کے ساتھ میں نے مختصر افسانے بھی شروع کئے اور یہ واقعہ ہے کہ میری فسانہ نگاری زیادہ تر یونان کے ضمیاتی لٹریچر سے

متاثر تھی، کیونکہ میں اپنے وہ تمام جذبات جو عورت سے متعلق تھے زیادہ دل کھول کر اس پردہ میں ظاہر کر سکتا تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس میں غالب حصّہ ان جذبات کا تھا جو بڑی حد تک "ناکردہ گناہوں" کی حسرت سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ٹیگور کی گیتا نجلی انگریزی میں شائع ہوئی اور وہ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے فوراً اس کا ترجمہ "عرضِ نغمہ" کے نام سے شائع کر دیا اور ٹیگور کے طرزِ تحریر سے تو نہیں لیکن اس کی معنویت سے ضرور میں نے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔

میری ادبی زندگی کے آغاز کے کچھ دن بعد ہی میری صحافتی زندگی بھی شروع ہو گئی اور اس کا آغاز زمیندار لاہور کے ادارہ میں ہوا (۱۹۱۱ء) اس کے بعد یہ سلسلہ دہلی میں قائم ہوا (۱۹۱۵ء) اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ میری صحافتی زندگی پر مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا اندازِ صحافت (گو میرا اور ان کا ساتھ ایک بار دفتر زمیندار میں ہو گیا تھا) میں نے بالکل قبول نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنی جگہ ایک خاص وزن رکھتا تھا۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں نگار جاری ہوا تو ادب، سیاست، مذہب، اور تنقید سب پر مجھے آزادی کے ساتھ لکھنے کا موقع مل گیا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ادبیات اور صحافت کے سلسلہ میں مختصراً ان حضرات کا ذکر کر چکا ہوں۔ جن کی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔ رہ گئے میرے سیاسی عقائد سو اس باب میں، میں صرف ان چند اکابر کا شکر گزار ہوں جو ملک و قوم کی اجتماعیت کو رنگ و نسل کے امتیاز پر ترجیح دیتے تھے اور ان حضرات میں سب سے زیادہ میں مہاتما کے مشن سے متاثر ہوا۔

مذہب کے باب میں مولویوں کے خلاف ایک منفی قسم کا ردِ عمل جو میرے اندر اوّل اوّل پیدا ہوا تھا، "نگار" کے اجرار کے بعد اس نے زیادہ شدت اختیار کر لی اور اس سلسلہ میں جو جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انہوں نے میری مذہبی آزادی کو اور زیادہ تقویت پہنچائی۔ یہاں تک کہ آج میں تمام علمار کے نزدیک نہایت نامعقول قسم کا مُرتد و مُلحد ہوں اور میں اپنے اسی الحاد کو عین ایمان سمجھتا ہوں۔ ع نازم بکفر خود کہ بہ ایماں برابر ست۔

آخر میں نگار کی زندگی کے متعلق بھی چند جملے سن لیجئے :۔

نگار

غالباً نومبر ۲۱ء کی بات ہے کہ لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) کے مکان پر چند مخصوص احباب (ڈاکٹر ضیار عباس ہاشمی۔ مخمور اکبر آبادی۔ ملک حبیب احمد خاں، مقدس اکبر آبادی، شاہ دلگیر اکبر آبادی، وغیرہ اور خود لطیف صاحب) کا اجتماع ہے اور ایک رسالہ جاری کرنے کی تجویز پر گفتگو ہوتی ہے (اس وقت نقّاد بند ہو چکا تھا) اور اس کا اجرار طے پاجاتا ہے۔ اس کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں ایک نام کا، دوسرا سرمایہ کا، چونکہ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ میں اسے مُرتّب کروں گا اس لئے ایڈیٹر کی زندگی کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ رہا نام اس کے متعلق جب میری رائے طلب کی گئی تو میں نے نگار تجویز کیا، کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی زبان سیکھنے کا جنون مجھ پر سوار تھا اور "نگار بنتِ عثمان" ترکی کی مشہور شاعرہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب سرمایہ کا سوال سامنے آیا تو یہ طے پایا کہ فی الحال کم از کم بیس اصحاب بیس بیس روپے نگار فنڈ میں جمع کر دیں اور پہلا پرچہ آگرہ سے شائع ہو اس کے بعد میں بھوپال واپس آگیا اور پہلا پرچہ (فروری ۲۲ء) مرتّب کر کے آگرہ بھیج دیا۔ اور مخمور و لطیف نے اسے آگرہ پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اوّل اوّل کن حضرات نے موجودہ عطیہ ادا کیا لیکن اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ اُمید سے بہت کم

سرمایہ فراہم ہوا تاہم چونکہ نگار اپنی پہلی ہی اشاعت کے بعد خود کفیل ہو گیا تھا، اس لئے سرمایہ کی فراہمی کا سوال زیادہ اہم نہ رہا اور دسمبر ۲۲ء تک نگار آگرہ ہی سے نکلتا رہا۔ چونکہ یہ بات زحمت طلب تھی کہ رسالہ کی ترتیب بھوپال میں ہو اور اشاعت آگرہ میں، اس لئے فروری ۲۳ء کے نگار سے نگار کی اشاعت بھی بھوپال ہی سے شروع ہو گئی اور جنوری ۲۳ء کے نگار میں احباب نگار کا ایک گروپ یاران نجد کے عنوان سے آگرہ اور بھوپال کے اس تعلق کی یاد میں شائع کر دیا گیا۔ اس کے افراد یہ تھے۔

امام اکبرآبادی، محمد امین۔ بیدل شاہجہانپوری۔ جعفری۔ حبیب احمد خلیقی۔ دلگیر۔ ضیائی۔ رؤف۔ نذیر احمد قریشی۔ لطیف۔ مانی جائسی۔ مخمور۔ مقدس۔ نیاز۔ محمد احمد۔ ان میں سے چھ احباب بیدل۔ جعفری۔ حبیب۔ خلیقی۔ دلگیر اور قریشی۔ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں۔ مخمور۔ ضیائی۔ امام۔ محمد احمد پاکستان میں ہیں اور مانی و امین، ہندوستان میں۔

جب نگار کا دفتر بھوپال منتقل ہوا تو اس کی ساری ذمہ داری میرے سر آ گئی۔ لیکن دسمبر ۲۵ء تک وہ بدستور آگرہ پریس ہی میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد جنوری ۲۶ء سے نگار وصل بلگرامی مرحوم کے مقبول المطابع لکھنؤ میں چھپنے لگا اور پھر ۲۷ء میں جب میں نے لکھنؤ پہنچ کر نگار پریس قائم کیا تو جولائی ۲۷ء سے وہ خود اپنے پریس میں طبع ہونے لگا۔

ہندوستانی جرائد و رسائل کی تاریخ میں صرف نگار ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اولین تاریخ اشاعت سے آج تک (یعنی پورے ۴۳ سال میں) برابر پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ زمانہ ہمیشہ اس کے موافق رہا ہے۔ پہلا جھٹکا تو نگار کو اس وقت پہنچا جب ۲۴ء میں الائنس بنک کا دیوالیہ نکلا اور نگار کا تھوڑا بہت جو کچھ سرمایہ تھا وہ ضائع ہو گیا۔

میں نے اس اُفتاد کا مقابلہ جس طرح کیا اس کا ذکر ضروری نہیں نہ میں نے احباب کے سامنے دستِ سوال پھیلایا اور نہ انہوں نے پیش قدمی کی۔ تاہم میں نے نگار کی وضع و رفتار میں فرق نہ آنے دیا۔ اس کے بعد دوسرا صدمہ نگار کو لکھنؤ میں اس وقت پہنچا جب کلکتہ نیشنل بنک دیوالیہ ہوگیا۔ یہ حادثہ کس قدر سخت تھا اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جس دن بنک فیل ہوا ہے۔ نگار کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ وہ ڈاک کا خرچ برداشت کر سکتا۔ ہر چند اس حادثہ کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا لیکن جب مالک رام صاحب کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے از خود ایک گرانقدر رقم میرے پاس بمبئی سے بھجوا دی اور یہ سخت گھڑیاں بھی آسانی سے گزر گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس وقت یہ سطور ان کی نگاہ سے گزریں گی تو انہیں تکلیف ہوگی۔ لیکن ان کو خوش رکھنے کے لئے میں کیوں کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوں۔

نگار کے لکھنوی دور کا ایک اور واقعہ جس نے مجھے کم از کم ایک سال تک مضطرب رکھا، ۱۹۳۲ء سے تعلق رکھتا ہے۔ جب ہندوستان کے تمام اکابر علماء نے میرے اور نگار کے متعلق ایک متفقہ محاذ قائم کر کے، نہ صرف یہ کہ مجھ پر کفر و الحاد کے فتوے صادر کئے، نہ صرف یہ کہ میرے خلاف توہینِ مذہب کے مقدمات چلانے کی زبردست عملی تحریک شروع کر دی، بلکہ مجھے شردھانند ثانی کہہ کر، میرے قتل پر بھی عوام کو اُکسایا۔ لیکن چونکہ تعلیم یافتہ طبقہ میرے ساتھ تھا، اس لئے میری جان بھی محفوظ رہی اور نگار کی اشاعت پر بھی اس کا اثر نہیں پڑا۔

اس کے بعد مجھے یہاں زندگی کے دو بہت اندوہناک واقعے پیش آئے۔ پہلے ۱۹۴۲ء میں میری رفیقۂ حیات اور اس کے چند سال کے بعد میری لڑکی شوکت کی موت۔ اور میں ان کو بھی جھیل گیا۔

لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمانہ کے ترکش میں ایک آخری تیر اور بھی ہے۔ ایسا

زہر آلود تیر کہ اس سے جانبر ہونا میرے لئے دشوار ہو جائے گا۔ اس کی توضیح ضروری نہیں، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کا یہ دردناک تجربہ سنہ ۶۱ء سے شروع ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ میرے نظامِ عصبی دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اشتہا مفقود ہو گئی اور غذا ترک، یہاں تک کہ میں صاحبِ فراش ہو گیا اور زندگی سے بالکل مایوس۔ پھر اگر میں تنہا ہوتا تو مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں کہ میں اس ماحول میں جان دینے سے گریز کرتا، لیکن چونکہ میری رفیقۂ حیات اور اپنے دو چھوٹے بچوں کا مستقبل بھی میرے سامنے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد ان کو سخت تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑے گا، اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان لے کر پاکستان چلا آؤں۔ جہاں میرے اور میری بیوی کے تمام اعزہ پہلے ہی سے موجود تھے اور مجھے یقین تھا اور ہے کہ میرے بعد وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی یہاں بسر کر لے جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انہیں کوئی ستائے گا نہیں۔

ہندوستان میں، میں نے جیسی کامیاب زندگی بسر کی اور وہاں کی حکومت نے میری جتنی قدر افزائی کی، اس کا اقتضاء یہی تھا کہ میں وہیں جان دیتا، لیکن افسوس ہے کہ ان ناگزیر حالات نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا اور حیرت ہے کہ یہاں آکر میری صحت و توانائی پھر عود کر آئی۔ اسی کے ساتھ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ نگار کی اشاعت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ جولائی سنہ ۶۲ء کا نگار میں لکھنؤ سے شائع کر کے آیا تھا اور اگست سنہ ۶۲ء سے اس کی اشاعت یہاں ہونے لگی۔

میں احبابِ پاکستان کا شکر گزار ہوں جنہوں نے یہاں کی فضا کو سازگار بنا کر میری اور نگار کی عمر چند سال اور بڑھا دی۔ آخر میں مجھے جناب فرمان فتح پوری کا ذکر کرنا ہے۔ جنہوں نے ادارت نگار کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر میرا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ "شکریہ" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال نہیں کیا کہ وہ

میرے ہم وطن ہیں، میرے عزیز اور مخلص دوست ہیں اور وہ یہ سب کچھ مجھے اور "نگار" دونوں کو بالکل اپنا سمجھ کر کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اپنے فرزندانِ عزیز عارف نیازی اور قمر نیازی کی صحت و سلامتی کے لئے بھی دُعاگو ہوں، جن کی محنت و کاوش کی بدولت نگار نہ صرف یہ کہ اپنے وقت پر شائع ہو رہا ہے بلکہ کافی ترقی کر رہا ہے۔

(۲) ۱؎

میری عمر اس وقت ۸۰ سال کی ہے اور پانچ سال کی عمر سے لے کر اس وقت تک ۷۵ سال کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں اس لئے کہ اس پون صدی کے دنوں کا شمار کیا جائے جو ۲۷۳۷۵ ہوتے ہیں اور ہر دن کے لئے اوسطاً میں صرف ایک سطر لکھنے پر قناعت کروں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ۱۵ سطر کے مسطر پر میں نے ۲۵۰۰ صفحات کی کتاب لکھ دی۔ حالانکہ میں نے اپنی زندگی کے کچھ دن ایسے بھی گزارے ہیں کہ ان کا ایک ایک لمحہ پوری "داستان ہوشربا" ہے اور "شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں" پوری "تاریخ ظلمات" ہے۔ پھر بتائیے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے لئے "کہاں سے جگر آئے"... لیکن چونکہ طفیل صاحب کا اصرار بھی تقاضائے مرگ سے کم نہیں اس لئے سرگزشت تو خیر کیا اپنی سخت جانی کے چند واقعات سنا کر اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دنیا میں غالباً کوئی ایسا شخص نہیں جو کسی نہ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہو حادثہ سے میری مراد اعزّہ و اقربا کی موت نہیں کیونکہ اوّل تو موت کوئی حادثہ نہیں زندگی کا انجام ہے (اور اگر ہو بھی تو باور کیجئے کہ اس وقت تک میں دو سو سے زیادہ اپنے عزیزوں کو سپردِ خاک کر چکا ہوں) بلکہ حادثہ سے مراد وہ آفاتِ ارضی و سماوی ہیں جو خلافِ توقع بالکل اچانک سامنے آجاتے ہیں اور اس کا نتیجہ اکثر و بیشتر موت ہی ہوا کرتا ہے۔ پھر اگر میں یہ کہوں کہ حوادثِ اربعہ عناصر کی کوئی صورت ایسی نہیں جو مجھے پیش نہ آئی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مجھ سا سخت، اور مجھ سا

۱؎ مطبوعہ، نقوش۔ شخصیات نمبر

خوش نصیب انسان کوئی اور مشکل ہی سے آپ کو نظر آئے گا۔

دنیا کے وہ عناصر جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے چار ہیں۔ آب، آتش خاک، باد اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی دشمن ہو جائے تو زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن باور کیجئے کہ میں نے ان چاروں عناصر کی شدید گرفت میں آجانے کے بعد بھی ان کا مقابلہ کیا ہے۔ اور کامیاب ہوا

(۱) طالب علمی کا زمانہ ہے اور میں اپنے وطن فتحپور میں ہوں، عمر بارہ سال کی ہے اور سنہ ۱۸۹۶ء۔ ہر جمعہ کی صبح کو چند ساتھیوں کیساتھ آبادی سے باہر نکل کر دن بھر باغ و صحرا میں چکر لگانا، زندگی کا معمول ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانہ میں ہم سب ایک باغ میں جمع ہیں اور فکر یہ ہے کہ صرف آموں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ یہ باغ میرا ہی تھا اسلئے سوال سرقہ کا بھی نہ تھا۔ آم کا ایک درخت وسیع پختہ کنوئیں کے کنارے واقع تھا اسی پر سب چڑھ گئے اور آم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً پورب کی طرف سے سیاہ آندھی اٹھی اور آناً فاناً اتنی تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اسی کیساتھ ہوا کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ وہ درخت جس پر ہم لوگ سوار تھے پر کاہ کی طرح ہلنے لگا اور اسکی شاخیں چرچر کرنے لگیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہوش و حواس، بصارت و آواز سب گم۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ شاخیں، ایسی چرچراہٹ کیساتھ جیسے کوئی مہیب دیو چیخ رہا ہو ایک ایک کر کے زمین پر آرہیں۔ اتفاق سے وہ شاخ جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کنوئیں پر گری، اور بجائے اس کے زمین سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جاتا، میں کنوئیں کے خلا میں لٹک گیا۔ کنواں کافی گہرا تھا اور اگر شاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں یقیناً ڈوب جاتا، لیکن میں نے اپنے حواس بجا رکھے (آندھی بھی اب گزر گئی تھی) اور پھر شاخ پر سنبھل کر بیٹھ گیا میرے پاؤں اب بھی پانی کی سطح کو چھو رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد لوگ ہماری تلاش میں نکلے اور جب انھوں نے مجھے کنوئیں سے نکالا تو میں نے دیکھا کہ میرے تمام ساتھی شاخوں میں الجھ کر ختم ہو چکے تھے۔

(۲) رامپور میں ہوں، میرے والد بھی پنشن لینے کے بعد وہیں وکالت کر رہے ہیں اور مولانا وزیر محمد خاں سے فلسفہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ بات ۱۸۹۶ء کی ہے۔ مولانا مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور رات کو بھی میں انہی کے مکان کے ایک کمرے میں سوتا تھا کیونکہ میں صبح زیادہ دیر میں اُٹھنے کا عادی تھا اور والد مرحوم بہت صبح تہجد کے وقت بیدار ہو کر سب کو جگا دیتے۔

میرا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل کم از کم دو گھنٹہ ضرور مطالعۂ کتب میں صرف کرتا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا کہ ایک رات میں کتاب دیکھتے دیکھتے سو گیا اور چراغ گل نہ کر سکا (اس وقت بجلی کیا لالٹین کا رواج بھی بہت کم تھا) رامپور میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لئے دو دو رضائیاں ملا کر مجھے اوڑھنا پڑتی تھیں، انہی میں لپٹ کر غافل سو گیا کمرہ میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ صبح تین بجے دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ دم گھٹ رہا ہے اور گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سارے کمرے میں دھواں بھرا ہوا ہے۔ میرا بستر، میری رضائیاں اور تکیے نصف جل چکے تھے اور میرے جسم کے کپڑے بھی سلگ رہے تھے۔ معلوم نہیں کس وقت چراغ کی بتی بستر پر آ گری اور کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ چونکہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا اور ہوا کے گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی اسلئے آگ شعلہ نہ بن سکی اور میں محفوظ رہا۔

(۳) اب سے پورے ۶۳ سال قبل (۱۹۰۰ء) کا ذکر ہے، میں مرادآباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ پا رہا ہوں اور معمولاً ہر تعطیل میں رامپور اپنے والد کے پاس چلا جاتا ہوں۔ زیادہ تر ریل سے اور کم تر تانگے پر۔ رامپور اور مرادآباد کا فاصلہ بہت کم ہے زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ میل اور ان دونوں شہروں کے درمیان سڑک کا راستہ بڑا آباد رہتا تھا۔ تانگے، یکے، بیل گاڑیاں وغیرہ سبھی چلتے تھے۔ مرادآباد، دریائے رام گنگا پر واقع ہے اور رامپور دریائے کوسی پر اور یہ دونوں بارش کے زمانہ میں بہت پُرشور اور خطرناک ہو جاتے ہیں اس لئے اس زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ سے ان کو عبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، تاہم جانے والے جاتے ہی تھے۔ علی الخصوص غلہ وغیرہ تو عموماً کشتیوں پر ہی پار ہوتا تھا۔

جب جولائی ۱۹۰۰ء میں اسکول ایک ہفتہ کے لئے بند ہوا تو معمولاً میں نے رامپور جانیکا قصد کیا۔ میرے ساتھیوں میں چند ایسے بھی تھے جنہیں رامپور سے ۳۰ میل اور آگے بریلی جانا تھا اور ریل پر جانا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں بھی انکے ساتھ بریلی چلوں لیکن میں نے انکار کر دیا اور دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مرتبہ کیوں نہ ریل کی جگہ یہ سفر تانگہ پر کیا جائے۔ اس سال بارش غیر معمولی طور پر بہت زیادہ ہوئی تھی اور رام گنگا کی طغیانی نے کشتی کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا تھا۔ لوگوں نے مجھے سمجھایا بھی کہ یہ ارادہ ترک کر دوں لیکن میں نہیں مانا کیونکہ میری فطرت شروع ہی سے ایسی تھی کہ جب امن و خطرہ کی دونوں راہیں میرے سامنے ہوتی تھیں تو میں ہمیشہ خطرہ کی راہ اختیار کرتا تھا اور آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ رام گنگا کو کشتی پر ہی عبور کروں گا۔

اس وقت رام گنگا کا یہ عالم تھا کہ حد نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور اسکی پرشور اونچی لہریں سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یوں تو ساحل پر متعدد کشتیاں رہتی ہیں لیکن بارش کے زمانہ میں صرف بار برداری ہی کی بڑی کشتیاں کام کرتی تھیں اور دن میں صرف ایک بار آتی جاتی تھیں۔

میں صبح آٹھ بجے ساحل پر پہنچ گیا۔ ایک بڑی کشتی جو مردوں، عورتوں، بچوں گائیوں، بھینسوں، گھوڑوں اور غلّہ کی بوریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی، چھوٹنے والی تھی، میں بھی جلدی جلدی ریت کے ساحل کو عبور کرکے کشتی کے ایک کونہ میں بیٹھ گیا اور وہ چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ کم از کم چار گھنٹے اس کے دوسرے کنارہ تک پہنچنے میں لگیں گے۔ اس وقت دریا کا پاٹ ایک میل سے کم نہ تھا اور حالت یہ تھی کہ کشتی جتنی آگے بڑھتی جاتی تھی پانی کی زبردست لہریں اٹھ اٹھ کر اسے پیچھے ڈھکیل دیتی تھیں اور وہ کانپ کانپ کر رہ جاتی تھیں۔ خدا خدا کر کے دوپہر تک وہ وسط دریا میں پہنچی جہاں اس کے دھاروں کا پورا زور تھا لیکن شومیٔ قسمت کہ ٹھیک اسی وقت کشتی کی تہ میں ایک بڑا سوراخ پیدا ہو گیا اور ایک بلند فوارہ پانی کا اچھلنے لگا۔ ملاحوں نے انتہائی کوشش کی کہ یہ سوراخ کسی ترکیب سے بند ہو جائے لیکن وہ

کامیاب نہ ہوئے اور اب اس کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی کہ جو پانی کشتی میں آرہا ہے اسے اُلچ اُلچ باہر پھینکتے رہیں۔ چونکہ خطرہ جان کا تھا اس لئے سبھی مسافر اس کام میں لگ گئے لیکن پانی اتنی تیزی سے اندر آرہا تھا کہ اسکا مقابلہ ممکن نہ تھا آخر کار پانی اتنا بڑھا کہ غلّہ کے بورے نصف نصف ڈوب گئے اور جو جانور کشتی میں تھے پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ مسافروں کا شور اور عورتوں کی گریہ وزاری بچوں کی چیخ پکار نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور میں ایک کونہ میں بیٹھا ہوا اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا کشتی کی رفتار اب بہت سست ہوگئی تھی کیونکہ اس پر پانی کا وزن بڑھتا جا رہا تھا اور چپوؤں سے کام لینا بھی ملاحوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ تاہم چونکہ ہوا کا رُخ موافق تھا اس لئے وہ آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

رام گنگا کے بعض دھارے تو بیچ میں تھے لیکن ایک سب سے زیادہ خطرناک دھارا مشرقی ساحل کے قریب تھا اور کشتی کا رخ اسی طرف تھا لوگوں کو بالکل یقین تھا کہ کشتی اس دھارے سے صحیح وسلامت نہ گزر سکے گی اور اس یقین کے تحت سراسیمگی کا جو عالم ہونا چاہیئے وہ انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور چیخ پکار ہائے وائے نے طوفان کے شور کو بھی دبا دیا تھا۔

مجھے کیا سبھی کو یقین تھا کہ بچنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں اور فرط مایوسی سے ہر شخص نڈھال تھا۔ میں نے سوچا کہ جان تو جاتی ہی ہے کیوں نہ کوئی آخری کوشش جان بچانیکی کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ جسوقت کشتی مشرقی دھارے پر پہنچے گی تو یقیناً ڈوب جائیگی اس لئے میں نے مسافروں سے کہا کہ جان بچنے کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو لوگ پیرنا جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو دریا میں ڈالدیں اور ساحل تک کا فاصلہ (جو سو گز سے کم نہ تھا) پیر کر عبور کریں۔ یہ کہکر میں نے پانی میں چھلانگ لگادی اور میرے ساتھ دس بارہ آدمیوں نے اور بھی ــ میرا یہ فعل یقیناً خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت مفر کی تھی بھی نہیں۔

جس وقت میں پانی میں کودا تو ایک لہر مجھے سیدھی تہ تک لیگئی لیکن چونکہ میں

فنِ شناوری سے واقف تھا اور زمانہ بھی عنفوانِ شباب کا تھا اس لئے میں ہاتھ پاؤں چلا کر ابھرا اور موجوں سے لڑتا بھڑتا ساحل کی طرف بڑھا۔ چیخ پکار کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آرہی ہے لیکن پھر مڑ کر میں نے کشتی کو نہیں دیکھا۔ اس کے دس منٹ بعد جب میں کنارے تک پہنچ گیا اور پلٹ کر کشتی کو دیکھنا چاہا تو ایک بھنور کے سوا جو ساری کشتی کو مع اسکے مسافروں کے نگل چکا تھا اور کچھ نظر نہ آیا۔

(۴) ۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باونی کدارہ (بندھیل کھنڈ) سے ہو گیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہد حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی... محمد سلیمان خاں موداہا (ضلع ہمیر پور) کے تھانہ میں معمور تھے اور میں ہر پندرھویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔ یہ سفر میری انتہائی تفریح کا ہوتا تھا کیونکہ بالعموم میں شام کو چلتا تھا اور راستہ کے سنسان جنگل طے کرتا ہوا رات کو نو بجے موداہا پہنچتا تھا۔ گھوڑے کی سواری کا مجھے بڑا شوق تھا اور جب اس کا موقع نہ ہوتا تھا تو پھر میں پیدل سفر کرتا تھا۔ چنانچہ میری عمر کا وہ حصہ جو بندھیل کھنڈ میں بسر ہوا یا تو گھوڑے کی سواری کے لئے وقف تھا یا پیدل چلنے کے لئے اور اس سلسلہ میں جن جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک علٰحدہ مستقل داستان ہے جسکے چھیڑنے کا موقع نہیں۔ اسوقت تو صرف اس حادثہ کا ذکر سن لیجئے جو ایک بار کدورہ سے موداہا جاتے ہوئے پیش آیا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا لیکن ذرا دیر سے، اس لئے جب میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور ہے، آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہو چکا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور موداہا جانے کے لئے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے اور میں ریت کے اس حصہ کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے ہی پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ ریتیلا حصّہ ہے جو بظاہر صاف اور مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ میں نے بارہا اس دریا اور اس کے ریگستانی حصّہ کو طے کیا لیکن کبھی چور بالو سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس وقت چونکہ مجھے جلدی تھی اس لئے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک ریتیلی تنگنائے ملی اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اس کو پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا اندازہ نہ کر سکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز سمجھا تھا حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ پھر میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا اور اس کے اگلے پاؤں ریتیلے حصّہ کے اندر ہی رہے۔ خیر یہ تو کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میں اس پر دھیان دھرتا لیکن جب اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (کیونکہ اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پیٹ ڈال دیا جائے۔ اگر میں گھوڑے پر سوار نہ ہوتا تو بیشک اس ترکیب پر عمل کر سکتا تھا لیکن اب کہ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا کیونکر اس پر عمل کر سکتا تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لئے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے نکال کر اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا لیکن لگام بدستور اپنے ہاتھ میں رہنے دی کہ ممکن ہے اس کے جھٹکا دینے سے گھوڑا کسی وقت اوپر آجائے۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے اور میں نے انہیں آواز دی۔ وہ غریب دونوں دوڑتے ہوئے میرے

پاس آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا ایک سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیونکر نکالا جائے۔ سو اس کے لئے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرا سرا پکڑ کر قریب ہی ایک اونچی جگہ لے جا کر لگام کو جھٹکا دینے لگا۔ گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ اس جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور گھوڑا دھنستے دھنستے غائب ہو گیا۔ خیر گھوڑے کی جان جانے کا صدمہ تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن اب یہ فکر لاحق تھی کہ دس میل کا صحرائی راستہ کیونکر رات کو طے کیا جائے، اس لئے مجبوراً مجھے یہ سفر ملتوی کرنا پڑا اور رات بھر بیری میں بسر کرنے کے بعد صبح کو کدورہ پہنچا اور ساری سرگزشت نواب صاحب کو سنائی اور وہ حسب معمول صرف مسکرا کر رہ گئے۔

یہ تھے میری زندگی کے وہ چار حادثے جن کا تعلق صرف اربعہ عناصر سے تھا لیکن اس سے ہٹ کر میں کن کن خطروں سے دوچار ہوا ہوں ان کی داستان بہت طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بار ریلوں کے تصادم میں بھی زخمی ہوا۔ ڈاکوؤں نے بھی مجھے بارہا گھیرا اور شکار کے سلسلہ میں خدا جانے کتنی بار شیروں نے رحم کھا کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہر چند میں شیر کا شکار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی کبھی مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے۔ سب سے آخری واقعہ بھوپال کا ہے جب شیر مجھ سے ایک گز کے فاصلہ پر کامل ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا اور میں گودی (گڑھے) کے اندر چھپا ہوا کپکپاتا رہا۔

پروفیسر سید احتشام حسین

نیاز فتح پوری۔ چند تاثرات

یہ ۲۹-۱۹۲۸ء کی بات ہے جب میں اعظم گڑھ (یو-پی) میں آٹھویں نویں درجہ کا طالبِ علم تھا۔ شعروشاعری سے معمولی دلچسپی تو اس سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی کیونکہ گھر پر اس کا چرچا تھا لیکن اعظم گڑھ کے دورانِ قیام میں کچھ ایسے ساتھی ملے جن کی صحبت میں اس پہ جِلا آئی۔ میرے خاص ساتھیوں میں سید فرید جعفری اور سید سعید جعفری تھے جو اس وقت پاکستان میں ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے والد ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری انھیں دنوں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے تبدیل ہو کر اعظم گڑھ آئے تھے اور ان دونوں بھائیوں کے نام وہاں کی مشہور درس گاہ ولسیلی ہائی اسکول میں لکھے گئے تھے۔ میں وہاں دو تین برس پہلے سے پڑھ رہا تھا۔ ان کے آتے ہی تعلقات بڑھے اور مجھے پڑھنے کے لئے کتابیں ملنے لگیں۔ چونکہ ڈاکٹر جعفری خود ادبی ذوق کے مالک تھے اس لئے ان کے یہاں متعدد رسائل آتے تھے جنہیں دیکھنے کا موقع مجھے بھی مل جاتا تھا۔ میرا دوسرا ادبی مرکز دارالمصنّفین کا کتب خانہ تھا جو میرے گھر سے بہت قریب تھا اور جن عزیزوں کے ساتھ میرا قیام تھا، ان کے ساتھ وہاں اکثر جانے کا موقع ملتا تھا۔ جہاں نہ صرف رسائل دیکھنے میں آتے تھے بلکہ ایک ادبی فضا بھی ملتی تھی جس میں سانس لے کر اپنی ادبی پیاس کے بجھنے اور بڑھنے کا احساس ہوتا تھا۔ "ایک تیسرا ادبی اڈہ" اور تھا جس کا خیال آتے ہی مجھے ڈاکٹر نذیر احمد کی توبۃ النصوح کی یاد آتی ہے۔ یہ خواجگانِ اعظم گڑھ

کا ایک کھاتا پیتا گھرانا تھا جس کے بزرگ شہر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور جس کے نوجوان اپنے اپنے کمروں میں اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج، پچیسی، تاش اور شعر و شاعری میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ ان کے پاس چھوٹی چھوٹی لائبریریاں تھیں، جن میں ناول، داستانیں، دواوین اور رسائل کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اس سے پہلے میں زمانہ، نظام المشائخ اور بعض مذہبی اخبارات ہی سے روشناس تھا۔ اس دوران میں نگار۔ پیمانہ۔ ہمایوں اور بعض دوسرے رسائل سے واقفیت ہوئی میری دلچسپیاں کھیل کود اور سیر و تفریح سے بہت کم تھیں اس لئے زیادہ وقت انھیں رسائل اور کتب کے درمیان گزرنے لگا۔ اسی زمانہ میں نگار اور نیاز صاحب کا جادو دل و دماغ پر چل گیا۔

فرید اور سعید جعفری (خاص کر فرید جو ہم سن تھے) کچھ لکھتے بھی تھے اور ان کی تحریریں بعض بچوں کے رسائل اور اخبارات میں چھپ جاتی تھیں۔ ان کے یہاں شاعروں اور ادیبوں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی جنھیں دیکھنے کا موقع مجھے بھی مل جاتا تھا کیونکہ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے میں بھی اس گھر کے ایک فرد ہی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ڈاکٹر جعفری مرحوم بے حد محبت فرماتے تھے اور ہم لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ادبی بحثوں اور دلچسپیوں میں حصہ لے کر ہمت افزائی فرماتے تھے۔ اسکول میں بعض ایسے اساتذہ (خاص کر مولوی محمد یوسف صاحب جو شبلی کے ہم وطن تھے اور مسٹر خان جو عیسائی ہو گئے تھے اور اردو شعر و ادب سے بڑی دلچسپی لیتے تھے) بھی ملے جن کی نگاہ شفقت نے شعر و ادب سے دلچسپی لینے کے اور مواقع فراہم کئے۔ اس وقت اعظم گڈھ کا شہر تو چھوٹا اور معمولی سا تھا لیکن کچھ علمی روایات وہاں سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ خود اس شہر میں مولانا اقبال سہیل، مرزا احسان احمد بیگ، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سلیمان ندوی کے قیام کی وجہ سے اکثر مشاعرے اور علمی صحبتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی اکثر آتے رہتے تھے۔ اپنی کم آمیزی کے باوجود میں ان محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع نکال لیا کرتا تھا۔ اور

خاموشی سے اندر ہی اندر ایسا محسوس کرتا تھا کہ اگر ان سے دلچسپی نہ لوں تو صرف تعلیم ہی نہیں، زندگی بھی ادھوری رہے گی۔

خیر یہ داستان تو طویل ہے کہ میرے لئے وہ دُنیا کیا تھی لیکن اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہوگیا کہ نیازؔ صاحب کی تحریروں سے دلچسپی کے لئے جو فضا درکار تھی، وہ مجھے بالکل ابتدا ہی میں مل گئی۔ تھوڑے دنوں کے اندر "ایک شاعر کا انجام" "شہاب کی سرگزشت" اور نگارستان (غالباً اس وقت تک یہی کتابیں شائع ہوتی تھیں) کے صفحے کے صفحے زبانی یاد ہوگئے۔ گفتگو میں ان کی دلآویز ترکیبیں بے تکلفی سے استعمال ہونے لگیں اور گرد و پیش ایک ایسی فضا چھاگئی جس میں صرف دو عالموں کا سحر تھا اور تخیّل کی رنگین پرکاری۔ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب اعظم گڑھ چھوٹا ہے تو اپنے ادبی شعور کے متعلق ایک غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہوچکی تھی۔ مطالعہ اچھا خاصا لیکن سطحی تھا، پسند کی دُنیا محدود اور جذبات کے تابع تھی اور اس کا اظہار بھی واضح شکل میں نہیں ہوتا تھا۔ آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس عمر میں نیازؔ صاحب کے افسانوں سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ نگارؔ کے ملاحظات یا باب الاستفسار کیوں متوجہ نہیں کرتے تھے؟ یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے ۱۹۳۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد جب دو تین مہینے وطن میں قیام کا موقع ملا اور پڑھنے کے لئے وہ کتابیں اور رسالے نہ مل سکے جو اعظم گڑھ میں مل جایا کرتے تھے تو افسانہ نویسی کا شوق ہوا، جو کچھ لکھا وہ زندگی کے اُن تجربات اور گہرے مشاہدات کے بغیر جو نیازؔ صاحب کو حاصل تھے، انھیں کے افسانوں کا چربہ تھا۔ اُسی قسم کے رومانوی، عاشقانہ اور جذباتی قصے جو تخیّل سے پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ یہ افسانے دو ایک دوستوں کے سوا نہ کسی نے پڑھے اور نہ کبھی شائع کرنے کے لئے محفوظ رکھے گئے۔ درحقیقت مزاج کی یہ رنگینی اور بے قراری صرف خیالوں تک محدود تھی۔ دل کے اندر جو طوفان اُٹھتے یا اُٹھ سکتے تھے ان کے اظہار کے عملی ذرائع میرے گھر اور خاندان کے ماحول میں

ممکن ہی نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے نیازؔ کے افسانے اور زیادہ عزیز معلوم ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء ہی میں الہ آباد آگیا۔ فرید اور سعید جعفری بھی اتفاق سے یہیں پہنچ گئے اور پچھلی محفلیں ایک دوسری شکل میں پھر جمنے لگیں۔ جعفری بھائیوں کے بہت سے عزیز الہ آباد میں رہتے تھے۔ جن کا مشہور انوار احمدی پریس بھی تھا۔ کتابوں کی لالچ میں میرا بہت سا وقت وہاں گزرنے لگا۔ کتابیں خریدنے کی سکت نہ تھی، لائبریریاں پابندی سی سے کھلتی اور بند ہوتی تھیں۔ اس لئے مانگے تانگے ہی کی کتابوں کا سہارا ہو سکتا تھا۔ فرید اور سعید کے عزیزوں میں ایک صاحب ضیاء الدین بھی تھے، میری ہی طرح خاموش طبیعت کے طالب علم اور پڑھنے کے رسیا، انوار احمدی پریس انھیں لوگوں کا تھا اس لئے وہاں کی اور بعض دوسرے مقامات کی شائع کردہ اردو کی کتابیں نہ صرف پڑھنے کے لئے بلکہ اپنے پاس رکھنے کے لئے آسانی سے ملنے لگیں۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ یہیں پہلے پہل ضیاء الدین نے گتیانجلی کا وہ ترجمہ دیا جس میں نیازؔ صاحب کی ایک تصویر بھی شامل تھی جس کا مخصوص پوز گیتانجلی کے مترجم کے تصور سے تو مناسبت رکھتا تھا لیکن میرے ان خیالوں سے مختلف تھا جو میرے ذہن میں نیازؔ صاحب کے متعلق پیدا ہوا تھا۔

دو سال بعد جب میں یونیورسٹی میں پہنچا تو نیازؔ صاحب کے علمی اور تنقیدی مضامین بھی متوجہ کرنے لگے۔ دوستوں سے اُن کے خیالات اور عقائد کے متعلق بحثیں بھی ہونے لگیں، لیکن ان کی انشاء پردازی کا جادو اب بھی اپنا کام کر رہا۔ یہاں تک کہ اُس زمانے میں جو افسانے لکھے ان میں نہ صرف اُن کے اندازِ بیان کے نقل کرنے کی کوشش کی بلکہ خیالات اور واقعات کی ترتیب میں بھی اُنھیں کی پیروی کی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا ۱۹۳۳ء کی بات ہے میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ گرمی کی تعطیل اعظم گڑھ کے ایک دیہات میں

گذاری جہاں میرا وطن تھا۔ چھٹیوں میں گھومنا پھرنا، شکار اور تفریح میں وقت گزارنا، قرب و جوار کے دیہاتوں میں دُور نکل جانا اور گویا اپنے خیال میں دوستوں کے ساتھ "رومانی" زندگی بسر کرنا ہی مشغلہ تھا۔ نہ دھوپ دھوپ تھی نہ لُو لُو۔ ایسے میں میں نے ایک افسانہ لکھا "ایثار" آج کہہ سکتا ہوں کہ اس افسانہ میں محض ایک سطحی سا واقعہ افسانوی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے بہتر افسانہ نہ لکھا گیا ہے اور نہ نہ لکھا جا سکتا ہے۔ دوستوں کو سُنایا، کسی نے پسند کیا، کسی نے مذاق اُڑایا۔ میں نے کہا جب یہ شائع ہوگا تو دیکھنا لوگ کیسی داد دیتے ہیں، کسی نے کہا اسے چھاپے گا کون؟ میں نے کہا جب سہی اسے نگار میں شائع کراؤں۔ سب دوست ہنس پڑے، کیونکہ نگار کے معنی تھے اُردو کا سب سے اچھا اور معیاری رسالہ، اس میں کسی نو آموز طالبِ علم کے افسانے کے چھپنے کے معنی تھے، نیاز صاحب کی تنقیدی نگاہ میں اس کا کھرا ثابت ہونا۔ میں نے اسے صاف کر کے نیاز صاحب کے پاس بھیج دیا اور سانس روک کر اس کی قسمت کا انتظار کرنے لگا۔ چند دنوں کے بعد نیاز صاحب کا لکھا ہوا خط، اسی طرح جیسے وہ ہمیشہ لکھتے ہیں کارڈ کی لمبائی میں لکھا ہوا چند سطروں والا خط آ گیا۔ لکھا تھا افسانہ پسند آیا، فلاں مہینے میں نگار میں شائع ہوگا۔ افسانہ شائع ہو یا نہ ہو، یہ خط نکتہ چیں، حاسد مگر پیارے اور بڑے ظالم دوستوں کا مُنہ بند کرنے کے لئے کافی تھا۔ میری جیت ہو گئی تھی۔ اور دماغ عرشِ معلّٰی پہ پہنچ گیا تھا۔ افسانہ نیاز صاحب کو پسند آیا اگر پسند نہ آتا تو نگار میں شائع کیوں کرتے۔ وہ مہینہ گزر گیا جس میں اس کے شائع ہونے کی بشارت تھی۔ نگار اپنے وقت پہ نکلا لیکن اس میں اس افسانہ کا پتہ نہ تھا۔ پہلے حیرت ہوئی۔ پھر ندامت، پھر غصہ آیا اور نیاز صاحب سے ایک دلچسپ خط و کتابت شروع ہوئی۔

میں نے غصہ کو دباتے ہوئے جواب میں صرف یہ پوچھا تھا کہ میرا افسانہ جو

حسبِ وعدہ اس مہینے میں نگار میں شائع ہونے والا تھا کیوں رہ گیا؟ بالکل ویسا ہی کارڈ جواب میں آیا تھا کہ میں نے اس وقت جلدی میں لکھ دیا تھا' بعد میں جب غور سے دیکھا تو اس میں بعض فنی خامیاں نظر آئیں۔ آپ میں افسانہ نگاری کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور افسانے لکھیے اور مجھے بھیجیے' بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے لمبے لمبے خط لکھے۔ نیاز صاحب نے مختصر جواب دیئے۔ اور آخر کار غالباً عاجز آکر انہوں نے یہ لکھا کہ افسانہ اگلے شمارے میں شائع کر رہا ہوں۔ یہ خط طویل' مشفقانہ اور ناقدانہ تھا۔ جو جملہ یاد رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ "افسانہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کا نام ہے"۔ یہ میری اس بات کے جواب میں تھا کہ اس افسانہ کے سارے واقعات صحیح ہیں۔ اور اگر کوئی ایسی فنی خامی نہیں ہے جو اسے افسانہ ہی نہ بننے دے تو آپ اُسے شائع کیوں نہیں کر سکتے۔ اور اگلے مہینے میں وہ افسانہ چھپ گیا۔ پھر میرے چند افسانے نگار میں شائع ہوئے۔ غالباً نیاز صاحب ان افسانوں کو پسند کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں میں کسی ضرورت سے لکھنؤ گیا تو شوق کھینچ کر نیاز صاحب کے یہاں بھی لے گیا۔ یہ پہلی ملاقات تھی' ایک بزرگ کی ایک خورد سے اور ایک مشہور ادیب کی ایک طالبِ علم سے۔ نیاز صاحب نے ہمت افزائی کے انداز میں نگار کے سالنامہ (ہندی شاعری نمبر) کے لئے مضامین کی فرمائش کی اور میں نے تعمیل کی۔ مجھے معلوم تھا کہ نیاز صاحب عام طور سے اپنے رسالہ کے لئے مضامین کی فرمائش نہیں کرتے' وہ افسانے' ڈرامے' تنقیدی مضامین' علمی مقالات' لطائف و چٹکلے' نظم اور غزل' تاریخی' سیاسی' سائنٹیفک مضامین سب کچھ خود لکھ سکتے ہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو پورا رسالہ اپنی ہی تخلیقات سے بھر سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی فرمائش کرنے کے معنی رسالہ کے مدیر کی رسمی فرمائش نہیں ہو سکتی۔ اس خیال نے خود اعتمادی میں اضافہ کیا' جس کی

اس وقت بڑی ضرورت تھی ۔ اسی زمانے میں (غالباً ۱۹۳۶ء) ایک اور پر لطف واقعہ پیش آیا۔

محمود فاروقی صاحب جو ان دنوں کہیں پاکستان ہی میں ہیں گھر کی فضا سے کچھ بددل ہوکر اور طالب علمی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر قسمت آزمائی کے لئے الہ آباد آئے۔ اُن کے پاس کچھ روپے تھے جسے وہ کسی تجارت میں لگانا چاہتے تھے ۔ یہاں اُن کی ملاقات طالب الہ آبادی صاحب، وقار عظیم صاحب (دونوں پاکستان میں ہیں) اور راقم الحروف سے ہوگئی ۔ یہ ملاقات اچھی خاصی دوستی اور بے تکلفی میں تبدیل ہوگئی اور اور انہوں نے طے کیا کہ ایک رسالہ نکالیں گے اور کتابوں کی اشاعت کا کاروبار کریں گے۔ رسالہ کا نام "انیس" طے ہوا ۔ سرپرست سر شاہ محمد سلیمان (چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد) اور سر تیج بہادر سپرو قرار پائے، ایڈیٹر طالب صاحب اور محمود فاروقی (جو ان دنوں اپنا نام شفاعت محمود طالبی لکھنے لگے تھے) قرار پائے اور پہلا نمبر بڑے اہتمام سے نکلا۔ ہم سب کی تصویریں تھیں اور مضامین۔ رسالہ صاف ستھرا اور خوبصورت چھپا تھا۔ اور میں نے اس کے لئے خاص طور پر ایک افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "دوسرا نکاح" ۔ یہاں اتنی بات عرض کردوں کہ ٹھیک اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تھی اور میں اس کا سرگرم ممبر بن گیا تھا، افکار و خیالات میں زبردست انقلاب آرہا تھا ۔ مطالعہ کے موضوعات بدل گئے تھے ۔ ادبی اقدار کا تصور بدل گیا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرے سے روشنی میں آگیا ہوں۔ خود نیاز صاحب کی تحریروں پر تنقیدی نگاہ پڑنے لگی تھی اور خالص پرستاری اور استحسان کے جذبہ میں ہوش و حواس کے ساتھ رد و قبول کی آزادی کا جذبہ بھی شامل ہوگیا تھا۔ ایسے میں جو افسانہ لکھا جائے اس میں بعض ایسی باتوں کا ہونا ضروری تھا جو کچھ لوگوں کو غیر رسمی اور "انقلابی" معلوم ہوں ۔ لیکن ہوا یہ کہ اس سے ہماری مومن برادری کے کچھ کم پڑھے لکھے پُرجوش نوجوان اس قدر برانگیختہ ہوئے کہ مجھے مارنے اور قتل کرنے کی دھمکیاں دینے لگے ۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

رسالہ انیس کے دفتر میں آگ لگا دی گئی اور محمود فاروقی صاحب کے ساتھ بہت ناروا برتاؤ کیا گیا، یہاں تک کہ اگلے مہینہ میں انھیں معافی نامہ شائع کرنا پڑا۔ اس افسانہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی لیکن آل انڈیا مومن کانفرنس کی بیداری کا زمانہ تھا اور الہ آباد اس کا مرکز تھا۔ اس لئے جوشِ عمل نے یہ صورت بھی اختیار کرلی۔ رسالہ یہ چوٹ کھاکر تھوڑے دنوں میں بند ہوگیا اور محمود فاروقی نے الہ آباد چھوڑ کر علی گڈھ یونیورسٹی میں نام لکھا لیا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ جب یہ واقعات ہو رہے تھے میں نے ساری خط و کتابت اور افسانہ کی نقل نیاز صاحب کو بھیج دی اور لکھا کہ جب یہ صورت ہو تو افسانے کیا لکھوں۔ موصوف نے جواب میں لکھا کہ تم نے غلطی کی جو ایسا افسانہ وہاں چھپوایا۔ ایسی ساری چیزیں "نگار" کو بھیج دیا کرو۔ میں ایسے معرکے روز ہی جھیلا کرتا ہوں۔ اس جملہ میں نہ صرف بڑی بلاغت ہے بلکہ نیاز صاحب کے افکار و خیالات کے ارتقاء کی پوری داستان پوشیدہ ہے۔ سرسید کی اصلاحی اور ترقی پسندی کی انقلابی تحریکوں کے درمیان جس قسم کی عقلیت پرستی اور روایت شکنی کی نمود ہوئی اس کی سب سے نمایاں مثال نیاز فتح پوری ہیں۔ مذہب، اخلاقیات، معاشرت اور ادب کے وہ پہلو جو سرسید، حالی، آزاد، نذیر احمد، چراغ علی، شبلی اور ان کے معاصرین کے زیرِ فکر آئے تھے۔ یہ انھیں کا ارتقائی تسلسل تھا جو نیاز، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، سجاد انصاری اور بعض دوسرے ادیبوں کے یہاں ظہور پذیر ہوا۔ اصلاحی طور پر اسے رومانی اندازِ نظر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک نئے قسم کے اعتزال اور شاعرانہ جمال پرستی کے وفور کا نتیجہ تھا۔ نیاز صاحب کے غور و فکر کے اصل مراکز مذہب اور ادب تھے، جو یوں تو الگ الگ رہتے ہیں لیکن ان کے طرزِ فکر میں آزادیِ خیال کی منزل پر پہنچ کر یک جائی حاصل کرلیتے ہیں۔ ان کے یہاں یزداں، اور اہرمن پر مذہب کا کوئی عکس نہیں پڑتا تھا جیسا کہ آج کی بعض اسلامی تحریکوں کا تقاضہ ہے۔ ان کے یہاں یزداں اور اہرمن دونوں کے جلال و جمال

سے محبت کرنے کی روحانی اور وجدانی خواہش موجود تھی لیکن وہ دونوں کو اپنے ہی انداز میں دیکھنے پر مُصر تھے۔ جب انہوں نے اپنے کسی دوست کو خط میں یہ لکھا تھا کہ آپ اگر حج کو جا رہے ہیں تو ذرا اسلامی ممالک کی سیر بھی کر لیجئے گا اور اگر آرمینیا بھی جانے کا موقع ملے تو وہاں سے میرے لئے کسی حوروش کی تصویر لیتے آیئے گا لیکن اس کا ضرور خیال رکھئے گا کہ وہ تصویر آبِ زمزم سے دُور ہی رہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے چھلکنے سے خراب ہو جائے" تو یہ محض شوخیٔ تحریر کا تقاضا نہیں تھا اس میں نیازؔ کا ذہن بھی منعکس ہو رہا تھا۔ انہوں نے روایتی مذہب کے بعض پہلوؤں کی جس طرح مخالفت کی اُس کی ایک شکل روایتی تصوف کا بھیس بدل کر نمو نما ہو سکتی تھی اور اس کی موجودگی دُنیا کے اکثر رومانی ادیبوں کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ادب میں تصوف کی آمیزش بھی نیازؔ صاحب نے پسند نہیں کی۔ اس حقیقت کا صحیح ادارک اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم ان کی عقلیت پسندی کا تجزیہ کریں۔ جو شخص بھی نیازؔ صاحب کی علمی تحریروں اور افسانوں کا مطالعہ کرے گا اسے سب سے بڑی اُلجھن کا سامنا اس وقت ہو گا جب وہ ان کے مذہبی اور فلسفیانہ مضامین حکمت کی کارفرمائی دیکھے گا اور افسانوں میں جنوں کی، جب وہ انہیں عقل اور دل دونوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا پائے گا۔ ان کے مضامین مدلل، تحقیقی، خیال انگیز اور معلومات سے پُر ہیں اور افسانے تخیلی، رومانوی، جذباتی اور انشائی حُسن سے معمور سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو یہ باتیں تضاد کی حامل نظر آئیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں بیک وقت ایک پُرشور رومانی شخصیت کی خصوصیت ہو سکتی ہیں اور ان میں رشتہ قائم کرنے والے عناصر روایت شکنی، جدت، انفرادیت اور آزادیٔ خیال کے رُوپ میں پہچانے جا سکتے ہیں۔

یہ باتیں ۱۹۳۶ء میں تو شاید میرے پیشِ نظر نہ رہی ہوں لیکن کچھ دنوں کے بعد نیازؔ صاحب کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا تھا، ایک نئی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے ملک اور نئے سانچوں کی تلاش میں جدوجہد کرتے ہوئے ادب میں ان خصوصیات

کا پیدا ہونا ان تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات میں بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ نیازؔ صاحب یہی تاریخی فرض انجام دے رہے تھے۔ اسی لئے ترقی پسند تحریک کے مورّخ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتے کہ رومانی، جذباتی اور تاثراتی اندازِ نظر رکھنے کے باوجود نیازؔ صاحب نے ادب اور فکر کو وہ بے باکی سکھائی جس کے بغیر نئے لکھنے والوں کے قلم میں وہ شوخی اور قدم میں وہ طاقت مشکل سے آسکتی تھی جس کی اس وقت ضرورت تھی۔

دو سال بعد جب لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوگیا تو نیازؔ صاحب نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور مجھے بھی اس سے بڑی تقویت تھی کہ نیازؔ صاحب میری ادبی زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ حالانکہ اس بات کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ ان کی بزرگی کے احترام اور ان کے ادبی کارناموں کی عزت کرنے کے باوجود اُن کے خیالات سے اختلاف بھی ہوتا رہتا تھا لیکن وہ نہ تو کبھی ذاتی تعلقات کے درمیان میں حائل ہوا اور نہ کبھی اس نے کوئی نامناسب شکل اختیار کی۔ بعض دوست کبھی کبھی یہ کہتے تھے کہ تم نیازؔ صاحب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہو حالانکہ ان کا علم انسائیکلوپیڈیا اور معلومات کی عام کتابوں تک محدود ہے۔ مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوتی تھی! اور میں انہیں جواب دیتا کہ تنقید، انشائیہ، افسانہ اور ناول میں اُن کی خدمات اتنی ہیں جو انھیں زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔ نگارؔ محض ایک رسالہ نہیں ایک ادارہ ہے جس نے ہزارہا ذہنوں کی تشکیل کی ہے اور نیازؔ صاحب کی حیثیت ایک معلّم کی ہے، اگر ان کی مذہبی، تاریخی، علمی معلومات صرف چند لغات یا انسائیکلوپیڈیا تک محدود ہیں تو اردو کے ادیبوں میں کون ہے جو اس سے زیادہ جانتا ہے، بعض لوگوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ کسی سوال کا جواب کہاں اور کس قسم کی کتابوں میں تلاش کیا جائے اور میں انھیں نیازؔ صاحب کا احترام کرنے پر مجبور کرتا۔

لکھنؤ کے بائیس تئیس سال کے قیام میں نیازؔ صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے، بہت سی خوبیوں اور خامیوں پر نظر کی گئی، اس کا ذکر کسی دوسری صحبت میں ہوگا۔

مالک رام

نیاز اور نیاز مند

چالیس برس کا زمانہ تھوڑا نہیں ہوتا۔ کہنے کو دو لفظ ہیں، لیکن جب پیچھے پھر کر ۱۹۲۴ء کو یاد کرتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ کوئی اور دُنیا تھی اور اب یہ ۱۹۶۴ء کی کوئی دوسری دنیا ہے۔

یہی سولہ سترہ برس کا میرا سن تھا، جب میں نے ۱۹۲۴ء کے اوائل میں وزیر آباد سے انگریزی کے دسویں درجے (میٹریکولیشن) کی سند لے کر گورنمنٹ کالج گجرات میں داخلہ لے لیا۔ میں یہاں بوجوہ کالج ہوسٹل میں نہ رہ سکا، اس لئے رہنے کو شہر میں ایک کمرہ کرائے پر لینا پڑا۔ میرے مسکن سے تھوڑی دُور، کالج کے راستے میں، ایک صاحب محمد یوسف کی کپڑے کی دوکان تھی۔ اسم بامُسمّیٰ، گورے چٹے جوان، ۲۸۔۳۰ برس کی عمر، تعلیم تو واجبی تھی، لیکن آدمی بہت ذہین تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ یوسف تخلص تھا، اور چونکہ سیماب اکبر آبادی سے تلمذ تھا، اس لئے اپنے آپ کو یوسف سیمابی لکھتے تھے۔

میرے ملنے والوں میں ایک صاحب تھے، عنایت اللہ اسد، میری ہی عمر کے، شاید دو ایک برس کا تفاوت ہو۔ ان کے ذریعے سے میرا یوسف صاحب سے تعارف ہوگیا۔

یوسف صاحب بڑے یار باش آدمی تھے۔ روزانہ عصر کے وقت ان کی دوکان پر گویا جلسہ ہوتا۔ ان میں سے بیشتر شاعر تھے، بقیہ کو محض سننے کا شوق تھا۔ بالعموم یہ ہنگامہ چراغ جلنے کے بعد تک رہتا۔ اس دوران میں یوسف صاحب بالعموم حاضرین کی چائے پانی سے بھی کچھ خاطر مدارات کرتے۔ آخر جب دوکان بڑھانے کا وقت ہوتا۔ تو دوست احباب اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے اور یوسف صاحب دوکان بند کر کے اپنے گھر کو روانہ ہو جاتے۔ یہ ان کا گرمی سردی بارہ مہینے کا معمول تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قماش کے دنیا جہان کے بے فکرے جمع ہوں گے، وہاں کوئی گاہک کیوں آنے لگا۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی کسی عقل کے اندھے کو بھی توقع ہو سکتی تھی۔ یوسف صاحب نے دو ہی برس میں بزرگوں کی جمع جتھا یار دوستوں پر اُڑا دی اور دوکان میں تالا پڑ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو یوں خیال ہوتا ہے کہ شاید دوکان کا تو محض بہانہ تھا، یوسف صاحب نے یہ دوستوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے لئے ایک اڈّے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ورنہ تجارت کا انہیں نہ کوئی تجربہ تھا۔ نہ سلیقہ ؎

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے!

خیر، آمدم برسرِ مطلب۔ یوسف صاحب بہت سے اخبار رسالے بھی منگواتے تھے۔ معارف، زمانہ، پیمانہ، نگار، ہفتہ وار ریاست، اور اسی سال نیرنگ خیال چھپنا شروع ہوا، تو یہ بھی۔ وہ بھی ان کی رسالوں کے خریدار تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض لوگ تو صرف ان پرچوں ہی کے پڑھنے کے لئے ان کے ہاں آتے تھے۔ جیسے یہ دوکان نہیں، کوئی دارالمطالعہ تھا۔ ایک دن میں نے وہاں نگار کا کوئی شمارہ دیکھا، تو اسے پڑھنے کو اُٹھا لایا۔

میں نے جب نگار کا یہ شمارہ دیکھا، تو پہلی نظر میں اس کا گرویدہ ہوگیا۔ مضمون ایک سے ایک بڑھ کر اعلیٰ معیار کا، بڑھیا دبیز کاغذ، کتابت طباعت اچھی۔ غرض

عروسِ جمیل و لباسِ حریر

جی نے کہا، یہ تو پڑھنے بلکہ رکھنے کی چیز ہے۔ میری طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ طفیلی بن کر ہر مہینے پرچہ یوسف صاحب سے مستعار لوں۔ اگلے دن میں نے پہلا کام جو کیا وہ یہ کیا کہ پانچ روپے چندہ بھیج کر اپنا نام خریداروں میں لکھوالیا اور پچھلے دو برس کے پرچے بھی منگوا لیئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب نگار بھوپال سے شائع ہوتا تھا۔ اور اس پر مدیر مسئول کا نام "رئیس التحریر نیاز فتح پوری" چھپتا تھا۔

یہ تھا میرا تعارف نیاز صاحب سے۔

میری ابتدائی تعلیم جس نہج پر اور جس ماحول میں ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اُردو، فارسی اور اسلامیات سے بچپن ہی سے شغف پیدا ہوگیا تھا۔ اگر خودستائی کا مجرم نہ گردانا جاؤں، تو کہہ سکتا ہوں کہ فارسی نظم و نثر کا اچھا خاصہ حصہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں میری نظر سے گزر چکا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دور میں نیاز صاحب کی تحریریں کتنی مشکل اور فارسی ترکیبوں سے بوجھل ہوتی تھیں۔ لیکن مجھے ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ امر واقع ہے کہ ان کے پڑھنے سے فرحت محسوس ہوتی تھی۔

ہائی اسکول میں میرے ایک ہم سبق دوست ملک احمد حسن ہستاسی مرحوم تھے۔ جو بعد کو بہت دن تک ہفتہ وار دورِ جدید (لاہور) کے ایڈیٹر بھی رہے، خدا ان کی مغفرت کرے، وہ بھی میری طرح اردو فارسی اور خاص طور پر شعر کے رسیا تھے۔ ہم دونوں کا دانت کاٹی روٹی

والا معاملہ تھا۔ وہ احمدی تھے۔ ان کے ذریعے سے مجھے اسلام سے متعلق بہت وسیع مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ جانے، وہ میرے لئے کہاں کہاں سے کتابیں بٹور کر لاتے تھے۔ اور میں بڑی سے بڑی کتاب دو چار دن میں ختم کر کے واپس کر دیتا تھا۔ لازمی بات تھی کہ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے تک میری مذہبی واقفیت عموماً اور اسلامی واقفیت خصوصاً میری اپنی عمر کے طلبہ سے کہیں زیادہ تھی۔ نگار کے ہر پرچے میں نیاز صاحب کا اسلام اور قرآن سے متعلق کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہوتا تھا۔ ان مضامین کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میرے دل میں براہِ راست قرآن پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت تک اسلام سے متعلق میری تمام معلومات اُردو کتابوں تک محدود تھی۔ عربی میں نے پڑھی نہیں تھی۔ اور نہ اس کے حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی میسّر آیا تھا۔ نیاز صاحب جس طرح قرآن کی تفسیر کرتے تھے، اس کی جدّت اور عقلیت نے مجھے بہت متاثر کیا، چنانچہ ایک دن میں بازار سے مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمے والا قرآن لے آیا۔ میں نے فرصت کے اوقات میں کوئی دس پندرہ دن میں یہ ترجمہ پڑھ ڈالا۔ اس کی زبان مجھے بہت پسند آئی اور میں نے اس کے بعض مقامات بار بار مطالعہ کئے۔ اس بات کو کم و بیش ۴۰ برس گزر چکے ہیں، لیکن مجھے آج تک اس ترجمے کے کچھ حصّے زبانی یاد ہیں۔

میں نے دیکھا کہ نیاز صاحب کا ترجمہ کئی مرتبہ مولوی نذیر احمد کے ترجمے سے مختلف ہوتا ہے۔ رہا ان کا تعبیر و تفسیر کا انداز، تو یہ مولوی نذیر احمد تو رہے الگ، میرے اپنے تمام پہلے مطالعات و تصورات کے بھی خلاف تھا۔ اس کے بہت دن بعد جب میں نے سرسید کی تفسیر کے مطبوعہ اجزاء دیکھے، تو میں نے محسوس کیا کہ نیاز صاحب اس سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ تقریباً یکساں ہے۔

بہر حال ان کے یہ اسلامی مضامین مجھے بہت پسند آئے اور میں نے طے کر لیا کہ مجھے عربی پڑھنا چاہیے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے، تو کم از کم قرآن کریم کو معنوں کے ساتھ کسی استاد سے سبقاً سبقاً ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔ میری یہ آخری آرزو دو برس بعد لاہور پہنچنے پر پوری ہوئی۔ (۱۹۲۷ - ۱۹۲۸)، اور پھر خدا نے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ مجھے ایک زمانے تک مصر میں قیام کرنا پڑا۔ یہاں میں نے عربی میں بھی کچھ شُد بُد پیدا کر لی۔

نگار کا باب الاستفسار اس کی خصوصیات بلکہ اوّلیات میں سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس پہلو سے کسی کو بھی اس کے تتبع کی شاید ہی جرأت ہو۔ یہ دوسری چیز تھی جس نے مجھے خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ہر مہینے ایک یا دو سوالوں کا جواب لکھتے تھے۔ لیکن اس میں تنوع کا یہ عالم تھا کہ علم و ادب کا شاید ہی کوئی گوشہ رہ گیا ہو۔ شعر و ادب، تاریخ، تفسیر، حدیث، تصوّف، فنونِ لطیفہ۔ غرض دنیا بھر کے موضوع ان کی زد سے کوئی نہیں بچا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں ان سے بہت حد تک مرعوب ہو گیا۔ بلکہ یہ احساس آج تک رفع نہیں ہوا۔

اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ آہستہ آہستہ نگار میرا محبوب ترین رسالہ بن گیا۔ جس مہینے اس کے پہنچنے میں دیر ہو جاتی یا پرچہ کہیں ڈاک میں گم ہو جاتا، تو میں بے چین ہو جاتا۔ اور جب تک پرچہ دیکھنے کو نہ ملتا، یوں معلوم ہوتا، جیسے زندگی کے معمول میں کوئی ناقابلِ برداشت خلا پیدا ہو گیا ہے۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی پسند کی چیز کی نوک پلک سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ یہی کچھ نگار کے سلسلے میں میرے ساتھ ہوا۔ جن لوگوں نے اس زمانے کا نگار دیکھا ہے، انہیں یاد ہو گا کہ اس کے سرورق پر خطِ نستعلیق میں نام (نگار) کے علاوہ بہت کچھ اور عبارت

بھی ہوئی تھی یعنی "اُردو کا علمی و ادبی مجلّہ"، مقامِ اشاعت، قیمت، مدیر کا نام وغیرہ (یہ محض حافظے کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہو جزئیات میں کچھ اختلاف ہو) مجھے سرورق پر اتنی عبارت اور تفصیل سخت ناپسند تھی ؎

مشاطہ را بگو کہ بہ اسبابِ حُسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

چنانچہ میں نے ایک دن دل کڑا کر کے نیازؔ صاحب کو خط لکھا کہ حضرت! یہ تمام عبارت اُڑا دیجئے۔ سرورق پر صرف لفظِ نگارؔ رہے اور بس۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جب انہوں نے میری تجویز پر صاد کیا اور اس کے بعد اس کا سرورق اس طرح ہو گیا۔ جیسا اب ہے (یعنی ہندوستان میں)۔

خود مجھے لکھنے کی طرف توجہ بھی نگارؔ کے مطالعے اور نیازؔ صاحب کی تحریروں سے ہوئی۔ میں نے شروع میں ایک آدھ چیز انگریزی سے ترجمہ کی اور خود بھی لکھی۔ لیکن مجھے انہیں نگارؔ میں اشاعت کے لئے بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کا ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے دو قسطوں میں نگارؔ میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے کہیں کہیں غالب پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کئی اصحاب نے اس مضمون کے بعض حصّوں پر سخت اعتراض کیا اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر مضمون میں نے بھی "غالبؔ اور ذوقؔ" کے عنوان سے لکھا اور بڑی حیص بیص کے بعد آخر نیازؔ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ چند مہینے بعد یہ ۱۹۲۶ء کے کسی شمارے میں چھپا تھا۔ یہ میرا پہلا مضمون ہے جو نگارؔ میں چھپا۔ اور غالبؔ سے متعلق بھی یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً میرے کچھ مضمون نگارؔ میں شائع ہوئے۔ جن میں سے بعض میں نے خود نیازؔ صاحب ہی کی فرمائش پر قلم بند کئے۔ لیکن اس میں بھی

کوئی شبہ نہیں کہ اپنی تحریروں کو نگار میں اشاعت کے لئے بھیجنے پر میں اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہیں کر سکا۔

۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ (INTERMEDIATE) میں کامیابی کے بعد میں مزید تعلیم کے لئے لاہور چلا آیا۔ یہاں میں نے، جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں، قرآن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ سبق کے وقت میری اپنے اُستاد سے بڑی بحث ہوا کرتی تھی۔ نگار کے طویل مطالعے کے باعث میرا اسلامی مسائل سے متعلق سوچنے کا انداز ہی کچھ اور طرح کا ہو گیا تھا۔ سبق میں جہاں کہیں کوئی ایسا موضوع آجاتا جس سے متعلق میں نگار میں کوئی مضمون پڑھ چکا تھا، تو فوراً سوال کر بیٹھتا۔ بخاری صاحب مختصراً جواب دے دیتے، دل میں یہ خیال کرتے ہوں گے کہ اس کی تشفی کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں اس پر جرح شروع کر دیتا۔ وہ پہلے تو طرح دیتے کہ بات نہ بڑھنے پائے۔ اس لئے کچھ اِدھر اُدھر کی بات کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، لیکن جب دیکھتے کہ میں بال کی کھال نکالے بغیر ٹلنے کا نہیں، تو کتاب بند کر دیتے اور ہنس کر فرماتے :

اچھا صاحب! یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے پڑھنے کو آتے ہیں یا مجھے پڑھانے کو۔ لیکن سو آفریں ہے ان کے صبر و تحمل کو کہ وہ میرے بحثنے بلکہ کٹ حجتی تک کرنے پر بھی کبھی ناراض نہیں ہوئے، خندہ پیشانی سے میری سُنتے اور مُسکرا مُسکرا کر جواب دینے کی کوشش کرتے۔ افسوس کہ میں پندرہ سولہ پاروں سے زیادہ ان سے پڑھ نہ سکا اور باقی مجھے اپنے طور پر مترجم نسخے کی مدد سے پورا کرنا پڑا۔ لیکن میں ان کا احسان بھول نہیں سکتا کہ کم فرصتی کے باوجود انہوں نے سال ڈیڑھ سال میرے ساتھ گزارا کیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

اب میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ یہ ۳۲ ۱۹ء یا شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔

میں نے مطالعے کے اثنا میں محسوس کیا کہ قرآن میں عورت کی زندگی کے متعلق بڑی تفصیلی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن یہ کسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ مختلف سورتوں میں منتشر حالت میں ملتی ہے۔ جی میں آئی کہ کیوں نہ اسے یک جا کر کے اس پر ایک مضمون لکھا جائے۔ میں نے نیاز صاحب کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دی اور یہ بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو عنوانات مقرر کر دیجئے۔ جن کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کروں۔ انہوں نے جواب دیا کہ فہرست عنوانات خود تیار کرو۔ اس سے چند مہینے پہلے رسالہ جامعہ (دلی) میں ایک مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اسے دیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ غرض میں نے عنوان مقرر کر کے ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔ انہوں نے ان سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ جب مضمون مکمل ہو جائے، تو اسے نگار میں اشاعت کے لئے بھیج دو۔

میں نے شروع سے یہ طے کر لیا تھا کہ اساسی طور پر تمام مسائل کا استخراج قرآن سے کروں گا۔ اور حدیث محض نص کی تشریح اور توضیح کیلئے پیش کروں گا اور یہ بھی تا بہ حدِ امکان بخاری اور مسلم سے یا زیادہ سے زیادہ صحاح ستہ سے۔ اتنی پابندیوں کے باوجود لکھنے بیٹھا، تو بات سے بات پیدا ہونے لگی، اور وہ جو خیال تھا کہ پورا مقالہ رسالہ میں دو یا تین قسطوں میں چھپ جائے گا، کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آیا۔ جب مضمون خلاف توقع لمبا ہونے لگا تو میں نے پھر لکھا کہ یہ تو میرے اندازے سے بہت طویل ہو گیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کی فکر نہ کرو۔ جو جی میں آئے اسے قلم بند کر ڈالو، ترمیم بعد کو کر لینا۔ قصہ کوتاہ، میں نے کوئی سو سوا سو صفحے میں اسے ختم کیا اور مسودہ ان کی خدمت میں بھیج دیا۔

نیاز صاحب نے پورا مضمون دیکھا اور اسے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ بعض مسائل پر مزید غور و خوض درکار ہے مثلاً مجھے یاد ہے کہ انہوں نے متعہ سے متعلق

لکھا تھا کہ شیعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کرو۔ مسودہ واپس آگیا۔ تو میں نے ؟ اجازت لے کر، پہلے اسے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (مدیر معارف) کی خدمت میں پیش کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر حسن اتفاق سے یہ رسالہ شائع کر سکوں تو کم از کم اس میں کوئی ایسی غلطی نہ رہ جائے، جو کسی بنیادی اسلامی تعلیم کے خلاف ہو۔ مرحوم نے میری توقع سے کہیں بڑھ کر مضمون کی تعریف کی، بلکہ یہاں تک لکھا کہ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے، تو میں اسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ کسی مسلمان عالم نے لکھا ہے۔ نفسِ مضمون سے متعلق انہوں نے فرمایا کہ بعض مسائل سے متعلق مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ اس پر میں نے درخواست کی کہ یا تو مسودے کے حاشیے میں اشارہ کر دیجئے یا خط میں تحریر فرمائیے تاکہ میں استفادہ کر سکوں۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں، اگر ملاقات ہو گی، تو تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ مجھے بھی کوئی عجلت نہیں تھی۔ اور اس کے علاوہ زندگی کے اور جھمیلے بھی تھے۔

اور بھی درد ہیں دُنیا میں محبت کے سوا

میں نے لکھ دیا کہ بہت اچھا، مسودہ اپنے پاس ہی رہنے دیجئے۔ جب ملیں گے تو بات چیت کرنے کے بعد اسے واپس لے لوں گا۔ اتفاق دیکھئے کہ اس کے بعد ان سے ملاقات ہوئی بھی، لیکن ایسی صورت میں کہ تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملا۔ پھر میں ۱۹۳۹ء میں ہندوستان سے باہر چلا گیا، تو انہوں نے لکھا کہ آپ کا مسودہ میرے پاس امانت پڑا ہے۔ اسے جہاں کہیں، وہاں بھیج دوں۔ میں نے جواب دیا کہ ملک احمد حسین کے پاس لاہور بھیج دیجئے۔ احمد حسین نے اسے میرے پاس مصر روانہ کر دیا۔

ان چھ سات برس میں بھی میرا مطالعہ تو بہر طور جاری رہا ہی تھا۔ اب میں نے خود ہی مسودے پر نظر ثانی کی۔ جہاں کوئی کسر نظر آئی، اسے ٹھیک کیا۔

اور کے بعض حصے دوبارہ لکھے۔

میں نے مضمون کے چھ باب تجویز کئے تھے :۔ (۱) بیٹی، (۲) بیوی، (۳) ماں، (۴) مطلقہ یا بیوہ، (۵) وارثہ، (۶) عورت مذاہبِ عالم میں۔ پہلے پانچ ابواب میں صرف اسلامی تعلیم اور آخری میں اس کا دوسرے مذاہب سے تقابل اور موازنہ۔ جب مضمون مکمل ہوگیا تو میں نے بہ وجوہ خیال کیا کہ آخری باب کو اس کتاب کے ساتھ شائع نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ موضوع اپنی جگہ مکمل ہے۔ اور اسے الگ لکھنا چاہیئے۔ میں نے نیازؔ صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ اسے نگارؔ میں اشاعت کے لئے بھیج دو۔ چنانچہ یہ مضمون 'عورت اور اسلام' کے عنوان سے ۱۹۴۵ء میں نگار کی تین اشاعتوں میں چھپا۔ پہلے پانچ باب بالآخر ۱۹۵۱ء میں "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے کتابی صورت میں نیازؔ صاحب نے اپنے تعارف کے ساتھ اپنی نگرانی میں چھاپے۔ میں مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کو حالات سے بہت آگے نکل گیا۔

نیازؔ صاحب سے خط وکتابت کا سلسلہ ۱۹۴۲ء میں ہی قائم ہوگیا تھا۔ وہ خطوں کا جواب حد درجہ باقاعدگی سے بلا تاخیر دیتے ہیں۔ ان کے خطوں پر رائے زنی کرنا اس مضمون کے حدود سے باہر ہے اور ان سے متعلق کسی حد تک اپنی تفصیلی رائے میں ایک مضمون میں ظاہر بھی کر چکا ہوں۔ جو نقوش (لاہور) میں چھپا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی انشار کی تمام رعنائیاں ان خطوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کے جو خطوط "مکتوباتِ نیازؔ" کے نام سے تین جلدوں میں چھپے تھے، ان سے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی شخص کے نام نہیں لکھے گئے ہیں تہیں جانتا کہ یہ شبہ کس حد تک درست ہے۔ البتہ اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بعض ایسے خطوط ہیں جو خود میرے نام لکھے گئے تھے۔ ان کی بانکی البیلی نثر، شعروں کا برجستہ استعمال اور ہلکا سا مزاح۔

لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

شعروں کے برمحل استعمال میں ان کے پیش رو مولانا ابوالکلام آزاد اور میر ناصر علی (صلائے عام والے) تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

ابھی تک ان سے ذاتی طور پر ملنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ پہلی ملاقات ۱۹۳۷ء کے جاڑوں میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں دلّی میں تھا۔ انہوں نے لکھا کہ میں فلاں دن آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرنے کو آرہا ہوں۔ یہ ریڈیو کے ابتدائی دور کی بات ہے، جب اس کا دفتر پرانی دلّی میں علی پور روڈ پر تھا۔ جس شام ان کی تقریر[1] تھی میں ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ اسٹیشن ڈائرکٹر جناب سیّد ذوالفقار علی بخاری سے میری کچھ یاد اللہ تھی، انہی نے میرا تعارف کرایا۔ وہاں تو زیادہ بات چیت کا موقع نہ ملا، لہٰذا میں نے اگلے دن ملنے کے لئے وقت طے کیا اور واپس چلا آیا۔

یہ اپنے ایک دوست حبیب احمد صاحب کے پاس قرول باغ میں اُترے ہوئے تھے۔ اتفاق سے میں بھی ان دنوں وہیں قرول باغ ہی میں رہتا تھا اور جناب حبیب احمد کا مکان بھی میرے مسکن سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا چنانچہ میں اگلے دن وقتِ مقررہ پر حاضرِ خدمت ہوا۔ دیر تک گپ رہی، کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی؛ نہ اس کا موقع تھا۔ نہ ضرورت۔ ہم ایک دوسرے کو بارہ برس سے جانتے تھے اور جب پہلی مرتبہ ہی ملے ہیں، تو اسی طرح جیسے پرانے ملنے والے باہم ملتے ہیں۔ اجنبیت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

اس موقعہ کا ایک لطیفہ سُنیئے:

دوسرے دن شام کو نیاز صاحب کہیں باہر جارہے تھے، میں بھی موجود تھا۔ کہہ چکا ہوں کہ یہ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اچھی طرح گرم کپڑے پہن لئے۔ جب خوب کس کساکر کمرے سے باہر نکلے، تو حبیب احمد صاحب نے کہا کہ اتنے کپڑوں کی کیا ضرورت تھی۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ قبا:

[1] اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو ان کی تقریر "احرام مصر" کے موضوع پر تھی۔

سردی کا موسم ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ یا تو انسان شراب سے اپنے آپ کو گرم رکھے یا اُونی کپڑوں سے۔ شراب پینے کی توفیق نہیں۔ اس لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کپڑوں کے متعلق کوتاہی نہ ہو۔ میرے منہ سے نکل گیا، شراب نہ پینے کی توجیہہ جو آپ نے کی ہے، حرام کرنے والے نے اس کا خیال نہیں کیا۔ تو کیا کہتے ہیں! صاحب! جس زمانے میں یہ حرام ہوئی ہے۔ اس وقت جس چیز کو شراب کہتے تھے، وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے حرام کر دیا جاتا۔ بھلا وہ بھی کوئی شراب تھی، کھجوریں اور انگور، گندم اور جو۔ انھیں پانی میں ڈال دیتے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب خمیر تیار ہو جاتا، تو ہاتھ سے اس کا ملغوبا بنا کر اسے نچوڑ یا چھان لیتے۔ یہ شراب تھوڑی ہے۔ اسے آپ زیادہ سے زیادہ ٹھنڈا جوشاندہ کہہ سکتے ہیں۔ شراب تو اس چیز کا نام ہے جو آپ ملتی ہے۔ ذرا اسے دیکھئے تو کہ کتنی صاف شفاف اور دل کش ہے کہ خواہ مخواہ پینے کو جی چاہے۔ اسے بھلا کون حرام قرار دے سکتا ہے؟

میں ۱۹۳۹ء میں مصر چلا گیا اور کوئی سات برس کے بعد تین چار مہینے کے لئے وطن واپس آیا، تو ان سے ملنے کو لکھنؤ گیا۔ انھی کے ہاں اُترا اور دو دن ٹھہر کر دلّی چلا آیا اور پھر اپریل ۱۹۴۷ء میں باہر چلا گیا۔ اگلے پانچ برس میں میرا زیادہ قیام مصر اور عراق میں رہا۔ اب کے واپسی ۱۹۵۲ء میں ہوئی لیکن بدقسمتی سے حالات اچانک کچھ ایسے پیش آ گئے کہ مجھے ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی پھر باہر جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ دل نہ مانا کہ ملے بغیر چلا جاؤں۔ چنانچہ میں نے تار دیا کہ اگلے دن پہنچ رہا ہوں۔ جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں میرا تار ملا ہی نہیں تھا۔ ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے بہت قلق تھا لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ میں ان کی حیدر آباد سے مراجعت تک انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی اور میں دلّی چلا آیا۔ چند دن

بعد ہوائی جہاز سے مصر چلا گیا۔

میں اواخر نومبر ۱۹۵۴ء میں دلّی آیا، دسمبر میں لکھنؤ گیا۔ میری غیر حاضری میں ان کی صاحبزادی شوکت کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی تعزیت بھی کرنا تھی۔ میں یہاں دو تین دن ٹھہرا۔ انہوں نے جس محبّت و شفقت کا اظہار کیا۔ اب اس کا ذکر بھی ان کے خلوص کی توہین ہو گی۔ کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں وہ مجھے ساتھ لئے پھرے۔ ان سے بڑی بڑی باتیں ہوئیں۔ ان کی زندگی کے متعدد واقعات سُنے۔ ان کا دفتر دیکھا۔ جہاں ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ رکھی تھی۔ ان کے کام کرنے کا ڈھنگ دیکھا۔ ان کی پابندیٔ اوقات سے متعلق کچھ کہنا تو تحصیلِ حاصل ہے۔ اسی ایک بات سے اندازہ لگا لیجئے کہ نگار فروری ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس ۴۲۔ برس میں کبھی ایک مرتبہ بھی تو ناغہ نہیں ہوا۔ پہلے تو یہی دیکھئے کہ مذہبی اور نیم مذہبی پرچوں کی بات نہیں، خالص علمی، ادبی پرچوں میں اتنی لمبی عمر کس کی ہوئی۔ زمانہ (کانپور) غالباً ۴۲ برس زندہ رہا، لیکن منشی دیا نرائن نگم مرحوم کہا کرتے تھے کہ زمانہ کا خرچ روزنامہ آزاد سے نکلتا ہے، ورنہ خود زمانہ خسارے میں چل رہا ہے۔ یہ نہیں کہ نگار پر مشکل وقت نہیں آئے۔ جب ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء میں بعض اسلامی حلقوں سے اس کے خلاف تحریک چلی اور نیاز صاحب پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا ہے، تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب نگار بند ہو جائے گا یہ بھی کچھ "کم سخت واقعہ" نہ ہوتا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر خود ان کی اپنی جان تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ان صبر شکن حالات میں بھی ان کی پامردی اور مستقل مزاجی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور پرچہ برابر نکلتا رہا۔ یہاں مجھے اس سے بحث نہیں کہ اس تنازعے میں کون راستی پر تھا اور کون غلطی پر۔ اگرچہ میں پورے واقعات سے بہت حد تک واقف ہوں اور چاہوں تو ان پر بھلا بُرا محاکمہ بھی کر سکتا ہوں، لیکن ایک تو نقار خانے میں طوطی

کی کون سُنتا ہے اور دوسرے اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے حاصل بھی کیا ہوگا - یہاں مقصود صرف ان کے کردار کا یہ پہلو پیش کرنا ہے کہ نیازؔ صاحب کے مزاج میں، گفتار و کردار میں، بات کی تڑپ ہے، استواری ہے، یا وہ چیز جسے بزرگ وضعداری کہا کرتے تھے - نیازؔ صاحب قوم کے پٹھان ہیں - پٹھانوں میں ضد کا عنصر بہت ہے؟ اس لئے آپ اسے ضد بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ اندھی دھند یا ناعاقبت اندیشانہ ضد نہیں - ان کی دنیوی سوجھ بوجھ بلا کی ہے؟ وہ کسی مسئلے کے حُسن و قبح اور مالۂ وما علیہ پر پوری طرح غور و فکر کئے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے -

میں پچھلے پانچ برس سے پھر وطن سے باہر زندگی بسر کر رہا ہوں:

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ان سے آخری ملاقات روانگی سے چند ماہ پیشتر دلّی میں ہوئی تھی - خیال تھا کہ جب واپس جاؤں گا، تو حاضرِ خدمت ہوں گا - لیکن پارسال انہوں نے نقلِ مکان کر لیا - غالبؔ نے کسی ایسے موقع ہی کے لئے کہا تھا:-

بُت خانہ میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہ
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا، کیونکہ آخر دلّی اور کراچی میں اتنا بُعد تو نہیں جتنا بُت خانے اور حرم میں ہے - لیکن اتنا کہہ دینے میں بھی کیا حرج ہے:

پیامِ من کہ رساند بیارِ مہر گسل — کہ بر شکستی و مارا ہنوز پیوند است
قسم بجانِ تو گفتن طریقِ عزت نیست — بخاکِ پائے تو و آں ہم عظیم سوگند است
کہ با شکستنِ پیمان و برگرفتنِ دل — ہنوز دیدہ بدیدارت آرزومند است

یہ مختصر مضمون لکھنے سے میری غرض یہ نہیں تھی، نہ ہے، کہ میں ان علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لوں اور بتاؤں کہ انہوں نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں، زبان کی، شعر و ادب کی، انشاء کی تنقید (یا ان کی اصطلاح میں انتقاد)

کی، مذہب اور تاریخ کی، صحافت کی، کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔ کس طرح ہمارے مشہور لکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد نے نہ صرف ان کی ذات سے بلکہ ان کے اسلوبِ تحریر سے بھی متاثر ہوئی اور انہوں نے نگار ہی سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کی ہمہ جہتی شخصیت پر کوئی تبصرہ کر کے تاریخِ ادبِ اردو میں ان کا مقام متعین کر دوں۔ یہ کام مجھ سے زیادہ قابل اور اہل لوگ غالباً اسی خاص نمبر میں کریں گے۔ اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ میرا مقصود یہ چند سطریں لکھنے سے صرف اتنا تھا کہ میں اپنی طرف سے ان کی خدمت میں ہدیۂ نیاز پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا، بہت کچھ سیکھا ہے اور میری معنوی نشو و نما میں نیازؔ اور نگارؔ کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا، کہ اس کا برملا اظہار کر دوں۔

از عیش ما مپرس نظیریؔ، خبر کہ ما
چوں خضر لب ز چشمۂ نایاب شستہ ایم

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

بیادِ آں نگارے

میں اور میری عمر کے جتنے اشخاص آج کل موجود ہیں اُس وقت صرف ابتدائی درجوں کے طالب علم تھے۔ جب نیاز صاحب اردو صحافت کی فضا پر چھائے ہوئے تھے، ہم سب ان کے ادبِ لطیف اور جوش و تازگی سے بھری نثر سے بے حد متاثر اور مرعوب تھے۔ ہر ماہ ان کے قلم کی جنبشوں کو نگار میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے کے منتظر رہتے تھے۔ نگار کا سن ۴۰ء سے ۴۵ عیسوی تک کا زمانہ شاید اس کی مقبولیت کا بہترین زمانہ تھا، شہاب کی سرگزشت ہو یا کیوپڈ و سائیکی کی رنگین و سرمست خیال آرائیاں سب انتہائی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ کیونکہ یہ طرزِ نگارش اُردو ادب میں ایک نیا اسلوب تھا نہایت جان دار نہایت جوان اور باوجود سرمستی کے باوقار بھی تھا اور پُر تمکین بھی۔

میں ۱۹۳۰ء میں نیاز صاحب سے سب سے پہلے متعارف ہوا۔ وہ اس وقت نظیر آباد لکھنؤ میں ایک بڑے مکان میں رہتے تھے ان کا پریس بھی وہیں تھا میں اس زمانے میں ایف اے میں پڑھتا تھا اور مجھے آج تک یاد ہے کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی جب اسی زمانے میں میرا سب سے پہلا تنقیدی مضمون نگار میں اشاعت کے قابل سمجھا گیا تھا۔ زمانہ بدلتا گیا۔ میں اپنی تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں ۳۷ء سے ۴۵ء تک علی گڑھ اور دہلی میں رہا۔ جب ۴۵ء میں لکھنؤ واپس آیا تو محلہ نیا گاؤں میں قیام پذیر ہوا۔ نیاز صاحب اسی محلہ میں کئی سال پہلے سے سکونت اختیار کر چکے تھے اور ایک مکان بھی خرید لیا تھا اب وہ میرے ہم محلہ تھے۔ مکان قریب ہی تھا اس لئے نیاز صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کے اکثر مواقع ملتے رہے اور مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ نیاز صاحب مجھ سے بڑی محبت

اور شفقت فرماتے تھے۔ جب ملاقات ہوتی تو مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی بہت سی غیر ادبی بھی مثلاً صحت، غذا، ہومیوپیتھی وغیرہ۔ نیاز صاحب اپنی صحت کے معاملے میں بڑے چوکس رہنے والے آدمیوں میں سے تھے اور میں بیمار رہنے والے لوگوں میں سے ہوں اس لئے اس موضوع پر اکثر تبادلہ خیال رہتا۔ وہ وہ ایک تو بیمار بہت کم ہوتے لیکن جب کبھی کوئی علالت ہوتی تو بڑے سے بڑے ڈاکٹر، ہومیوپیتھ یا طبیب کا معالجہ کرتے تھے۔ ہومیوپیتھک علاج سے کافی شغف تھا اور اس علم کی تمام مستند کتابیں ان کے پاس موجود تھیں جن سے میں بھی کبھی کبھی مستفید ہوتا تھا۔ نیاز صاحب اپنی غذا کے معاملہ میں بڑے محتاط رہتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے (بھی) تین چیزیں بہت مرغوب ہیں۔ آم، مونگ کی دال، عودت جس زمانے میں السٹریٹیڈ ویکلی میں معمے نکلتے تھے تو معموں کے حل کرنے میں بڑی استعداد دکھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ مقصد انعام حاصل کرنا نہیں ہے صرف معمہ کا حل نکال لینا ہے۔ اسی طرح کی دلچسپی ریس کورس سے بھی تھی۔

ادبی گفتگوئیں جب چھڑتیں تو ان کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کوئی موضوع ہو کوئی ادبی مسئلہ ہو نیاز صاحب اس کے متعلق پہلے سے سوچی ہوئی ایک جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ اور اس سے بمشکل ہٹتے تھے۔ ان کی اصابت رائے ان کے لہجے کی اصابت سے مل جل کر اور بھی مضبوط اور بھاری بھر کم معلوم ہوتی تھی۔ تقاضائے سن کے باعث عرصہ سے مزاج میں گوشہ نشینی آگئی تھی۔ شہر میں مختلف قسم کے ادبی جلسے ہوتے رہتے لیکن وہاں ان میں بہت کم شرکت فرماتے تھے۔ لیکن تقاضائے سن ان کے اپنے کام میں کبھی حارج نہیں ہوئی۔ وقت مقررہ پر صبح وہ اپنے دفتر میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ اور غالباً بارہ یا ایک بجے دن تک مسلسل لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ ان سے کہا بھی گیا کہ کسی کو اپنا مددگار بنا لیجئے مگر واقعہ یہ ہے کہ کیسے بناتے۔ بیٹے ان کے بہت چھوٹے، داماد ملازمت پیشہ آدمی۔ اس لئے ان کا کوئی اپنا آدمی نہ تھا جس پر وہ پورے اعتماد کے ساتھ وہ اپنا سارا کام چھوڑ سکتے

مذہب اور معقولیت کے نیاز صاحب ہمیشہ دلدادہ رہے اسی لئے مذہب کو بھی انھوں نے معقولیت کے پیمانے پر لانے کی کوشش کی اس کوشش کو بہت سے لوگوں نے پسند بھی کیا اور بہتوں نے انتہائی ناپسند۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اور اُن کے والد محمد امیر خاں صاحب مرحوم نے انھیں بالکل عالم دین ہی بنانا چاہا تھا لیکن نیاز صاحب نے مذہب کو ہمیشہ ملائیت کی سطح سے بلند ہو کر سمجھنا چاہا اور روایت پر ہمیشہ درایت کو ترجیح دی۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چند سال ہوئے میری خوشدامن صاحبہ بہت علیل ہوئیں اور حالت نازک ہو گئی۔ ایک صاحب نے جو بذات خود نہایت معتبر اور سنجیدہ آدمی ہیں اس علالت کی خبر کو میری طرف منسوب سنا اور یہی جا کر نیاز صاحب سے کہہ دیا نیاز صاحب پریشان ہو کر میرے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے مکان کے اوپر کے کمرے میں اپنی خوشدامن صاحبہ کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ دور سے دیکھ لیا کہ نیاز صاحب جلد جلد آرہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ زینہ پر آگئے اور بغیر پکارے وہ زینہ پہ آنا چاہتے تھے کہ میں کمرے کے باہر آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کیسے ہیں میں نے کہا کہ میں تو اچھا ہوں البتہ میری خوشدامن صاحبہ بہت علیل ہیں۔ سنتے ہی کہا کہ دیکھیے اسی لئے تو میں حدیثوں کی صحت کا قائل نہیں ہوں کیونکہ راوی نہایت معتبر مگر خبر اس نے بالکل غلط پہنچائی۔

سیاسیات سے نیاز صاحب کی عملی دلچسپی کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ البتہ نظریاتی دلچسپی ہمیشہ رہی۔ نگار کے شذرات جو پچھلے دس بارہ سالوں میں لکھے گئے ہیں ان کے تعمق نظر کے غماز ہیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی نیاز صاحب ہیں جو کبھی نگارستان کے مصنف رہ چکے ہیں۔ ادھر پندرہ بیس سالوں سے نیاز صاحب کے انداز بیان میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ عہد شباب کی رنگین اور طرب انگیز انشاپردازی کی جگہ نہایت معقول اور مدلل صاف اور ستھری انداز تحریر نے لے لی تھی۔

ان کی کثیر تصانیف کا (جو مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہیں) کیا ذکر۔ تنہا ان کا نگار ہماری اردو صحافت کا ایک مستقل باب ہے جس استقلال یامردی اور ہمت کے ساتھ انہوں نے ابتدا ۱۹۲۲ء سے لے کر اب تک اُسے جاری رکھا ہے وہ لائق صد تحسین ہے اور اس کے ذریعہ اُردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ادب کا وہ کون سا پہلو ہے جس پر انہوں نے نہیں لکھا یا نہیں لکھوایا۔ یعنی چالیس سال کے اندر ملک میں اردو ادب نے جتنے پہلو بدلے ہیں ان سب کی عکاسی آپ کو نگار کے فائل میں نظر آجائے گی۔ اس ادبی پہلو کو چھوڑ دیئے نگار کے شماروں میں ایک خاص چیز آپ کو اور بھی نظر آئے گی اور وہ ہے نئی علمی معلومات کو خصوصیت کے ساتھ شایع کرنا۔ نیاز صاحب ادب وادبیات کے علاوہ دیگر علوم خصوصاً علوم جدید کے بڑے شایق رہے ہیں اور اپنے رسالہ میں ہمیشہ نئی نئی معلومات کو اس لئے جگہ دی ہے کہ دوسرے لوگوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور دیکھیں کہ دنیا اب کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے اس تعلیمی مقصد کے پیش نظر انہوں نے بہت سی مفید معلومات جو دیگر زبانوں میں تھیں ترجمہ کر کے پیش کی ہیں۔ کبھی ایسے موضوعات پر دوسروں سے بھی لکھوایا ہے۔ غرض یہ کہ نگار کی ادبی خدمات کے ساتھ معلوماتی لٹریچر کا فراہم کرنا بھی اس کا امتیازی وصف رہا ہے۔

نیاز صاحب اور اُن کے ساتھ نگار کا ہندوستان سے ہجرت کر کے جانا ہندوستان والوں کے لئے ایک بہت افسوس ناک واقعہ ہے۔ مجھے یہ بخوبی معلوم ہے کہ نیاز صاحب کسی جلب منفعت کی خاطر پاکستان نہیں گئے۔ اگر ایسا خیال ہوتا تو نیاز پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت ہی چلے گئے ہوتے۔ ان کے سیاسی خیالات میں بھی ایسی کوئی نمایاں تبدیلی ظہور میں نہیں آئی تھی جس کے تحت وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں انھیں سیاسیات میں عملی طور پر کبھی دلچسپی نہیں رہی ہمیشہ انھیں اپنے کام سے کام رہا ہے۔ ملک میں چاہے جس قسم کے خیالات رائج ہوں علم و ادب سے شغف رکھنے والے ہر حال میں اپنی گزر بسر کر لیتے ہیں۔ یہی حال نیاز صاحب کا تھا

اسی لئے ان کی ہجرت کی توجیہہ کسی سیاسی عقیدہ میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک ان کی قدردانی کا سوال ہے تو خود ہندوستان کی سرکار نے . . . . . انھیں "پدم بھوشن" کے خطاب سے نوازا ہے۔ سرکار سے زیادہ خود اردو داں طبقہ ان کی حتی الوسع قدر و منزلت کرتا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اگر بعض ہندوستانی یا پاکستانی اخباروں یا ادیبوں نے اس قسم کے الزامات تراشے ہیں تو وہ صریحاً بے بنیاد ہیں۔ نیاز صاحب اب عمر کے اس دور میں پہنچ چکے جب کہ منفعت یا مزید حصول شہرت و عزت کے خیالات کوئی خاص معنی یا اہمیت نہیں رکھتے۔ بلکہ اس عمر پر پہنچکر تو ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اپنے بقیہ ایام بے فکری اور آرام و اطمینان سے بسر کرے جائے اور جتنا کچھ ہو سکے اپنا ادبی یا علمی کام بغیر کسی فکر و اندیشہ کے کرتا رہے۔ یہی چیز اب نیاز صاحب کے لئے یہاں ممکن نہیں رہی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کی مہاجرت کن افسوسناک حالات کے تحت پیش آئی۔ واقعی ان کی نجی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہو گئے تھے جن کے باعث وہ اپنا کوئی کام سکون خاطر سے نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا کوئی عزیز قریب بھی ایسا نہ تھا جو انھیں اخلاقی طور پر ہی مدد دے سکتا۔ بڑھاپے میں مالی نہ سہی اخلاقی مدد اور انسانی ہمدردی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور یہی چیز انھیں یہاں میسّر نہ تھی۔ مجھے تو اُن کی انسانیت، شرافت، ہمدردی اور مکرمت ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔ اب بھی جب کبھی ان کے مکان کی طرف سے گزر ہوتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے سرگرم تحریر ہوں گے۔

ل - احمد

نیاز فتح پوری کی ادبیت

نیاز صاحب کی طویل فہرستِ تصانیف پر نظر ڈالنے سے بہ سہولت اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی ہمہ گیر جودتِ طبع کس قدر متضاد موضوعات علم و ادب پر محیط ہے۔ کیوپڈ و سائکی اور فراست الید اور اُن کے مابین متعدد وشعائر مضامین پر مبسوط بحثیں ان کے امعان نظر کا ثبوت ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے متنوع موضوعات کا احصار کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ نتیجے سے قطع نظر' اگر ایسی جسارت کی بھی جائے تو اس کی شکل ایک مضمون کی نہ ہوگی بلکہ مستقل تصنیف بن جائے گی۔

نفسِ مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے میں توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہماری زبان جس دورِ ارتقا سے گزر رہی ہے' میرے خیال کے مطابق' اس کا تقاضا ہے کہ اُردو میں ادبی پیداوار کی مقدار زیادہ سے زیادہ ہو۔ انتقادِ ادب کی اہمیت و ضرورت میں مبالغہ کیا ہی نہیں جاسکتا' لیکن ادبی پیداوار بڑھنے کے معنی ہیں کہ الفاظ و اسالیب کے ذخیرے میں اضافہ ہو۔

نیاز کی ادبی شخصیت

چنانچہ ادبی ذخیرے کی فراہمی اور علمی و ادبی ابداع یعنی الفاظ و اسالیب کی جدت کے پہلو سے نیاز صاحب کی خدمات نہایت وزنی ہیں۔ اور ان کی ادبی شخصیت ا

نہایت ممتاز ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ، نیازؔ صاحب نے نگار کے ذریعے سے گذشتہ چالیس سال میں اُردو کو متموّل بنا دیا ہے، موجودہ نسل میں مدیرِ الہلال مولانا ابوالکلام آزادؔ کے سوا اور کوئی نہیں کرسکا ہے۔

اُردو بولنے اور پڑھنے والی موجودہ نسل کی ذہنی تربیت میں نیازؔ صاحب کی روشن خیالی اور حریت فکر کو بہت بڑا دخل ہے۔ تقلید پرستی نے ہماری فکری صلاحیتوں پر جو جالے پُروتے تھے۔ ان کی صفائی میں نگار کی تحریروں نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔

مجازؔ مرحوم، اور باسط حسن صاحب نے ایک صحبت میں اعتراف کیا کہ "ہماری ذہنی تعمیر نگار کے مطالعہ سے ہوئی۔" اور مکرمی جمیل مظہری صاحب کے الفاظ ہیں کہ "نگار پڑھ پڑھ کے ہمیں لکھنا آیا"

نیازؔ کی ادیبانہ شخصیت میں، میری نظر میں، پہلی اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں اپنی رائے پر کلی اعتماد ہوتا ہے۔ اور ایسا اعتماد اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی کو محض اپنی ذات پر اعتماد ہو۔ یا کہیئے اعتماد رائے اور اعتماد ذات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اور اسی اعتماد رائے کا نتیجہ ہے کہ وہ عام معتقدات کے خلاف ہیں۔ اپنے نتائج فکر کو کمال وثوق اور جراءت کے ساتھ پیش کردیتے ہیں البتہ بعض مصالح کی بنا پر وہ اپنے معتقدات سے توبہ بھی کرسکتے ہیں۔ یعنی ناحق سے مصالحت بھی کرلیتے ہیں۔ ان کی دوسری خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ان کی نظر دوررس اور عمیق ہے۔ ان کا ذہن و دماغ زرخیز ہے جو تھکنا نہیں جانتا۔ اور مشاہدہ حد درجہ تیز اور ذکی ہے۔

ہر چند اس مشینی تہذیب کے دور میں یک فنی ہونا ہی مفید و کارآمد سمجھا جاتا ہے یعنی آدمی کسی ایک علم میں ایک شاخ یا شعبے کا ماہر بن جائے لیکن یہ بات ان قوموں کے اندر تو مفید اور قابلِ عمل ہوسکتی ہے جن میں قحط الرجال ہو، ہماری قوم میں ایسی ہستیاں مغتنمات سمجھی جانا چاہئیں جو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں

پر عبور رکھتی ہوں۔ نیاز صاحب کے ذات میں یہ جامعیت نظر آتی ہے کہ وہ علم و ادب کی مختلف شاخوں اور متنوع پہلوؤں پر اعتبار رائے کر سکیں۔ ان کی نظر وسیع ہے کیونکہ ان کے اندر اخذ و اقتباس کی قوت بدرجۂ کمال ہے۔ جو کتاب یا مضمون ان کی نظر سے گزرتا ہے اس کا جوہر یا ماحصل ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

شروع بیسویں صدی کے اردو مجلات میں الہلال وصلائے عام وغیرہ چند کے علاوہ باقی رسالوں کے فائل اگر آج دیکھے جائیں تو نہایت سطحی قسم کے مضامین پڑھنے میں آئیں گے۔ نگار کے اجرائے نے نہ صرف اردو ادب کا معیار بلند کیا بلکہ اعلیٰ اور سنجیدہ ادب کے پڑھنے اور پسند کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کر دی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے سنجیدہ اور اعلیٰ ادب تخلیق کرنے والوں کا ایک حلقہ منظم کیا۔ اور اسے جناب نیاز کی کارگزاری ہی کہا جائے گا۔ موجودہ دور میں ادبی ذوق کی تعمیر اور علمی معلومات کی جستجو کے اندر نگار اور اس طرح ایڈیٹر نگار کا بڑا ہاتھ ہے، جو اس نیاز مند کے اندازے میں نیاز صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

علمی معلومات کی اشاعت میں نگار نے جس قدر اور جتنا اہم کام کیا ہے اردو کے کسی دوسرے مجلے نے نہیں کیا ہے۔ علمی و ادبی مقالات کی اشاعت سے قطع نظر صرف استفسار و جواب کے ذریعے سے ایڈیٹر نگار نے موجودہ نسل کو وقیع اور سنجیدہ علمی مذاق سے آشنا کیا اور حریت فکر کا سبق دیا ہے۔ اس عنوان کے تحت جتنا مسالا بہم ہو گیا ہے وہ اپنی جگہ تو دائرۃ المعارف نہیں ہے مگر اس کی بنیاد ضرور بن سکتا ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس قدر مختلف النوع مباحث پر جستجو کر کے معلومات بہم پہنچانا بجائے خود بڑی قابلیت کا ثبوت اور بہت بڑی خدمت کی دلیل ہے۔ اس سلسلے کے پڑھنے والوں کی علمی و تاریخی معلومات میں کتنا اضافہ ہوا اور اس مطالعے نے ہمارے ذہنوں کی تربیت میں کیسا زبردست کام کیا ہے۔

اس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر خواص بالیقین محسوس کر سکتے ہیں۔

نیاز کی انشاء پردازی

اس دور میں نیاز صاحب اُردو کے مسلّمہ ادیب و انشاء پرداز اور بلاشبہ اعلیٰ طرز نگارش کے مالک ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے میرا ذاتی تاثر سمجھ لیں کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد ایک نیاز صاحب ہی کی انشاء و ادبیت کا قائل ہوں۔ ان کی چست اور رواں عبارت کو پڑھ کر الفاظ کے صحیح و باموقعہ استعمال کا فن سیکھا جاتا ہے۔ نیاز صاحب نے اکثر مغربی اسالیب بیان کو مشرق کی طرف موڑ دیا اور بے تکلفانہ انداز میں اپنا کر اپنی زبان و ادب کو متموّل بنایا ہے۔ نیاز صاحب کی انشاء کی ایک بڑی خوبی میری نظر میں یہ ہے کہ اُن کے قلم سے خشک مضامین بھی، خواہ وہ پیمائش افلاک ہی کیوں نہ ہو، افسانے کی رنگینی اور حکایت کی دلچسپی لئے نکلتے ہیں۔

نیاز صاحب کی انشاء و ادبیت کے ذیل میں میں ان کے دو مجموعوں یعنے نگارستان و جمالستان کا ذکر کروں گا۔ جو ان کے افسانوی ادب پر مشتمل ہیں۔ ان مجموعوں میں وردالحمراء، کیوپڈ و سائکی، ایک رقاصہ سے، چنگاری، مطربۂ فلک، ایک شاعر کا انجام اور رستی وغیرہ بہ لحاظِ نزاکتِ تخیل، طرزِ ادا اور ادبی صناعتہ، میرے خیال میں ایسے ادب پارے ہیں جو "ادب عالیہ" کی حیثیت سے ہمیشہ پوجے جائیں گے۔

ان مجموعوں میں بعض پارے ایسے بھی ہیں جنہیں کہا جائے گا کہ اصلاحی مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ اور جو اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہیں۔ اور بعض پارے ایسے بھی ہیں۔ جو مزاح کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ نیاز صاحب کی طبیعت میں شوخی کا جزو شامل ہے جو ان کی انشاء میں جھلکتا بھی ہے۔ مزاحؔ ظرافت ایک جُدا گانہ چیز ہے۔ میرے خیال میں نیاز صاحب اس کے لئے بنے نہیں ہیں۔

میں نیاز صاحب کی افسانہ نگاری پر اظہارِ رائے کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ ایک نقد نگار کا فرض ہوتا ہے۔ اتنا البتہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے افسانوں کا تخیل و تصوّر جسے انگریزی میں (CONCEPTION) کہا جاتا ہے، مجھے اس سے کلّی اتفاق نہیں۔ بہر گونہ ان کی ہر تحریر شاہد ہے کہ نیاز صاحب کا متخیلہ از بس قوی، تخیل نہایت نازک، ذہن کمال رسا اور مشاہدہ غایت دقیق ہے۔ وہ نہایت معمولی باتوں میں حُسن کا پہلو دیکھ لیتے اور اسے بڑے دل آویز اور حسین طریق پر پیش کر سکتے ہیں۔ الحاصل نیاز صاحب ایک صناع ادیب ہیں۔

اس ذیل میں "مکتوباتِ نیاز" کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کے مکاتیب بالعموم اس وقت مجتمع کئے جاتے ہیں اور شائع ہوتے ہیں جب اُن کے لکھنے والوں کے اعمال منقطع ہو چکتے ہیں۔ مگر یہ کتاب خود نیاز صاحب کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ بالفاظِ دیگر یہ خطوط تصنیف کئے گئے ہیں[1] اس لئے اس میں وہ خصوصیت تلاش کرنا جو نجی خطوط ہی میں ملتی ہے غلط ہوگا۔ مگر ایک تصنیف کی حیثیت سے ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی برجستگیٔ کلام، شوخیٔ بیان اور لطافتِ خیال کی بہتات ہے۔ اور انشائے عالیہ کا عمدہ نمونہ۔

نیاز کے معترضین

مجھے ایسے لوگوں سے گفتگو کا موقعہ ملا ہے جو نیاز صاحب کی علمی و ادبی خدمات کو اس لئے بلند مرتبہ نہیں دیتے کہ نیاز صاحب کے بیشتر مضامین ماخوذ ہوتے ہیں مگر وہ اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے اور استفسار و جواب کے ضمن میں وہ ان کتابوں کے نام ظاہر نہیں کرتے جن سے مدد لیتے ہیں۔

میں ان اعتراضات کی نوعیت سے تو بحث نہیں کروں گا مگر اس ذیل میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ چونکہ مجھے نیاز صاحب سے ایک

---

[1] اس قسم کی دوسری کتاب مولانا آزاد مرحوم کی غبارِ خاطر ہے۔

زمانے میں قربت زیادہ رہی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن و فراست کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو کتاب ایک دفعہ ان کی نظر سے گزر جاتی ہے اس کا خلاصہ یا ماحصل ان کے ذہن و نفس میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں بالکل قرینِ عقل ہے کہ ایک موضوع پر ان کے ذہن میں جو مواد محفوظ ہوتا رہا ہے، کسی وقت تحریک ملنے پر ایک مضمون یا مقالے کی صورت اختیار کرے، اور مختلف ماخذوں سے ایک ہی موضوع پر مواد حاصل ہونے کی صورت میں تو حوالہ دے سکنا ممکن بھی نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ رہ جاتا ہے کہ آیا دنیا میں کسی خیال یا عندیے کو نیا کہا بھی جا سکتا ہے؟ اور اس مقولے میں کتنی صداقت ہے کہ "زیرِ آفتاب کوئی شے نئی نہیں ہے"؟ عرفی کی حسین شاعرانہ قسموں کا کا اولین خاکہ امیر خسرو کے یہاں موجود ہے اور اقبال کے شکوہ کا چربہ غالب کی مثنوی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر عرفی کا قصیدہ اور اقبال کی نظم قابلِ قدر نہ سمجھی جائے گی؟

استفسار و جواب کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہ لحاظِ نوعیت اس قدر متنوع اور مختلف معلومات پر مشتمل ہوتا ہے کہ ہمیں بغیر کہے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ معلومات نیاز صاحب مختلف ذرائع سے بہم پہنچاتے ہیں۔ اور بالیقین وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچ سکتے ہیں کہ ان معلومات کو لوگ خود ان کے دماغ کی پیداوار سمجھیں گے۔ میری دانست میں تو کسی کا بھی اس طرح سوچنا یا سمجھنا مضحکہ انگیز خیال ہے۔ اور اس سے زیادہ مضحکہ انگیز یہ خیال ہے کہ نیاز صاحب ان تمام معلومات کو اپنے ذہن و دماغ کا ماحصل باور کرانا چاہتے ہیں۔ اور بالفرض اگر مختلف و متعدد ماخذوں سے معلومات بہم پہنچانا "علامہ"

سمجھے جانے کی وجہ و ثبوت ہو سکتا ہے تو اخبار اسٹیٹس مین[۱] کا "سوال وجواب" کا کالم مرتب کرنے والا نیازؔ صاحب سے بھی بڑا "علامہ" ہے۔ کیونکہ وہ بھی اپنے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیتا ہے۔

مجھے شدید احساس ہے کہ نیازؔ صاحب کی انشاء وادبیت کے محاسن اُجاگر کرنے کے لئے کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو نیازؔ صاحب کے ہم مرتبہ ہوتی۔ مگر جناب منظر صدیقی کے اصرار اور خود اپنی نیاز مندی کے تقاضے کی بنا پر یہ جرأت کر سکا ہوں اور یقین ہے کہ اپنی کم مائیگی کی وجہ سے میں جن خوبیوں کو نہیں دیکھ سکا ہوں، قارئین کا ذوق و ذہانت انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

ضروری نہ تھا کہ نیازؔ صاحب کی انشاء کے نمونے پیش کئے جاتے کیونکہ ان کی تحریر کا کوئی جزو ایسا نہیں ہوتا جو ادبی حسن نہ رکھتا ہو، لیکن اپنے ذوق و پسند کے مطابق بعض اقتباس پیش کر رہا ہوں:۔

ایک مصوّر فرشتہ

"خشکی کا حصّہ سارے عالم میں صرف اسی قدر تھا اور میر آب حباب کا حکم سوائے اس قطعۂ زمین، ساری کائنات پر سیال، لیکن حالت یہ تھی کہ سبزہ نہ تھا مگر یاسمین، اور چھوٹی چھوٹی موج آب نہ تھی۔ مگر نیلوفر سفید اور صرف سفید رنگ میں تمام موجوداتِ عالم ملفوف تھے۔ گویا نیچر ہنس رہا تھا۔۔۔۔"

"ایک شب کا واقعہ ہے، وادیٔ قاف میں سپید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفانِ عُریانی بپا تھا، فرطِ تعطّر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہو گئی تھیں، چاند اپنے سارے وجود کے ساتھ چادر میں پھیلا کر اترانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بھر کر رہ گئی تھی یہ معلوم ہوتا تھا۔

۱؎ اس زمانے میں اِس اخبار کا آخری صفحہ سوال وجواب کے لئے مخصوص تھا۔

کہ نقرئی زنجیریں ہیں اور حباب کے گھونگر دانے، جو صبا کے سبک و نازک پاؤں سے فرشِ آب پہ ہنگامِ رقص نکل کر رہ گئے ہیں، کرۂ آب یا دشتِ نیلوفر میں جو کلی کھل کر رہ گئی تھی اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ناہیدِ فلک کا ہیکل کی شوالے میں رکھا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

کیوپڈ و سائیکی

"جب رات کو شاہی باغ اور کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائیکی نقاب اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

" ۔ ۔ ۔ ۔ انتخابِ شوہر کی حِس جو عورت کی جوانی کی تنہا حِس ہے، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی ۔ بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتیں اور جو دکھائی جاتیں اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پہ نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غور سے از سرتا پا دیکھ لیتی ۔ ہاں، اسے غرور تھا، اپنے حُسن پہ ناز تھا! بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پہ لکھوا دیا کہ یہ اگر انسان ہے تو مجھے ایسے انسان کی ضرورت نہیں!"

"وہ کسی شاعر کی بہترین تصنیف اٹھا لیتی اور جذباتِ حُسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اُس کے ہات سے چھوٹ جاتی ۔ بارہا ایسا ہوتا ۔ ۔ کہ اسی حالت انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پہ پڑ جاتی تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی گھڑی ایسی نہ تھی، اس کی خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حُسن سے معمور نہ پاتی ہو ۔ اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو ۔ ۔ یا پھر ایسے کھیلوں میں جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھتا یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی ۔ ۔ ۔ ۔ اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیوں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی ۔ ۔ ۔ سائیکی نصف عورت تھی ۔

اور نصف انفعال و جستجو!"

اب وہ اپنی زندگی سے جیسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی یہاں تک بیزار تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبرائی تھی کہ تاریکی اس کے لئے روشنی ہے ..."

"اس کے اعضاء دکھ رہے تھے ... اس نے ہاتھ الٹ کر پیشانی کو چھوا۔ اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا..."

"لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے۔ اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں بلکہ جداگانہ حسن ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سائیکی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آسکتا تھا ... سائیکی کنجوں میں غائب ہو گئی، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔"

وینس کو سائیکی کے حُسنِ عالم سوز کی اطلاع ملتی ہے تو رشک و حسد سے بیتاب ہو جاتی ہے اور ایک تدبیر سوچ کر اپنے بیٹے کیوپڈ سے جا کہتی ہے:۔

"جب تو تیر و کمان لے کر نکلتا ہے تو سنا ہے کہ جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ 'اچھے کیوپڈ جی چاہتا ہے تو ہمارے دلوں کو چھلنی کر دے لیکن خدا کے لئے پیروں میں زنجیر محبت نہ ڈال'، کرۂ زمین میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائیکی تیری قائل نہیں، جا اور اس کو بتا دے کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز اور غرور شکن ہے۔"

کیوپڈ جاتا ہے کہ سائیکی کو گھائل کر دے مگر:۔

"فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کاشانوں میں سُن لیا کہ آج وینس کا بیٹا سائیکی کے باغ میں بے ہوش پڑا ہے۔"

میری دانست میں پسند کے مطابق شاعرانہ تخیل اور نزاکتِ بیان کی جو بلندیاں نگارستان میں ملتی ہیں، جمالستان کے اندر اتنی نہیں ہیں۔ دُنیا کا

اولیں "بت تراش" اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے جس میں علوئے تخیل کے ساتھ نفسیات کے ایسے لطیف اشارے اور نازک لمس سامنے آتے ہیں کہ دل پھڑک اٹھتا ہے۔ ہیرو جب ایک بت بناکر اس سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے دل میں یہ فطری آرزو پیدا ہو کر اسے بیتاب کر دیتی ہے کہ :-

" اس سے کچھ بات کرے اور وہ جواب دے۔ اس کو اپنی آغوش میں لے لے اور اس کا بدن لچک جائے ۔۔۔۔ بسا اوقات وہ اس خیال سے اس حد تک متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اسے واقعی زندہ سمجھنے لگتا اور اس سے جاکر پوچھنے لگتا کہ تیرے لب کیوں نہیں کھلتے ۔ کیا مجھ سے برہم ہے؟"

" ... جب اس نے دیکھا کہ مجسمے کا رنگ بدل چلا ہے اور اس کا جسم اتنا سخت نہیں رہا کہ اسے سنگین کہہ سکیں، جب وہ دباتا تو نرم محسوس ہوتا تھا جیسے کیلے کا درخت ..."

" اس آرزو کی شدت یہاں تک بڑھتی ہے کہ ہیرو آفتاب سے التجا کرنے لگتا ہے کہ اپنی محبوبہ سنگین کے لئے وہ چیزیں اس سے مانگ لے جن کی اس میں کمی پاتا ہے۔

" ... لیکن اگر تو چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے، تیرے دامن سے میں تھوڑا سا رنگ چاہتا ہوں اور ذرا سی گرمی ۔ اور اگر تو عنایت کر تو کچھ وہ چیز بھی جس سے تو جنگلوں میں پھلوں کو پختہ کرتا ہے اور سنہرا ۔"

ہیرو صنم تراش اپنی تمنا آرزو کو ہر ذرے کے سامنے پیش کرتا پھرتا ہے اور اسی پیش کش التجا میں ایک شب :-

" ... قریب قریب ساری روح صرف کر چکا تو بے ہوش ہو گیا ۔"

اس مجسمے میں جان پڑ جاتی ہے اور صنم تراش کی آرزوئیں اور خواہشیں آسودہ ہو جاتی ہیں، اور بالآخر مسرتیں اور لذتیں عادتوں اور روزمرہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور پھر وہ وقت آجاتا ہے کہ بیزاری شروع ہو جاتی ہے، پھر

"۔۔۔یہاں تک کہ ایک دن ازقا (ہیرو) نے انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اس کو مارا تو دفعتاً نگاہوں پر سے پردہ سا ہٹ گیا اور اس کا ہاتھ کسی پتھر جیسی چیز پر پڑا۔۔۔"

"ایک شاعر کی محبّت" میں نیازؔ صاحب نے مرد کی وہ خصوصیات بیان کی ہیں جو جنسِ لطیف کی توجہ کو جذب کر لیتی ہیں :۔

"جاویدؔ کی قابلیت، اس کا ذوقِ ادب، اس کی شہرتِ شعری، اس کی وارفتہ ادائیں، اس کی ہر وقت کی بے خودی اور پھر اس کے ساتھ اس کے تاثرات عشق کا چہرے سے اظہار، ان سب نے مل کر اسے جنسِ لطیف کی توجہ کا آماجگاہ بنا دیا تھا۔۔۔ چہرے کی ساخت اس قدر متناسب تھی کہ نگاہ جس جگہ پڑتی وہیں آسودہ ہو کر رہ جاتی۔۔"

حسن محبّت کا خالق ہے یا محبّت خالق حسن ہے، ایک بحث طلب مسئلہ ہے، اور کوئی شک نہیں کہ جب ان دونوں کا تصادم یا کہیے اتصال ہوتا ہے تو "ہر لحظہ برنگ دگر آمد" کا مصداق ہوتا ہے۔ لیکن وہ فریب کتنا عجیب ہے جو حسن و عشق ایک دوسرے کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو دیتے رہتے ہیں۔ ایک ایسے ہی موقعے کو نیازؔ صاحب نے کیسی سادگی سے پیش کر دیا ہے:

"۔۔۔ جاوید کو جب اس نے (ہیروئن) اوّل بار دیکھا تو اس کے دل میں سوائے اس کے کوئی جذبہ موجود نہ تھا کہ ملک کو ایسے ہونہار شاعر کی قدر کرنا چاہیے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مراسم بڑھے تو اس نے اپنے اندر ایک خاص قسم کا انجذاب محسوس کیا اور آخر کار وہ اس سے محبّت کرنے پر مجبور ہو گئی۔"

ہیروئن مبتلائے محبّت ہے اور ہیرو اس سے بے پرواہ، ایک جگہ رسمی ملاقات ہوتی ہے، تخلیہ ملتا ہے، ہیروئن آرزوؤں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ مگر ہیرو خموش رہتا ہے تو وہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے:۔

" جاوید بولو' تمہارا یہ سکوت مجھے تباہ کئے دے رہا ہے۔ تم مجھ پر ظلم ہی کرو لیکن لبوں کی جنبش سے' مجھے مایوس کرو مگر خموشی سے نہیں بلکہ ملامت سے' جھڑکی سے ۔"

" ۔ ۔ ۔ محبت ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے ۔"

ہیرو کی کرداری بلندی کا اظہار ایک دوست سے گفتگو میں اس طرح بیان ہوا ہے :۔

" تم اسے صرف عورت جان کر یہی سمجھتے ہو کہ اس کے سامنے صرف محبت پیش کی جاسکتی ہے ۔

" لیکن میں ایک عورت سے زیادہ بلند ہستی جان کر محبت سے زیادہ قیمتی چیز اس کی نذر کے لئے اپنے پاس رکھتا ہوں : وہ میرا جذبۂ احترام ہے"

ہیرو کسی ملکہ کی ممی سے محبت کرنے لگتا ہے اور تنہائی میں اس ممی کے سامنے اپنی صمیم آرزوئیں پیش کرتا ہے ۔ یہ پورا ادب پارہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے مگر اس کے فقرے حسین ترین ہیں ۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ جو نیند تجھ پہ طاری کر دی گئی ہے اگر وہ فطرت کا کوئی راز ہے' اگر وہ سنگ دل قدرت کی کوئی طلسمی مہر ہے' تو میں اس سے بھی التجا کرنے کو تیار ہوں ۔ خواہ اس ایک لمحے کے لئے جب وہ اپنی چشم خواب آلود کو نیم وا کر کے میری اشک باریوں کو دیکھ سکے مجھے اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے ۔ ۔ ۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ میں بعض اوقات ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تیری خاموشی مجھ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہے' تیری لانبی پلکوں کو کھول کر تیری نگاہ مجھ تک پہنچنے ہی والی ہے' اور میں سراپا انتظار' ہمہ تن حیرت ہو کر رہ جاتا ہوں ۔ لیکن پھر سے مجھے ہوش آجاتا ہے اور سمجھتا ہوں کہ تیرا استغنا

کبھی مجھ سے خطاب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ تیری شاہانہ تمکنت کا یہ اقتضا ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ ایسے ذلیل انسان کی طرف اعتنا کرے!...."۔

ہیروئن ایک خط کے ذریعے سے اپنے قلبِ زار کی حالت کی ہیرو کو اطلاع دیتی ہے، ممی کا عاشق اس خط کا جواب لکھتا ہے، اس خط میں نیازؔ صاحب نے حسنِ تلمیح کی ایک نادر مثال پیش کی ہے۔

"اے ابراہیم کی بیٹی، ابھی تو زلیخا کی تباہی ہوئی بہت سی چالیں باقی ہیں۔ وہ بھی چل کے دیکھ لے! یوسف کو تو عزیزِ مصر کا خزانہ حاصل کرکے اپنی پیغمبری کے کاروبار کو فروغ دینا تھا کہ پھنس گئے۔ مجھے یہ بھی غرض نہیں ...."

ہیروئن جس مرتبے اور مزاج کی عورت تھی اور جس حال میں تھی، اس پر اس تحریر کا وہی اثر ہوتا ہے جو ایک عورت پر ہونا چاہیئے۔ وہ برہم ہو جاتی اور انتقام لینے کا عزم کرکے اپنے آپ سے کہتی :۔

"جس سرزمین میں زلیخا پیدا ہوئی تھی وہیں میں بھی پیدا ہوئی ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ تو اپنی سعی سے ایک نبی رام کرے اور میں ایک معمولی انسان سے شکست کھا جاؤں"۔

اور یقیناً اس ہیروئن کو ہزیمت خوردہ نہیں کہا جائے گا۔

کیوپڈ و سائیکی کی تمہید میں نیازؔ صاحب نے جو کچھ کہا ہے، اس جواز کی بنا پر آئندہ نسلیں نیازؔ صاحب کی تحریروں کو ادبِ عالیہ اور انشائے لطیف کی حیثیت سے ہمیشہ قابلِ پرستش سمجھیں گی۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

نیازؔ۔ کچھ رجحانات، کچھ نظریے

جناب نیازؔ اُردو کے موجودہ ادیبوں اور انشاء پردازوں میں غالباً سب سے معمّر اور سب سے زیادہ وسیع تجربے کے مالک ہیں۔ طویل عرصہ تک "نگار" کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں انہیں افراد اور حالات کا گہرا تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ وہ اس زمانے میں میدانِ ادب اور صحافت میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ جب کہ موجودہ نسل کے لکھنے والوں میں سے بہت سوں نے ابھی قلم سنبھالنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

نیازؔ صاحب کی دلچسپیوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس عہد کے لکھنے والوں میں سے شاید ہی کسی ایک ادیب اور انشاء پرداز کا ہوگا۔ وہ عالم ہیں، صحیفہ نگار ہیں۔ ادیب ہیں، انشاء پرداز اور نقّاد ہیں، افسانہ اور ناول نگار ہیں، انشائیے بھی لکھتے ہیں۔ غرض ہر صنفِ ادب میں ان کا قلم "سہولت اور روانی کے ساتھ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ پامسٹری یعنی علم فراست الید سے بھی انہیں دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر اُردو میں سب سے پہلی کتاب غالباً انھوں ہی نے لکھی تھی۔ علم فراست الید کی اصطلاح بھی اُردو کو انھیں کی دین ہے۔

بحیثیت ادیب کے نیازؔ صاحب کی خدمات اور ان کے رجحانات بظاہر متنوع

اور مختلف معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر اُردو کے جدید رومانی اسکول کے لکھنے والوں میں ان کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کے معاصرین میں ایک اور ادیب اور انشاء پرداز سجاد حیدر یلدرم تھے۔ جو گہرے رومانوی رجحانات رکھتے تھے۔ مہدی افادی بھی اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن زمانے نے ان کی ذہانت کو پوری طرح مثمر ہونے کی مُہلت نہ دی۔ سجاد حیدر اور نیازؔ میں مناسبت صرف رجحان کی حد تک ہے۔ اس سے ہٹ کر دونوں کے میدان مختلف اور الگ الگ ہیں۔ نیازؔ اور یلدرم دونوں نے افسانے لکھے ہیں اور ناول پر بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن سجاد حیدر کے افسانے عموماً طبع زاد ہیں اور نیازؔ کے اچھے افسانے ترجمے ہیں۔ ناول کی حد تک یلدرم نے ترکی سے استفادہ کیا تھا، لیکن نیازؔ کا ناول یا ناولٹ "شہاب کی سرگزشت" بظاہر طبع زاد ہے، لیکن گو بعض نقادوں نے اسے آسکر وائیلڈ کے "پکچر آف ڈورین گرے" کا چربہ بتایا ہے۔ دونوں صاحب اسلوب ہیں۔ لیکن دونوں کے اسلوب میں بڑا فرق ہے۔ نیازؔ (HIGH BROW) ادیب ہیں۔ جن کے مخصوص ذہنی معیار ہیں اور ان معیاروں سے نیچے اُتر کر وہ نہیں لکھ سکتے۔ نیازؔ کی طبیعت کی اسی اُفتاد نے ان کی تحریروں کو بعض وقت غیر معتاد، ادق اور مشکل بھی بنا دیا ہے۔ سجاد حیدر کے یہاں ایک دبا دبا سا مزاح ہے۔ جس کی متحمل نیازؔ کی تحریریں نہیں ہو سکتیں۔

بہ حیثیت انشائیہ نگار کے، نیازؔ کا پایہ میری نظر میں ایک تخلیقی مصنف کا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری میں ادبِ لطیف کا رنگ نمایاں ہے۔ آج سے کئی سال پہلے ادبِ لطیف کے انداز کی تحریروں کو اُردو میں بڑی مقبولیت حاصل تھی اور ادبِ لطیف کو مقبول بنانے میں خود نیازؔ کا بڑا حصہ تھا۔ ادبِ لطیف میں موضوع کی نُدرت کے علاوہ، اسلوب میں بھی ایک لطافت ہوتی تھی۔ جنابِ نیازؔ کے انشائیوں میں بھی موضوع کی نُدرت اور اسالیب کی لطافت موجود ہے۔ اسی لئے وہ انشائیہ نگار کی حیثیت سے بہت جلد افقِ ادب پر چمکے۔ ان کی

تحریروں میں ایسی جاذبیت اور ایسا رس تھا کہ بہت سے نوجوان انشاپردازوں کو ان کی تقلید کی خواہش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس صدی کے ربع اوّل میں ادبِ لطیف کی تحریروں کی بڑی بھرمار ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر نوجوان، فن کار نہیں ہو سکتا، اسی لئے گھٹیا ادبِ لطیف کے تخلیق کاروں کے خلاف اس زمانے میں اسی طرح شور بلند ہوا تھا۔ جس طرح ہم سے قریب تر زمانے میں سستی ترقی پسند تحریروں اور شاعری کے خلاف جذبات اُبھرے تھے۔

نیاز دراصل اپنے انشائیوں کی بدولت منظرِ عام پر اُبھرے۔ انہوں نے بہت سے انشائیے لکھے، لیکن یہ سب اکٹھے شائع نہ ہو سکے۔ آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے ان کی انشائیوں اور افسانوں کا ایک مجموعہ "نگارستان" کے نام سے شائع ہوا تھا، جسے جناب قمرؔ نے مُرتّب کیا تھا۔ اس میں اکیس[۲۱] ادب پارے شامل ہیں، جن میں سے کچھ مختصر افسانے ہیں اور کچھ انشائیے یا مضامین۔ لیکن نیازؔ، پطرسؔ اور بعض دوسرے انشاپردازوں کی تخلیقات میں، افسانے اور انشائیے کا فرق اتنا مہین ہوتا ہے کہ نقّاد انہیں اپنے اپنے تاثر کے مطابق اِس ذیل میں یا اُس ذیل میں شامل کر سکتے ہیں۔ "نگارستان" کے مُرتّب نے اسی مجموعے کے سارے ادب پاروں کو ادبی مضامین میں شامل کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ "نگارستان" میں کئی تحریریں ایسی ہیں، جنہیں ہم علانیہ افسانے کے سوا کسی اور صنف میں شامل نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر "زائرِ محبت" "حرا کا گلاب" "کیوپڈ و سائیکی" "کہکشاں کا ایک سانحہ" "قربان گاہِ حسن" "ہذیانات انفعال" "محبت کی دیوی" اور ایک "مصلح بت تراش" یہ آٹھوں واضح طور پر مختصر قصّے ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور تحریریں "چند دن بمبئی میں" اور "روح کی فریب کاریاں" افسانے اور انشائیہ کی سرحد پر ہیں۔ میرے خیال میں تو ان دونوں اور خاص طور پر موخرالذکر کو مختصر افسانے ہی میں شامل کرنا چاہیئے۔ ادبی اصناف میں سرحدوں کا یہ ٹکراؤ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ادیب، فن کار اور خاص طور پر تخلیقی فن کار کا ذہن صوری بندشوں کا متحمل نہیں

ہونا چاہتا - تاہم ہمارے پاس سرحدوں کے تعین کے کچھ وسیع معیار ہیں افسانہ بنیادی طور پر ایک بیانیہ ہوتا ہے، جو چند واقعات اور بعض وقت محض ایک واقعہ کی پیش کشی پر مشتمل ہوتا ہے - اسی لئے کسی واقعے (EPISODE) کی پیش کش کی قسم کی کوئی چیز مل جائے، تو ہم اسے بہ آسانی افسانے کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں -

بعض وقت تخلیق کار کے انداز پیش کش اور اسلوب کی نزاکت کی وجہ سے ان کی کسی تحریر کی شناخت مشکل بھی معلوم ہوتی ہے - نیاز کی تحریر" روح کی فریب کاریاں" اسی نوع کی ہے - اس میں واقعہ کی پیش کشی تخلیق کار کے ارتسامات کے تحت دب گئی ہے -

محولۂ بالا ادب پاروں سے ہٹ کر، اس مجموعے میں کچھ تحریریں ارتساماتی ہیں، جیسے" ایک مصوّر فرشتہ" " ایک قافلہ صحرا کو دیکھ کر" اور" دلِ زیرِ سنگ" ایک دو توضیح پارے یا مرقع ہیں - ان میں" ایک رقاصہ سے" " رازِ کشش" "اور طلوعِ آفتاب" قابلِ ذکر ہیں -

"برسات" کا انداز یلدرم کے" اگر میں صحرا نشیں ہوتا" سے بہت ملتا جلتا ہے -

" نگارستان" میں نیاز صاحب کی ایک تحریر" اپنے چاند سے" قاضی عبدالغفار کی تصنیف" لیلیٰ کے خطوط" کی نوع کی ہے -" لیلیٰ کے خطوط" مکتوباتی ناول ہے، اور" اپنے چاند سے" ارتساماتی افسانہ - دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ لیلیٰ اپنے خطوط کے ذریعے ہمارے سامنے آتی ہے، اور سارے واقعات خطوط ہی کی زبان سے ادا ہوتے ہیں - جناب نیاز کے افسانے کا کینوس مختصر ہے - یہاں واقعات، محض ارتسامات کے انداز میں ادا ہوئے ہیں -

انشائیہ اور مختصر قصّے کی یہ تخلیط نیاز صاحب ہی کے یہاں نہیں، بلکہ

جدید عصر کے کئی اور انشا پردازوں کے یہاں بھی ملتی ہے یلدرم کی "خیالستان" میں کئی تحریریں افسانے اور انشائیے کی سرحد پر واقع ہوئی ہیں۔ پطرس کی تحریروں کا جو مجموعہ "مضامینِ پطرس" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کئی مزاحیہ مختصر قصّے شامل ہیں۔

نیازؔ صاحب کے ادبی افکار میں جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ "کلاسکیت" کا ہے۔ "کلاسیکی" اور "کلاسکیت" ایک مغربی اصطلاح ہے، جیسے ہمارے مصنّفین قدیم ادب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی نے اپنے بعض مضامین جو قدیم ادب سے متعلق ہیں "کلاسیکی ادب" کے نام سے شائع کئے ہیں۔ ہمارے یہاں کلاسیکی ادب کے معیار اور اصول اس طرح متعین اور مقرر نہیں ہیں، جس طرح مغربی ادب میں ہیں۔ مغربی ادب میں "کلاسیکل" اور "کلاسیکس" کا ایک خاص مفہوم ہے، جس میں فکری نہج۔ منہاج و مقصد اور نظریات شامل ہیں۔ یہ دراصل مغربی ادب کے ارتقا کی تاریخ کا ایک مرحلہ ہے، جس میں یونانی اور رومی معیاروں کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا جاتا ہے۔ موضوع کی ایک مخصوص مفہوم میں رفعت اور کارنامہ کی تکمیل کا سڈول پن، کلاسیکی تصوّر ادب کے اہم اجزا مانے جاتے تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں ظاہر ہے کہ ایسا کوئی مرحلہ نہیں آیا جب کے ہمارے لکھنے والوں نے یونانی اور لاطینی معیاروں کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے باوجود قدیم ادب کے مفہوم کو اصطلاحی انداز سے ظاہر کرنے کے لئے اس اصطلاح کو اُردو میں میں مستعار لے لیا ہے۔

نیازؔ صاحب جدید عہد کے انشا پرداز ہیں، لیکن ان کے ذہن پر کلاسکیت کا جتنا گہرا اثر چھایا ہوا ہے، اس کا پَرتو ہم ان کے موضوعات، تصورات، اور اسلوبِ نگارش ہر جز میں پاتے ہیں۔ "نگارستان" کے قصّوں اور انشائیوں

میں سے کئی موضوعات میں کلاسیکی ہیں۔"کیوپڈ اور سائیکی" توحقیقتاً کلاسکی ہے، جو یونانی دیو مالا سے لیا گیا ہے۔ یہ بات کہ نیاز صاحب نے دنیا میں وسیع ادبی محرکات میں سے، اس کلاسیکی موضوع کو منتخب کیا، ان کے ذہن پر کلاسکی ادب کے گہرے اثر کا ثبوت ہے۔ یہی رجحان"حمرا کا گلاب"،" زائرِ محبت" "ایک مصوّر فرشتہ"" کہکشاں کا ایک سانحہ" اور" روح کی فریب کاریاں" میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

نیاز صاحب کا اسلوبِ بیان بھی ان کے کلاسیکی رجحان سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

" روشنی کی تیز کرنیں مجھے اک مودب فاصلے پر روکے ہوئے تڑپ رہی تھیں" اب سے بہت پہلے کروڑوں برس پہلے، جب تکوینِ عالم کی بالکل ابتدا تھی مذاقِ آفرینش یا تو امواجِ آب سے لاعب نظر آتا تھا یا وادی قاف کی نسرینِ و نسترن راز میں آسودہ"۔

" شبستانِ ناز کے پُرلطف وقیق ہائے برق کسی کی آرمیدہ مژگاں کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں، مگر ایک حسرت آلود انتقام عشق ان لا بنی گھنی پلکوں کا ماجرا، جو آسودہ آنکھوں کی لذّت سے مست و سرشار ہیں۔ سُننے کے لئے بیتاب ہیں"۔

یہ موضوع اور تکمیل کے سلسلے کی بات تھی۔ جہاں تک رجحان فکر کا تعلق ہے جناب نیاز علی الاعلان۔ رومانیت کے دلدادہ ہیں۔ اس کا بخوبی اندازہ ہم کو ان کے موضوعات اور ان کی پیش کش سے ہوتا ہے۔ عشق و محبّت کی رنگین وارداتیں اور اظہارِ جذبات کا مبالغہ آمیز انداز، ان کے تخلیقی ادب کی نمایاں خصوصیت ہے۔

" نگارستان" کے ایک افسانے کی تمہید میں نیاز صاحب نے اس نظریۂ ادب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جس کے وہ پیرو ہیں۔ وہ ادب کے نظریۂ مسرت زائی

کے معتقد ہیں، قدیم عہد میں دنیا کے ادب کا یہی مطمع نظر تھا، لیکن ہم سے قریب تر زمانے میں مسرت زائی کے نظریہ کو ادب برائے حیات کے نظریہ نے شکست دیدی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسرت زائی کا نظریہ تمام وکمال رد نہیں ہوگیا تھا؛ چنانچہ بعض حالیہ نقاد، جیسے اسکاٹ جیمسز وغیرہ کے یہاں یہ پھر ابھر رہا ہے۔

ادب اور افادیت کے بارے میں نیاز صاحب سنجیدہ شبہات رکھتے ہیں۔ "کیوپڈ وسائیکی" کے تمہیدی نوٹ میں وہ اپنے ادبی افکار کی غرض وغایت کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"میرا مقصود اس سے داد لینا نہیں بلکہ خود لطف اُٹھانا ہے۔"

یہ اظہارِ حقیقت میں نیاز صاحب کے ادبی نظریہ کی شرح وتفسیر ہے، تاریخی اور سیاسی لٹریچر ان کی نظر میں افادی ادب ہے، جس سے انھیں کسی طرح کا سروکار نہیں۔ مذہبی ادب، اعتقادی ادب ہے، اور اسے "ادب" محض وسیع ترین اور تحریر کے معنوں میں کہا جاسکتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ٹھیٹ ادب کے خدوخال اس جملے میں نظر آسکتے ہیں، تاریخی، سیاسی یا مذہبی لٹریچر پیش کرنے والے کے مقابلے میں :-

"ایک اور ہے، جو ان اصناف سے علیحدہ ہوکر، اس لٹریچر کو رواج دینا چاہتا ہے۔ جو صرف روح کو متاثر کرتا ہے۔ اس شعبۂ ادب کو پسند کرتا ہے، جس کا تعلق صرف ہمارے دل سے ہے ..."

آگے وہ یونانی اور ہندی فلاسفر کی طرح ایسے ادیب کے بارے میں سوال کرتے ہیں :-

"کیا آپ کے نزدیک وہ بالکل بے کار وقت ضائع کرتا ہے؟" پھر وہ اپنا ذاتی خیال اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

"لیکن میرے نزدیک تو یہی ایک چیز ایسی ہے جو مادیات کی عظیم ترین فتوحات کے مقابلے میں روحانیت کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے۔"

افادی یا اعتقادی ادب اور تخلیقی ادب کا انہوں نے ذیل کے جملوں میں گویا موازنہ کیا ہے لکھتے ہیں :۔

ایک واعظ میرے سامنے خانۂ کعبہ کے تقدّس کا اظہار کیسے ہی پُر اثر لب و لہجہ میں کیوں نہ کرے لیکن جس عظمت و تقدّس کا خیال میرے دماغ میں اس انداز سے پیدا ہوتا ہے کہ :۔

درطوفِ حرم دیدی، دی مغبچۂ می گفت کیں خانہ بدیں خوبی آتش کدہ باسیتی

"وہ ہزار واعظوں کے مواعظ سے بھی پیدا ہونا ممکن نہیں "

ان کے رومانی تصوّرِ ادب میں عورت کا مقام سب سے اہم اور مرکزی ہے۔ ایسے نقّادوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ ان کی تخلیقات میں "عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر عنصر غالب ہے" نیاز سوال کرتے ہیں :۔

" مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس رہ کیا جائے گا؟" کائنات میں کون سی دوسری ایسی چیز ہے، جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں گے؟"

اس طرح سے ادب اور عورت، ان کی نظر میں لازم و ملزوم ہیں، اقبال کو "ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس" سے شکایت تھی کہ "آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار" نیاز اپنے انشائیے میں جس کا عنوان "عورت ہے" اس کا گویا جواب دیتے ہیں کہ :۔

خدا معلوم اس سے قبل کتنی بار ارادہ کیا کہ خدا کی اس محترم ترین مخلوق پر کچھ لکھوں لیکن سوائے اس کے کہ جب تک ایسا خیال قائم رہا۔ ایک خاص نوع کا لطف تو ضرور اُٹھاتا رہا۔ یہ ہمّت کبھی نہیں ہوئی کہ کچھ لکھتا۔ دنوں گذر گئے ہیں کہ میں اسی فکر میں مستغرق رہا ہوں کہ آخر یہ حسن و محبت جس کے اثرات کا خلاصہ ہماری ناکامیوں اور کامرانیوں میں ایک طویل آہ یا اُف سے زیادہ نہیں کیوں اس درجہ ہمارے نظام عصبی پر حکم راں ہے۔ لیکن سوائے اس کے اور کچھ سمجھ

میں نہیں آیا کہ وہ حکمراں ہے اور اس کو حکمراں ہونا چاہیئے "

نثری تخلیقات: ان کے خیال کے مطابق "نثر میں شاعری" ہونا چاہیئے۔ادب میں عورت کے مقام کو واضح کرتے ہوئے اپنے نقّادوں سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

" جب شاعری سے، جو اس نوع کے ادبِ لطیف کا پاکیزہ ترین شعبہ ہے، صنفِ نازک اور اس کا ذکر جدا نہیں کیا جاسکتا تو کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جو نثر میں شاعری کرنا چاہتے ہیں اس جنس کے ذکر سے تائب ہوجائیں "

وہ اپنے محبوب موضوع کو بے نقاب پیش کرنے کے بھی قائل ہیں۔ ان کے معاصرین نے ان پر عریاں نگاری کا بھی الزام دیا تھا۔ لیکن نیازؔ صاحب فن کا منتہا عُریانی سمجھتے ہیں ۔ ایک رقاصہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" لوگ کہتے ہیں تو عُریاں ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عُریانی، مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تکمیل عُریانی پر ختم ہوتی ہے اور عُریانی خود ایک صنعت ہے "

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے عہد کے لئے، نیازؔ کے یہ ادبی تصوّرات، نہایت جرّی اقدام تھے، لیکن انھیں اپنے نظریوں اور تصوّرات پر ایقان تھا، اس لئے اپنے نقّادوں کے شور و پکار کے باوجود انہوں نے اپنے ایقامات سے کبھی انحراف نہیں کیا جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہوگا۔

" جس وقت سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے (بلالحاظ اس کے کہ زمانہ کیا چاہتا ہے) میں نے ہمیشہ اپنے انھیں حسّیات کی پابندی کی، اور نظم ہو یا نثر، انھیں خیالات کے اظہار کو اپنا محبوب مشغلۂ خلوت قرار دے رکھا ہے "

مجنوں گورکھپوری

جدید اردو نثر، نیاز فتح پوری اور نئی نسل

ہندوستان کی پہلی پر خلوص مگر بد انجام سعیٔ آزادی، جس کو آج تک انگریزوں کے دیئے ہوئے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی جس کے لئے "غدر" یا "بدعملی" کے شرمناک لفظ کے سوا ہمارے بزعمِ خود آزاد ملک کے ذہن میں کوئی دوسری اصطلاح ابھی تک نہیں آئی۔ ایک ایسا تاریخی تجربہ تھی جس نے کئی اعتبار سے اور کئی سمتوں میں ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ہم کو یہ احساس دلادیا کہ ہم کس قابل ہیں اور دراصل کسی قابل ہونے کے لئے ابھی ہم کو کیا کرنا ہے اور کن آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ ہم کو اپنی اصلی حالت کا اندازہ ہوگیا اور ہم نے اپنی توانائیوں کی نارسائی اور اپنی طاقتوں کی بے اثری کو ایک شدید کسک کے ساتھ محسوس کرنا شروع کیا۔ یہ احساس روز بروز زندگی کے ہر شعبہ میں جڑ پکڑتا گیا، ہر طرف ہم کو انتہائی ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ہم کو یقین ہوگیا کہ جب تک ہمارا پرانا نظامِ معاشرت اپنے تمام شعبوں اور اداروں کے ساتھ نئے زمانہ کے مطابق بدل نہیں جائے گا اس وقت تک آزادی اور ترقی کی ساری جدوجہد ایک خوابِ بے تعبیر سے زیادہ وقیع نہ ہوگی۔

یہ حق ناشناسی ہوگی اگر یہ سمجھیں کہ ہمارے اندر یہ نیا شعور جگانے میں ہمارے برطانوی آقاؤں کا کوئی حصہ نہ تھا جنھوں نے ہم کو غلام بنائے رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ہمیں انگریزی زبان سے بخوبی واقف کریں اور اس زبان کے ذریعہ تمام مغربی افکار و آراء سے خبردار رکھیں۔ ہمارا یہ نیا شعور جس کو بیک وقت غلامی اور آزادی کا شعور کہنا چاہیئے بہت تیز اور بڑی احتیاط کے ساتھ ہمارے اندر فروغ پانے لگا اور اس کا اثر ہر سمت اور ہر ادارے میں سُرعت کے ساتھ سرایت کرنے لگا۔ سوامی دیا نند اور سرسیّد کی اصلاحی تحریکیں اسی نئے شعور کی نمائش تھیں اور ان میں سے ایک تحریک ایسی نہیں تھی جو یہ دعویٰ کر سکے کہ برطانوی قیصریت کے ساتھ بڑھا کر دی ہوئی برکتوں سے بے نیاز رہی ہو۔

جہاں تک اُردو زبان اور ادب کی اصلاح اور ترقی کا تعلّق ہے یہ سب جانتے ہیں اور ہم کو ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعتراف کرنا ہے کہ اس کا واسطہ براہِ راست تحریکِ سرسیّد سے تھا جس کا دوسرا نام تحریک علی گڑھ ہے۔ سرسیّد بیچ میں آتے یا نہ آتے اُردو زبان و ادب کو ایک نیا موڑ لینا تھا۔ اور ایک نئی روش اختیار کرنی تھی۔ بہر حال اُردو زبان اور اُردو شعر و نثر کا نشاۃ الثّانیہ سرسیّد کی معاشرتی تحریک کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ اس تحریک سے ایک نہایت مختصر مدت کے اندر اُردو نثر اور شاعری میں نئے عنوان اور نئے اسلوب کے اتنے کثیر نمونے وجود میں آگئے کہ ہم حیرت کے ساتھ یہ سوچنے لگے کہ ابھی کل تک ہماری زبان کس قدر تنگ دامن اور کم مایہ تھی اور آج اس کا دامن کتنا وسیع نظر آرہا ہے۔ جو طرح طرح کے نئے ادبی جواہر پاروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم کو اُمید بندھ گئی کہ ہماری زبان کا مستقبل بہت روشن ہے اور اس کے لئے نت نئی ترقیوں کے امکانات لامحدُود ہیں اور ہماری یہ اُمید بہت جلد پوری ہوئی۔

سرسیّد سے لے کر شبلی تک کوئی بڑی مدت نہیں ہے لیکن اس عرصے کے اندر نظم و نثر کے کتنے بڑے نئے ذخیرے کا اضافہ ہو گیا۔ خصوصیت کے ساتھ نثر کے شعبے میں مختلف موضوعات و مسائل پر نئے اصول اور نئے اسالیب کے ساتھ جتنی کتابیں حالی، آزاد، شبلی اور سرسیّد کے دوسرے رفقاء نے تصنیف کیں وہ ہم کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کم مدت کو ایک پورا دَور قرار دیں، جس کو جدید اُردو نثر کا پہلا دَور کہنا چاہیئے۔

یہ اُردو ادب کا افادی دَور تھا۔ یعنی اس زمانے میں جو کچھ لکھا گیا وہ زندگی کے معاشرتی اور اخلاقی مفاد اور فلاح کو مدِ نظر رکھ کر لکھا گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دَور اُردو میں اسی طرح عقلیت اور نثر کا دَور تھا جس طرح انگریزی زبان کی تاریخ میں اٹھارویں صدی۔ اس عہد میں اُردو زبان کی اصلاح اور اس کی توسیع ترقی کے لئے ویسی ہی کوششیں ہوئیں جیسی کہ انگریزی زبان کی اصلاح و ترمیم کے لئے اٹھارویں صدی میں ہوئیں۔

سرسیّد کا یہ دَور اُردو نثر کا پہلا مہتم بالشان دَور ہے۔ اس دَور کے سب سے زیادہ اور گراں قدر لکھنے والے خود سرسیّد اور ان کے رفقاء میں حالی۔ آزاد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، مولانا شبلی اور شرر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کسی ایک دو اصناف نثر کو اپنا فن بنایا اور ان اصناف میں بہترین کارنامے پیش کئے۔ ابھی سرسیّد کا دَور اپنا کام کر رہا تھا کہ مغرب سے نئے ادبی تاثرات، تصوّرات اور روایات و اسالیب کی نئی لہریں ہندوستان میں پہنچیں۔ اور ہمارے دل و دماغ ہمارے فکر و احساس اور ہمارے اسلوبِ بیان اور اندازِ اظہار کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تحریکِ سرسیّد کے نمائندے ابھی اپنا کام کر ہی رہے تھے کہ اُردو ادب میں وہ نیا میلان شروع ہوا جس کو مجمل طور پر ہم رُومانیت کہیں گے۔ اِس میلان سے جدید اُردو نثر اور نظم کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ لیکن پہلے دَور اور دوسرے دَور کے درمیان نہ کوئی خلا رہے اور نہ کوئی بے ربطی

دونوں ادوار باہم مسلسل ہیں۔ اور ابوالکلام آزاد اس سلسلے کی درمیانی کڑی ہیں۔ اگر ایک طرف سرسید، حالی اور شبلی کے اسالیب کو مدِ نظر رکھا جائے اور دوسری طرف ابوالکلام آزاد کی طرزِ تقریر اور اسلوبِ تحریر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ محمد حسین آزاد کے سوا پہلے دور میں کسی انشاء پرداز کے ہاں رنگینی یا انشائی دل کشی نہیں پائی جاتی۔

ابوالکلام آزاد دونوں ادوار کے ممتاز عناصر کا امتزاج ہیں۔ ایک طرف تو موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان کی بیشتر تحریریں اور تقریریں افادی انداز رکھتی ہیں۔ دوسری طرف ان کی اسلوب نگارش اور انداز تقریر دونوں میں کچھ ایسی سموئی ہوئی رومانیت یا شعریت محسوس ہوتی ہے جو ان سے پہلے کے اساتذہ کے اسلوب میں نہیں پائی جاتی اور جو صاف اور نمایاں طور پر نیا عنصر معلوم ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک کہ اسلوب اور طرزِ بیان کا تعلق ہے ابوالکلام آزاد سے اُردو نثر میں وہ دور شروع ہوتا جس کو ہم رومانی دور کہیں گے۔

ابوالکلام آزاد کی امامت میں دیکھتے دیکھتے ایسے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی جو موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے رومانیت پسند تھے۔ ابوالکلام آزاد سے لے کر نیاز تک ایک مکمل دور ہے جس کا اُردو ادب کی تاریخ میں وہی مقام ہے جو کہ انگریزی ادب کی تاریخ میں اُنیسویں صدی کا ہے۔ اس دور کی ابتدار تو ابوالکلام آزاد سے ہوئی لیکن اس کے اصلی علم بردار نیاز فتح پوری ہیں۔ ابوالکلام آزاد ادیب اور انشاء پرداز سے زیادہ ماہرِ سیاسیات اور خطیب تھے اور وہ بہت جلد دوسری سمت میں نکل گئے اور ایسا مشغول ہوئے کہ ادبی تخلیق کی فرصت ہی نہ ملی۔ خالص ادب کے میدان میں نیاز استقلال اور استقامت کے ساتھ اُردو نظم اور نثر کے نئے دور کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس سلسلے میں ایک شخص کا ذکر نہ کرنا بڑی بے انصافی ہوگی۔ ہماری مُراد مہدی حسن افادی الاقتصادی سے ہے۔ یہ وہ انشاء پرداز ہے جس نے واقعی اپنے

زمانے کے نوجوان نثر نگاروں کو ایک خالص جمالیاتی اسلوبِ تحریر دیا۔ شبلی جیسا فاضل انشاء پرداز مہدی حسن کی رچی ہوئی طرزِ نگارش پر رشک کرتا ہے۔ اور خود نیاز نہ صرف ان کے اندازِ بیان کے قائل ہیں بلکہ ان کی نثر میں جو جمالیاتی کیفیت ہے، اس کے مزاج میں افادی الاقتصادی کا اثر بھی اور دوسرے اثرات کے ساتھ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ سرکاری ملازمت کی غلامانہ مشغولیت نے مہدی حسن کو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ کسی موضوع پر کوئی مستقل تصنیف یادگار چھوڑ جاتے۔ صرف چند ادبی شہ پارے اور کچھ خطوط ہیں جو ان کے نام کو تاریخِ ادب اُردو میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان کا سیاسی شعور کہیں خفیہ کہیں علانیہ طور پر سرفروشانہ انداز سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کا ادب خالص رومانی میلان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ بڑھتی ہوئی رومانیت ایک طرف تو مغربی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ تھی دوسری طرف خود اپنے ملک میں ٹیگور کی متصوفانہ رومانیت اس کی ذمہ دار ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیگور کے ساتھ ساتھ انگریزی کے مشہور شعراء اور مصنفین بالخصوص عہدِ وکٹوریہ کے آخری دور کے ادیبوں کا اثر روز بروز اُردو ادب میں مقبول ہو رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اُردو میں اس عجیب و غریب صنفِ نثر کا سودا ہر لکھنے والے کے سر میں سمایا ہوا تھا۔ جس کو شعر منثور یا شاعرانہ نثر کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کی ابتداء ٹیگور سے ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے انگریزی میں اسکر وائلڈ (OSCAR WILDE) اور والٹر پیٹر (WALTER PATER) جیسے جمال پرستوں نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈال رکھی تھی۔ اور شعرِ منثور کی نئی صنف یورپ کے اکثر ملکوں میں رواج اور قبولِ عام حاصل کر چکی تھی۔ خود ٹیگور اس مدرسہ کی نظم و نثر کے اسباب سے کچھ کم متاثر نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے افکار اور اسلوب پر اس ادبی تحریک کا اثر زیادہ ہے جس کو (CELTIC REVIVAL) کہتے ہیں۔ اور جس نے بالآخر سیاسی رُخ اختیار کر کے آئرستان

IRELAND کو قومی آزادی دلوائی - آج ہم صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ٹیگور کی منظومات کے اسلوب کی ترکیب میں ان کے شدید قومی اور ملکی میلانات کے باوجود مغربی رومانیت کا کس حد تک اثر ہے اور شاید بغیر سوچائے ہوئے ہم کو آج بھی نہ سوجھے کہ ہندوستان کی ہر زبان کے ادب کو اور خاص طور پر اُردو نظم و نثر کو "گیتانجلی" "باغبان" "ماہِ نو" وغیرہ نے کس حد تک متاثر کیا ہے۔

اُردو زبان میں نیازؔ فتح پوری نہ صرف اس دَور کے رہنما ہیں بلکہ ایک خاص ادبی دلبستان کے بانی بھی ہیں جس کو جمالیاتی دلبستان کہنا چاہیئے - رومانیت اور جمالیات دونوں ان کی ادبی تخلیقات کی بہت نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں - میں صرف آج کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ خصوصیت کے ساتھ نیازؔ کی ادبی زندگی کے اس حصہ کا ذکر کر رہا ہوں جو ۱۹۲۷ء پر ختم ہوتا ہے۔

نیازؔ فتح پوری نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی اور نظمیں لکھنے لگے ان کی نظموں کے مطالعہ سے بہت صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جہاں ایک طرف اپنی طبیعت کے رومانی ابھار سے متاثر ہیں وہاں دوسری طرف ابوالکلام آزاد کا اثر بھی ان پر غالب ہے اسلوبِ نگارش میں تو بہر حال ان کا سلسلہ ابوالکلام آزاد سے ملتا ہے لیکن ان کی جو نظمیں رومانی نہیں ہیں ان میں اکثر مواد اور موضوع میں بھی وہ ابوالکلام آزاد سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں - ان کی اکثر نظمیں قومی اور ملی ہیں اور ان میں ابوالکلام آزاد کی آواز کے ارتعاشات بہت صاف طور پر محسوس ہوتے ہیں - نیازؔ کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ وہ شاعری کے لئے نہیں بنے ہیں اور پھر وہ نثر کی طرف اس طرح مڑے کہ ان کی شاعری نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ان کے لئے بھی آج ایک بھولا ہوا خواب ہے۔ یہ اُردو ادب کے حق میں بہت مبارک ہوا - نیازؔ کا ذوقِ جمال اور ان کا حسن کارانہ شعور وہ دوسرا آہنگ چاہتا تھا جس کا غیر شاعرانہ نام نثر ہے - نیازؔ نے اُردو زبان و ادب کی جو ناقابلِ فراموش خدمتیں نثر کے میدان میں کیں وہ شاید شاعری کے میدان میں رہ کر نہ کر سکتے۔

نیاز کے نثری کارناموں کا آغاز جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے شعرِ منثور سے ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں ان کے یہ ٹکڑے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور ہر نیا لکھنے والا ان کی تقلید کرتا نظر آتا تھا۔ یہ شعر نما منثورات زیادہ تر آسکر وائلڈ اور ٹیگور سے ماخوذ تھے لیکن انہوں نے اپنے تخیل کی انچ سے طبع زاد نمونے بھی پیدا کئے جو رنگین اور لطیف ہیں۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے نیاز کی انفرادی فنکار شخصیت انھیں نثری پاروں سے واضح اور نمایاں ہوگئی تھی۔

۱۹۲۲ء سے پہلے کی نیاز کی حیثیت ایک خالص رومان نگار کی تھی۔ جن منثورات کا مجمل ذکر کیا جا چکا ہے ان سے الگ ہوکر اس زمانہ میں نیاز کا سب سے بڑا کارنامہ افسانہ نگاری ہے۔ پریم چند کے ساتھ نیاز فتح پوری نے بھی اردو زبان میں نہ صرف مختصر افسانہ کی بنیاد رکھی بلکہ ایک خاص منزل تک اس کی مکمل تعمیر بھی کی۔ نیاز ایک زبردست قوتِ آخذہ کے مالک ہیں۔ وہ بڑے سلیقہ کے ساتھ دوسری جگہ سے مواد لے سکتے ہیں اور اپنے انفرادی اسلوب سے اس کو اپنا بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا کوئی عیب نہیں بشرطیکہ کوئی اپنے تخلیقی اسلوب سے دوسری جگہ سے ماخوذ مواد کو بالکل نیا روپ دے سکے شیکسپیر کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں جو دوسری جگہ سے نہ لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ڈراموں کے اصل ماخذوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اس کے ڈرامے آج تک دنیا کو متاثر کئے ہوئے ہیں۔ اوّل اوّل نیاز کے افسانے یونانی اساطیر و قصص اور مصر و عرب یا دوسرے قدیم ملکوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ماخوذ ہوتے تھے جو بڑی رومانی سرگشتگی اور والہانہ دھن کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ ان افسانوں کا موضوع بلا استثنا حسن و عشق ہے۔ محبت اور عورت کی جیسی رنگین اور دلفریب تصویریں ان افسانوں میں ملتی ہیں۔ اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے وہاں نہیں ملتیں۔ نیاز کے تمام افسانوں پر معدودِ چند چھوڑ کر شروع سے آخر تک ایک رومانیت چھائی ہوئی ہے۔ جو محض سطحی نہیں ہوتی بلکہ دُور تک جاری و ساری ہوتی ہے اس رومانیت کا تعلق کسی ماورائی یا تخیلی دُنیا سے نہیں ہوتا۔ نیاز کے افسانے اسی ٹھوس اور سنگین عالمِ آب و گل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ جب حسن و عشق کے بیان پر آتے ہیں

توہم کو ہوا اور بادل میں نہیں لے جاتے بلکہ جسم کی تمام چھپی ہوئی رنگینیوں اور کیفیتوں سے لذّت آشنا کرتے ہیں۔

"کیوپڈ اور سائیکی"۔ "زائر محبت"۔ "حسن کی رعنائیاں"۔ "حمرا کا گلاب" "کہکشاں کا ایک سانحہ"۔ "شاعر کا انجام"۔ "تاج دار رقاصہ"۔ "شہاب کی سرگزشت"۔ یہ جتنے افسانے ہیں سب محبت اور عورت کو ایک لطیف راگ میں منتقل کر دیتے ہیں۔ جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو پڑھنے والے کو اس طرح مبہوت کر لیتا ہے۔ کہ اس کو پھر کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ نیازؔ کے عشقیہ افسانے سوز و گداز اور تاثیر کے ایسے مرقعے ہیں جن کی مثال نیازؔ سے پہلے نہیں ملتی لیکن نیازؔ کو محض رومانی افسانہ نگار سمجھنا غلطی ہوگی۔ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے افسانے میں نفسیاتی تجزیے اور کردار نگاری کو اہمیت کے ساتھ داخل کیا۔

جوں جوں ان کی افسانہ نگاری بالغ ہوتی گئی ان کے افسانوں میں یہ نفسیاتی میلان زیادہ نمایاں اور مستقل ہوتا گیا۔ "شہاب کی سرگزشت" اور اس کے بعد جتنے مختصر یا طویل افسانے نیازؔ نے لکھے ہیں ان سب میں رومانیت کے ساتھ یہ نفسیاتی میلان بہت زیادہ اُجاگر نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اُردو افسانہ نگاری میں وہی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو انگریزی ناول اور افسانے میں جارج ایلیٹ کی ہے۔ لیکن نیازؔ محض نفسیاتی اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں اور اپنے رجال داستان کے نفس کی گہری تہوں کا جائزہ لینے سے احتیاط برتتے ہیں۔

لیکن مجموعی حیثیت سے ہم پھر کہیں گے کہ نیازؔ کے افسانوں کی واقعیت اور ان کے نفسیاتی رجحانات کے باوجود ان کی سب سے نمایاں خصوصیت خالص رومانیت یا جمال پرستی ہے جس کا تعلق باطنی کیفیات سے زیادہ اور ظاہری حالات و حادثات سے کم ہے۔ وہ بہت تیز اور جزدرس قوتِ مشاہدہ کے مالک ہیں۔ اور ماحول اور خارجی مواقع کے بہت صحیح نقشے پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ نقشے صرف پسِ منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے سامنے افراد کی انفرادی اور

داخلی زندگی کو پھیلا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۴ء کے بعد انہوں نے کچھ ایسے افسانے بھی لکھے جن کا واسطہ رسمی طور پر سماج اور معاشرت سے ہے لیکن ان افسانوں میں نیاز کے اسلوب کی کشش تو پائی جاتی ہے مگر ان میں وہ جادو نہیں جن کی بنا پر ان کے دوسرے افسانے یادگار رہیں گے اور جن کی بدولت اردو ادب کا مورخ نیاز کا نام مختصر اردو افسانے کے بانیوں کی فہرست میں گنانے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔

نیاز ایک اونچے درجے کے رومان نگار ہوتے ہوئے بھی روزِ اوّل سے ایک سنجیدہ اور صاحبِ عقل و ہوش آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنے کو نہ تو کبھی شعر میں کھویا اور نہ کبھی رومان میں ڈبویا۔ حالانکہ وہ شعر و رومان دونوں کی پھڑکتی ہوئی رگیں پکڑ لینے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

نیاز کو علومِ عربی اور فارسی میں تو گھر پر پورا ادراک حاصل ہو چکا تھا لیکن انگریزی میں بھی ان کا مطالعہ وسیع اور متنوع رہا ہے۔ اور وہ پھر ایک خاص معیار کا مجلسی شعور بھی رکھتے تھے۔ جس کی بدولت وہ اونچی اونچی علمی صحبتوں سے فیض یاب ہو سکے ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک خاص جامعیت پیدا ہو گئی جو نہ صرف شعر و رومان بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنے لگی۔ نیاز کی اس جامعیت کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے "نگار" جاری کیا۔ یہ غیر متوقع جامعیت اور قاموسی تبحر ایک طرف تو نیاز کی وسعتِ ذوق و نظر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کی یہ قاموسیت جو زیادہ گہری نہیں ہے انکی تخلیقی قوت کے لئے خسارہ بھی ثابت ہوئی۔ نیاز صحیح معنوں میں ایک فنکار ہیں اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آج جب ہم "نگار" کا اداریہ یعنی نیاز کے "ملاحظات" پڑھتے ہیں تو موضوع سے زیادہ نیاز کا اسلوبِ تحریر ہم کو اپنی طرف کھینچے رہتا ہے۔ نیاز ایک صاحبِ طرز کے علاوہ اگر کچھ ہو سکتے تھے تو افسانہ نگار یا خاص نوع

کے نقاد اور درحقیقت ان کی مستقل حیثیت اُردو ادب میں انہیں خصوصیات کی بنا پر قائم ہے۔ لیکن "نگار" کی ادارت کے سلسلے میں انہوں نے زندگی کے اور بہت سے مادّی اور غیر مادّی سنگین مسائل پر لکھنا شروع کیا جو دوسرے لکھنے والوں کے لئے چھوڑے جا سکتے تھے۔

مجھے وہ گھڑی بھولے گی نہیں جب کہ میں نے نیاز صاحب کو ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں اپنی خردانہ رائے دی تھی کہ مذہبی مباحث کو علمائے دین اور ہادیانِ متین کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ اور "نگار" کے صفحات کو ان سے پاک رکھا جائے۔ لیکن نیازؔ کی طبیعت میں کچھ چلبلا پن بھی ہے۔ دوسرے وہ سنسنی خیز باتوں کی تجارتی قیمت کو ایک معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی اور آج تک وہ ان جھگڑوں سے حظ حاصل کر رہے ہیں۔ جو سات جنم لینے کے بعد بھی میں نہ کر سکوں۔ نیازؔ فطرتاً ایک صاحبِ اسلوب ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ افسانہ نگاری یا ایک خاص قسم کی ادبی تنقید کے لئے موزوں تھے۔ لیکن اس کو کیسے بھلایا جائے کہ وہ زندگی کے اور معاملات اور مسائل پر بھی اپنے قلم کی جولانی دکھاتے رہے ہیں۔ اور ان کے تحریری کارناموں میں افسانے اور ادبی تنقید کے علاوہ ایک ضخیم حصہ متفرقات کا بھی ہے۔ جن میں اخلاق و حکمت، اقتصادیات و معاشرت ارضیات و فلکیات، مذہب و تصوّف، فحاشیات، جنسیات، سمدرک یعنی علم فراست الید، علم نجوم اور پھر سیاسیاتِ حاضرہ غرض کہ زمین و آسمان کا کون سا قضیہ ہے جس کو نیازؔ صاحب نے نہ چھیڑا ہو اور جس سے اپنے طرزِ تحریر کے جادو سے بڑے بڑے مرتد پڑھنے والے کے لئے دل کش نہ بنا دیا ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیازؔ نے جب کبھی کسی موضوع کو اُٹھایا تو کافی تحقیق اور چھان بین سے کام لے کر اس کو بڑے سلیقے کے ساتھ پیش

نیاز کی تحریروں کی ایک مستقل خصوصیت وہ قرینہ ہے جو اردو کے بہت کم انشاء پردازوں کو میسر ہوا ہے۔ نیاز کے علمی اور تحقیقی یا معاشرتی اور مذہبی مضامین سے ہم کو جو کچھ اور جس قدر بھی اختلاف ہو ہم ان کی کسی تحریر پر بے قرینگی یا ناشائستگی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ یہی شائستگی اور خوش قرینگی ہے جس کا آج بیشتر نوجوان ادیبوں کی تحریروں میں کال نظر آتا ہے۔ ہم اب کیا کریں کہ نیاز کے اس ادبی ہرکارہ پن نے خود ان کی اپنی خلاق طبیعت اور اصلی فنی اپج کو نقصان بھی پہنچایا۔ یہی نہیں بلکہ شاید اس نے "نگار" کو ایک تجارتی معاملے کی حیثیت سے بھی کچھ کم گھاٹا نہیں ہوا۔ مذہبی مسائل کو چھیڑ کر جو یقیناً ان کی روبہ انحطاط تخلیقی قوت کی علامت بھی ہے انہوں نے اپنے لئے دشمنوں کا اچھا خاصا گروہ پیدا کر لیا ہے اور اس سے "نگار" کے شیدائیوں کی تعداد بھی گھٹتی ہی گئی ہے۔ لیکن نیاز کا بڑے سے بڑا منکر بھی ان کے اسلوب کی ساحرانہ قوت سے مبہوت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نیاز کے اسلوب کی ایک زبردست خصوصیت وہ ڈرامائی اچانک پن ہے۔ جو انہوں نے آسکر وائلڈ اور اس کے بعد کے انگریزی نثر نگاروں سے سیکھا ہے اور جو ان کے ہم عصر یا ان کے بعد کی نسل کے کسی ادیب میں بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ اچانک پن ان کے کٹر سے کٹر دشمن کو ان کی انشاء پردازی کی توانائی کا اعتراف کرنے کے لئے یقیناً کافی ہے۔ سجاوٹ اور بے ساختگی کو خوش آہنگی کے ساتھ ایک جگہ دیکھنا ہے۔ تو نیاز کے اسلوب کو دیکھئے۔ اور پھر یہ اسلوب محض جمالیاتی کیفیتوں سے معمور نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر جرأت اظہار اور تاب سخن پائی جاتی ہے۔ جو اس سے پہلے کسی اور نثر نگار کو نصیب نہیں ہوئی۔

نئی نسل کو نیاز سے جو ترکہ ملا وہ اسلوب ہے۔ ایسا اسلوب جو طرح طرح کی توانائیاں اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور جس پر پرانے اور از کار رفتہ ہونے کا الزام آج بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

نیازؔ کے اسلوب میں بیک وقت ایک ٹھہری ہوئی سنجیدگی سنبھلی ہوئی شوخی باہم ملی جُلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ یہ اسلوب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نازک سے نازک رنگین مسائل پر شگفتگی اور دل آویزی کے ساتھ بحث کی جا سکتی ہے۔ موضوع کی خشکی یا تلخی کو اسلوبی کیفیتوں میں اس طرح لپیٹ لینا کہ محسوس نہ ہونے پائے معمولی ہُنر نہیں ہے اُردو نثر کی نئی نسل نے یہی ہُنر نیازؔ سے پایا ہے۔ اور جب تک اُردو زبان کا کوئی ادبی مستقبل ہے اس کے ادیبوں کی کوئی نئی نسل نیازؔ کے اسلوب کے اثر سے بے نیازی نہیں برت سکتی۔ اُردو نثر کی تاریخ میں نیازؔ کا اسلوب ایک زندہ قوّت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔

آخر میں ایک اہم بات کا احساس دلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نیازؔ اپنے دَور کے بیشتر معاصرین کی طرح ان ادیبوں میں سے ہیں جن کو رجعتی اور ترقی پسند شقوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے خود اپنے کو کسی جماعت کے ساتھ منسوب نہیں کیا۔ وہ ادب اور زندگی کے بارے میں اپنے متعین اصول و نظریات رکھتے ہیں جن پر انہیں وثوق ہے اور ہمیں ان سے باز پُرس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا انسان نوجوان نسل اور نئے دَور کے لئے گزشتہ شمارہ ہو جاتا ہے۔ کارلائل اور راسکن، ہارڈی اور سیموئل بٹلر، مارس اور والٹر پیٹر آج محفلِ پارینہ کے لوگ ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعروں میں شبلی جیسا بے باک انقلابی شاعر آج اگلے وقتوں ہی کے لوگوں میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن شعر و ادب کی تواریخ میں ان ناموں سے تجاہل یا تنافر برتنا جہالت اور تنگ نظری سمجھی جائے گی۔ ان لوگوں کے اکتسابات کے زندہ عناصر آج کی نئی نسل کی رُوح میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح نیازؔ کے نام سے اُردو نثر کی جامع اور بے تعصب تاریخ کبھی تجاہل نہیں برت سکتی۔ نیازؔ میں ایک خصوصیت بڑی قابلِ قدر ہے جو پُرانی نسل کے لوگوں میں بہت نایاب ہے۔ اور یہ ان کی ادبی فراخ دلی ہے۔ وہ خود کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے اور ان کے خیالات اور معتقدات اپنی جگہ کچھ اٹل سے ہیں۔ لیکن وہ نئی نسل کو ادب اور زندگی میں نئے راستے اختیار کرتے ہوئے

اور آگے قدم بڑھاتے ہوئے ۔ دیکھ کر چلتے اور کسی پر لعن طعن نہیں کرتے اور
یہ بہت بڑی بات ہے ۔ اگر گزرے ہوئے دَور کے لوگ نئے دَور کے نوجوانوں سے
خلوص اور شفقت کے ساتھ حوصلہ افزائی کے لئے صرف اتنا کہہ سکیں ۔

یہ سفر رفتنت مبارک باد

تو ہمیں یقین ہے کہ نئی نسل والے جو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی اُمنگ
اپنے اندر رکھتے ہیں اس کو اپنے حق میں برکت سمجھیں گے ۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقیؒ

نیاز اور نگار

اردو اخباروں اور رسالوں کے موجودہ معیار اور مذاق کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان، اس کے ادب، شاعری، تنقید اور اسالیب کی نشوونما اور فروغ میں سب سے زیادہ حصّہ اخباروں اور رسالوں کا ہی ہے۔ اوّل تو کتابیں ہمارے یہاں لکھی ہی کم جاتی ہیں۔ شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے۔ پھر ان کتابوں کے پڑھنے والے اور بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر سال جتنے مضامین لکھے جاتے ہیں اور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں ان کی اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں ہر طرح کے اخبار اور رسالے ہیں۔ ایسے بھی جنھیں صرف کاغذی چیتھڑا کہنا چاہیئے اور بقول ہمارے ایک دوست کے کتب خانوں اور الماریوں میں محفوظ کرنا تو درکنار اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ غسلخانوں کی زینت بن سکیں۔ اِن میں سے بعض صرف نعروں پر زندہ ہیں۔ بعض پرانی قبروں کے مجاور ہیں۔ بعض گفتہ اور ناگفتہ یہ مردانہ اور زنانہ جنسی بیماریوں کے علاج اور قوت مردمی کی دواؤں کے اشتہارات کی برکت سے زندہ ہیں۔ ان اشتہاروں کو پڑھ کر بہتوں کا بھلا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ اِن کے شائع کرنے والوں کا بھلا ضرور ہوتا ہے۔ کچھ رسالے ارباب سیاست ارکان حکومت اور سیاسی تنظیموں کی سرپرستی سے زندہ ہیں۔ انہیں سرکاری اشتہارات ملتے ہیں۔ ان کے پرچوں کی ایک بڑی تعداد مفت تقسیم کرنے اور ردّی میں بیچنے کے لئے خریدی جاتی ہے۔ ایک نئی جنس رسالوں کی زمانہ حال کی پیداوار ہے۔

یہ ناشرین کے رسالے ہیں جس کے لئے وہ خود کو کوزہ کوزہ گر د خود گلِ کوزہ" ہیں۔ وہی اس کے مدیر اعلیٰ، وہی مضمون نگار، وہی نقاد، وہی منیجر اور وہی مالک ہوتے ہیں اور از راہ سرپرستی چند مفلوک الحال اور مجہول الاسم مصنفوں کی نگارشات کو بڑی آب و تاب سے شایع کر کے یہ گویا ادب اور زبان کی بڑی مسیحائی کرتے ہیں۔ ان رسالوں میں مضامین کم اور ان کی مطبوعات کے اشتہارات اُن کی تعریف میں قصیدے اور ان کے منظورِ نظر ادب کی تلبیس کرنے والے نام نہاد شاعروں ادیبوں کی تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔ کاتب دیکھتے دیکھتے مدیر، مدیر اعلیٰ، مصنف، نقاد اور صاحبِ طرز انشا پرداز بن جاتے ہیں اور اب جو گفتگو کرتے ہیں تو میں کے بجائے ہم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور قسم کے رسالے ہیں جو ادب کے سرپرست سرکاری حکام نکالتے ہیں اور گویا اپنے اصلی منصب پر فائز ہونے میں ان کی جو روسیاہی ہے اسے ادبی خدمت کے جلوؤں سے دھونا چاہتے ہیں۔ ان کے رسالے بھی بڑی آب و تاب سے نکلتے ہیں اور ان کے اخراجات "مِن فضلِ رَبی" ہوتے ہیں۔ آخر بڑے بڑے بلیک مارکیٹ کرنے والے، درآمد برآمد کے اُستاد، سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی تو اپنی دولت کی کچھ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اس سے اچھا کیا ہے کہ ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں ادب کی سرپرستی بھی ہو جاتی ہے اور ادیب حاکم کی خوشنودی بھی گویا دونوں جہان میں سرخروئی اسی سے حاصل ہوتی ہے اور پھر ایسے اخبار اور رسالے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے مالی افکار سے محفوظ و مامون رکھا ہے جن لوگوں کے ہاتھوں لاٹھی ہوتی ہے۔ یہ اس کی بھینس ہوتے ہیں لیکن بھینس کا دودھ صرف چند لوگوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ ہر شخص کا معدہ اسے ہضم نہیں کر سکتا اس لئے ایسے لوگوں کو اِن بھینسوں کے دودھ کا استعمال ممنوع ہے۔

ایک قسم کے رسالے اور ہیں جنہیں بعض سرپھرے لوگ نکالتے ہیں۔ یہ خود رسالدار یا رسالہ دار نہیں ہوتے اور نہ رسالے والے ان کی سرپرستی کرتے ہیں یہ اپنے شوق سے رسالہ نکالتے ہیں اور جیسے بہت سی بازیوں کا شوق بالآخر شوقینوں کی جیب

خالی کرا لیتا ہے اسی طرح رسالہ بازی کا شوق انہیں مفلوک الحال بنا دیتا ہے انہیں اپنے رسالوں سے آمدنی نہیں ہوتی بلکہ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ ان رسالوں کی خدمت میں صرف ہوتا ہے۔ ان کی مخالفت ہوتی ہے ان کو گالیاں نصیب ہوتی۔ ان پر فتوے صادر کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ یا تو وہ خود مرحوم ہو جاتے ہیں یا ان کے رسالے دم توڑ دیتے ہیں۔ کوئی بڑا ہی سخت جان ہوگا جو ان حملوں کے بعد بھی باقی رہ جائے۔ ان میں ایک نگار بھی ہے۔

میں نگار کو اس سلسلہ کی ایک کڑی سمجھتا ہوں جس میں تہذیب الاخلاق اور مخزن جیسے رسالے شامل ہیں۔ تہذیب اخلاق تو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کا نقیب ہے۔ اس نے اردو میں ہر قسم کے علمی اور تہذیبی موضوعات اور مباحث کی بنا ڈالی اور مضمون نگاری کے فن کو رائج کیا۔ ممکن ہے بعض لوگ تاریخی اعتبار سے سرسید احمد خاں کو اردو کا پہلا مضمون نگار تسلیم نہ کریں اور یہ بھی درست ہے کہ اردو کا پہلا رسالہ ماسٹر رام چندر داس نے خیر خواہ ہند کے نام سے نکالا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود تہذیب الاخلاق اور سرسید کو ان کی حیثیت اور اہمیت سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ سرسید نے اپنے پرچے کے ذریعہ سے زبان و ادب کی خدمت کی۔ اردو کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کرایا جس کی بنیاد سادگی اور ..... گفتگو پر ہے اور جو کسی بھی شائستہ زبان کا علمی اور سنجیدہ طرز ہوتا ہے۔ انہوں نے فی الحقیقت تہذیب اخلاق کی کوشش کی۔ تعصب، جہالت، بحث و تکرار اور تقلید کی بیخ کنی کی۔ روشن خیالی اور آزادئ رائے کے تصورات کو عام کیا۔ سیاسی اور سماجی جمود و تعطل کو توڑا اور ایسے خیالات کا اظہار کیا جس سے بہت سے لوگوں کو اس وقت بھی اختلاف تھا اور آج بھی ہے لیکن ہاں جن لوگوں نے سرسید کی نیت اور خلوص میں شبہ کیا تھا آج تاریخ نے سرسید کو ان الزامات سے بری کر دیا ہے آج ان کی شخصیت ہماری سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی و ادبی دنیا میں ایسی ہے جیسے بونوں کی بستی میں دیو الفیل... حشرات الارض کے مقابلے میں اژدر۔

اردو کے تاریخی رسالوں میں مخزن بھی بطور خاص قابل ذکر ہے، جس نے شیخ عبدالقادر کی ادارت میں انہیں نقوش کو اجاگر کیا جو تہذیب الاخلاق میں پہلی مرتبہ نمودار ہوئے تھے۔ یہ دونوں رسالے صرف رسالے نہیں ایک تحریک ہیں، تہذیب الاخلاق کی تحریک جس میں سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکا اللہ، آزاد، محسن الملک، وقار الملک سب شامل ہیں اور مخزن کی تحریک جس میں عبدالقادر سے اقبال تک کتنے ہی درخشاں نام ملتے ہیں۔ میں نگار کو بھی ایک رسالہ نہیں ایک تحریک سمجھتا ہوں۔

جن لوگوں نے نگار کا باقاعدہ اور مسلسل مطالعہ کیا ہے وہ تائید کریں گے کہ نگار اردو کے علمی رسالوں کی فہرست میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اگرچہ اس میں اعلیٰ درجہ کی غزلیں اور نظمیں، اور کبھی کبھی اچھے افسانے بھی شایع ہوتے ہیں لیکن نگار کی اپنی خصوصیت علمی، تاریخی اور تنقیدی مضامین کا وہ سلسلہ ہے جو سیکڑوں نہیں ہزاروں صفحات میں بکھرا پڑا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس باب میں نگار کا مذاق عامیانہ تو کیا ہوتا عام پسند بھی نہیں خاص پسند بلکہ خاص الخاص پسند ہے اور اس اعتبار سے اس کی مقبولیت کا حلقہ بھی محدود ہے لیکن یہ محدود حصّہ خاصان ادب کا ہے جن کی تحسین اور تنقید دونوں میں وزن اور جان ہے۔ نگار کے مدیر اور اس کے اکثر مضمون نگار اس حیثیت سے واقف نہیں اسلئے شروع سے آج تک نگار کا ایک مستقل معیار اور اس کا اپنا ایک مسلک رہا ہے۔ یہ ایسا پودا نہیں کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اسے جس طرف چاہے جھکا دے۔ چونکہ اکثر لوگوں کو تو اس کی بغاوت اور سرکشی کی شکایت ہے جس کے لئے نیاز اور ان کے مضمون نگار برابر کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔

نگار کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہ مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہے۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہے کہ نیاز صاحب خود اپنے مزاج میں خالص مشرقی ہیں۔ بالخصوص فارسی زبان، شاعری اور اسالیب ان کے اپنے مزاج اور انداز میں ایسے رچ گئے ہیں کہ اب وہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ اردو کے کم رسالے ایسے نکلیں گے جن میں فارسی شاعری اور ادب کی چاشنی یا ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہوگا جتنا کہ

نگار میں لکھا جا چکا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اردو میں غالب کے عجمی مزاج کے قدردان ہیں وہ نگار کی اس خصوصیت کو سب سے زیادہ محسوس کرتے ہیں ۔ اب زمانے کا مذاق بدل چکا ہے ۔ ہماری تہذیب مغرب زدہ ہو کر اپنے اصلی ماخذات اور سرچشموں کو بھولتی جا رہی ہے ۔ فارسی کی تعلیم جو پہلے تہذیب و شائستگی کی ایک علامت تھی انگریزی کے سامنے سپر ڈال چکی ہے اور اس کی بدولت ہماری پوری نسل حافظ کی شیرینی ، سعدی کی فصاحت اور خیام کی سرمستی یا پیر رومی کی حکمت سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہو چکی ہے ۔ یہ بات تعجب کی نہیں ہے کہ اردو کے رسالے اور اخبار جو عوام کے مذاق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اس مشرقی مزاج کے آئینہ دار نہیں رہے ہیں ۔ نگار کا دم اس اعتبار سے بھی غنیمت ہے ۔

نگار کے سلسلہ میں ایک اور اہم پہلو اس کا علمی پہلو ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو نیاز صاحب کے بعض معتقدات اور نظریات سے بنیادی اختلاف ہو اور یہی بات نگار کے بعض اور مضمون نگاروں میں پائی جاتی ہو لیکن اس اختلاف کے باوجود یہ بات قطعی ہے کہ نگار کے مباحث اور موضوعات اور نگار کے مضمون نگاروں کے عام اسلوب میں علمی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے ۔ اس علمی متانت اور سنجیدگی کو قائم رکھنے میں بڑے صبر و استقلال کی ضرورت ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ اردو اخباروں اور رسالوں پر ایک بڑا پر آشوب دور آیا تھا جب مالی اعتبار سے اردو کے اچھے سے اچھے رسالوں کو بڑا خسارہ ہو رہا تھا اور بعض رسالے تو اس بناء پر بند ہی ہو گئے ۔ بعض نے اپنی آمدنی میں اضافہ کے لئے مختلف ذرائع سوچے ۔ اس وقت رسالہ "جامعہ دہلی" اردو کے ممتاز پرچوں میں تھا اور جامعہ ملیہ اور قومی تحریک کا ایک آئینہ دار ہونے کے باعث اچھے پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول تھا جو لوگ جامعہ ملیہ کے ارباب حل و عقد کے سیاسی افکار سے پوری طرح متفق نہ تھے وہ بھی جامعہ دہلی کو پڑھتے اور اس کی سرپرستی کرتے تھے ۔ اس مالی بحران میں جامعہ والوں نے اپنے پرچے میں اشتہار شائع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ بدقسمتی سے جو اشتہارات شائع ہوئے ان میں ایک اشتہار ایک جرمن دوا کا تھا جو مردانہ قوتوں کو بحال کرنے کے لئے ایک کامیاب

دوا بتائی گئی تھی۔ نواب صدر یار جنگ بہادر، حبیب الرحمان خاں صاحب شیروانی بقید حیات تھے۔ انہوں نے یہ اشتہار دیکھا تو بڑے آزردہ ہوئے اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو رسالہ بھیجا کہ اب جامعہ کے بھی یہ دن آگئے۔ اور یہ اشتہار آنا بند کر دیا گیا۔ حالانکہ ایک بات اس اشتہار کے سلسلہ میں اور تھی، جو صاحب اس کے تقسیم کنندہ تھے وہ جامعہ کے بڑے حامیوں میں تھے اور اپنی آمدنی کا بڑا حصّہ جامعہ کی مدد کے لئے دیتے تھے۔ یہ بات بڑی تعریف کی ہے کہ نگار نے اس باب میں اپنے مسلک میں راسخ رہ کر ایک اچھی روایت کو استحکام بخشا ہے ورنہ آج اردو کے بہت سے رسالوں کو پڑھ کر جہاں افسانوں، غزلوں اور نظموں کے مطالعہ سے ایک مریضانہ ذہنیت اور بیمار سماج کا احساس ہوتا ہے وہاں ان ہی رسالوں میں جنسی بیماریوں کے علاج اور دواؤں کے اشتہارات کی کثرت سے پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس ملک میں ہر شخص امراض خبیثہ میں مبتلا ہے یا نہیں ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور ہوگا۔ اس اعتبار سے اردو کے چند ہی رسالے ایسے ہیں جنہوں نے ایک صحت مند روش اختیار کی ہے۔ نگار اس فہرست میں شامل ہے۔

اردو اخباروں اور رسالوں کے باب میں ایک عام شکایت یہ رہی اور کسی حد تک اکثر و بیشتر رسالوں کے بارے میں اب بھی ہے کہ ان کی علمی اور ذہنی سطح بہت پست بلکہ کبھی کبھی عامیانہ ہو جاتی ہے۔ تہذیب الاخلاق یا مخزن نے اردو رسالوں کے لئے جو بلند معیار قائم کیا ہے اسے چند ہی رسالے نباہ سکے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ اوّل تو اس ملک میں خواندگی شرح ہی بہت کم ہے اور پھر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد تو اور بھی کم ہے اور بد قسمتی سے یہ طبقہ بھی انگریزی کا دلدادہ رہا ہے۔ اگرچہ ان کو اپنی دوسری ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں میں اس کا موقع ہی بہت کم ملتا ہے کہ وہ کتابیں اور رسالے پڑھیں اور اگر پڑھنے کے لئے وقت ملے بھی تو یہ انگریزی کے اخباروں اور رسالوں کی سرپرستی کرتے ہیں اور قدرتی طور پر اردو رسالے نکالنے والے عام قارئین کی طرف توجہ کرتے اور اُن کے مذاق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ سرسیّد نے علمی، ادبی تاریخی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل پر غور و فکر کی جو روایت قائم کی تھی۔

تہذیب الاخلاق اس کا آئینہ تھا، جن لوگوں نے نگار کے پرچوں کا مطالعہ کیا ہے انھیں نگار میں ایسی ہی جھلکیاں نظر آتی ہیں، بعض لوگوں کو نیاز کے مسلک اور بعض معاملات میں ان کے خیالات اور معتقدات سے اتفاق نہ ہوگا۔ سر سیّد سے بھی بعض لوگوں کو اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نگار نے اور خاص طور پر نیاز صاحب نے آزادیٔ فکر و نظر اور آزادیٔ گفتار و قلم کی ایک صحت مند اور جرأت مندانہ روایت کو پروان چڑھایا ہے۔ جس معاشرے میں جہالت عام ہو، تعصب اور کوتاہ نظری پر لوگ فخر کرتے ہوں، روایت پرستی جہاں جزو ایمان سمجھی جائے وہاں ایسی روایت قائم کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں۔

کسی معاشرے کی ذہنی صحت مندی کا ایک اندازہ لوگوں میں تحقیق و تلاش کے شوق و ذوق سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ اس اعتبار سے ہماری زبان و ادب کے سرمایے کا بڑا حصّہ ہمارے ذہنی افلاس کا مرثیہ خواں ہے۔ میں تخلیقی ادب کی حیثیت اور اہمیت کا منکر نہیں۔ اعلیٰ درجے کے اشعار کی تخلیق میں فنکار کا جو خونِ جگر صرف ہوتا ہے میں وہ بھی جانتا ہوں۔ اسی طرح اعلیٰ درجے کے ناول اور افسانے یا اچھے ڈرامے کی تخلیق بھی قابل تعریف و تحسین ہے۔ لیکن جو لوگ اکثر فخریہ کہتے ہیں کہ چائے کی ایک پیالی سامنے رکھ کر وہ افسانہ لکھ ڈالتے ہیں اور پیالی ختم ہونے تک افسانہ بھی تکمیل کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ جیسا افسانہ لکھتے ہیں ظاہر ہے۔ تحقیق کے مراحل بڑے صبر آزما ہوتے ہیں۔ "کاٹا اور لے دوڑے" یہاں نہیں چلتا... اس لئے اگر کسی کتاب یا رسالے میں ادبی علمی یا تاریخی تحقیق و تلاش کا مذاق نظر آتا ہے تو اسے ایک صحرائے لق و دق میں نخلستان سمجھنا چاہئے اور نگار کو اردو کے رسالوں میں یہ امتیاز ضرور حاصل رہا ہے اور اس کے لئے نیاز صاحب کی اپنی تحریریں بھی ایک حد تک ذمّہ دار ہیں۔

اگرچہ اخباروں اور رسالوں کے مضامین مستقل تصانیف کے مقابلے میں بہت جلد فراموش ہو جاتے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض مضامین اس قابل

ہوتے ہیں کہ انھیں محفوظ کیا جائے، نگارؔ نے اپنی زندگی میں ایسے بے شمار مضامین شایع کئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اب تک نگارؔ میں شایع ہونے والے مضامین کا کوئی مکمل اشاریہ بھی شایع نہیں ہوا ہے۔ ورنہ اس سے اندازہ ہوتا کہ ادبِ چیزوں کو چھوڑ کر اردو شاعری اور تنقید کے موضوعات پر ہی نگارؔ میں ایسے بلند پایہ مقالات شایع ہوئے ہیں جن کی اہمیت اور حیثیت مستقل تصانیف کی ہے۔ اگر ایسے مضامین سے انتخابِ نگار مرتب ہو جائے تو اردو پڑھنے والوں کے لئے ایک یادگار تالیف ہوگی

ڈاکٹر محمّد حسن

نیازؔ کا ادبی مرتبہ

نیازؔ فتح پوری کی شخصیت خاصی متنوع اور رنگا رنگ رہی ہے۔ بعض لوگ انہیں ایک باغی ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں جس نے تنگ نظری اور کٹھ ملائیت کے خلاف زبردست جہاد کیا بعض لوگ انہیں ایک ایسے انشاپرداز کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کی نثر میں جادو ہوا کرتا تھا۔ کچھ سمجھتے تھے اور کچھ نہیں سمجھتے تھے، مگر واہ واہ اکثر کی زبان سے نکل جایا کرتی تھی بعض ان کو شہاب کی سرگزشت اور شاعر کا انجام لکھنے والے اس رومانی ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کے کردار حسن کے پرستار اور جس کی ہیروئن حسن و ذہانت کا لاجواب مجموعہ ہوا کرتی تھی۔ بعض انہیں اس تنقید نگار کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں جو بڑے بڑے شاعروں پر استفہامیئے قائم کرتا اور کلاسیکی شعراء کی اپنے انداز سے چھان پھٹک کرتا رہتا ہے۔

نیازؔ فتح پوری ان تمام حیثیتوں کی بنا پر ہمارے لئے لائق توجہ ہیں اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے تفصیلی مقالے کی ضرورت ہے۔ جدید اردو ادب میں جو تین سب سے زیادہ معرکۃ الآرا اور اختلافی شخصیتیں گزری ہیں ان میں یگانہ کے بعد اور منٹو سے پہلے نیازؔ کا نام آتا ہے۔ نیازؔ آزاد خیال تھے اور آزاد خیالی کے جوش میں انہوں نے مذہب کے روایتی تصور پر گہری نظر ڈالی اخلاقیات کی روشنی میں عقائد و رسوم کو پرکھا اور ایک نئے اعتزال کی بنیاد ڈالی۔ نیاز نے کبھی اپنے مسلمان ہونے سے انکار نہیں کیا مگر اسلام کا ایک نیا عقلی اور کسی قدر ذاتی تصور پیش کرنے کا اصرار کیا۔ یہ کوشش نئی نہیں تھی اس سے قبل سرسیّد احمد خاں

قرآن مجید کی نئی تفسیر لکھ چکے تھے اور اپنے طور پر اجتہاد و اعتزال کے دروازے کھول چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ نیاز کا تصورِ مذہب زیادہ اور زیادہ جدید اور زیادہ آزاد خیالی پر مبنی تصور تھا۔ نیاز نے اسلام کو رد نہیں کیا البتہ اسلام کو بیسویں صدی کی نظروں سے پرکھا اور اسے مذہب سے زیادہ نظامِ اخلاق گردانا

نگار ایک مدت تک سارے آزاد خیالوں کا محبوب رسالہ بنا رہا اس کے ملاحظات میں ایک دھار دار تیزی تھی، اس میں انوکھی شگفتگی تھی اسے شاہراہ عام پر چلنا گوارا نہ تھا وہ ہر قدم پر رک کر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتا تھا وہ قدیم طرز فکر پر شک کرتا تھا وہ عزم و جرأت اور خود اعتمادی کے نئے باب وا کرتا تھا اس لئے نوجوانوں کو یہ البیلاپن عزیز تھا۔ گو وہ جانتے تھے کہ یہ بحثیں جب تک خود مذہب کے دائرے کے اندر رہ کر کی جائیں گی ان کی حیثیت علم کلام کی کوشش سے زیادہ نہ ہوگی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نیاز صاحب اپنی تمام "جدیدیت" کے باوجود مشرقی مزاج رکھتے ہیں اور وہ مذہبی مباحث گرمئ بازار کے لئے زیادہ چھیڑتے ہیں اور ان سے واقعی مذہب کے غلط تصور سے ٹکرانا مقصود نہیں ہوتا۔ نیاز نے ان مباحث میں اکثر اعمال اور معاملات دنیوی پر عبادات و رسوم کی پابندی سے زیادہ زور دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اخلاقیات کو مذہب پر فوقیت دیتے ہیں وہ اپنے اس نئے تصور کو لے کر بہت دور تک نہیں گئے اس لئے نہ وہ تصوف تک پہنچے نہ کمیونزم تک۔

رسالوں نے اکثر ادبی دنیا میں نئی تحریکوں کو جنم دیا ہے خود اردو میں تہذیب الاخلاق، مخزن، نیا ادب کی مثالیں موجود ہیں۔ نگار کوئی نئی تحریک پیش نہ کر سکا مگر لکھنے والوں کی کئی نسلیں نگار کے زیر اثر پروان چڑھی ہیں۔ نگار کی روایت آزاد خیالی اور احساس جمال کی روایت تھی۔ ایک حیثیت سے نگار تہذیب الاخلاق کا تتمہ تھا اور دوسری حیثیت سے اس پر اضافہ۔

اضافے ہر طرح کے ہوتے ہیں کچھ سے ترقی کے قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اور منزلیں روشن تر ہو جاتی ہیں کچھ منزل کو اور بھی دور کر دیتے ہیں مگر بعض نئی راہیں

ضرور کھول دیتے ہیں گویا بہ یک وقت وہ اضافہ بھی ہوتے ہیں اور ترمیم بھی نگار نے تہذیب الاخلاق کی معتزلہ روایت اور آزاد خیالی کی لے کو آگے بڑھایا۔ یہی نہیں جس طرح سرسید اور ان کے رفقا کی یہ کوشش تھی کہ ہمارے ادب کو مغربی فکر و دانش ادب اور فن کی روش پر چلایا جائے اس کو بھی نگار نے اپنے طور پر انجام دیا۔ لیکن سرسید نے جس سلیس اور سادہ نثر کو رواج بخشا تھا اسے نیاز نے مرصع اور رنگین بنا دیا۔ انہوں نے مختصر افسانے بھی لکھے اور طویل مختصر بھی افسانے لکھے مگر ان میں نہ سرسید کے رفقا کی طرح سماجی افادیت کا جوش تھا نہ سادگی۔ انہوں نے علمی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے استفسارات و جوابات بھی مگر ان سب میں مقصدیت کا وہ آہنگ موجود نہیں جو سرسید کی تحریک کی نشانی ہے۔

لازمی طور پر بات نیاز کے طرز بیان تک پہنچتی ہے۔ اسلوب دادا دراصل مضمون و معنی کے تابع ہوتے ہیں اور مضمون اور اسلوب دونوں لکھنے والے کی شخصیت کے شخصیت کیا ہے اور اس کا ادب سے کیا تعلق ہے یہ بحث طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ شخصیت فکر جذبے اور عمل کا مجموعہ ہے اور ادب شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے اور اظہار سے گریز کا بھی۔ یہ ذات کا آئینہ بھی ہے اور پردہ بھی۔ نیاز کی پرورش ٹھیٹھ مشرقی ماحول میں ہوئی۔ عربی، فارسی کی متداولہ کتابیں منقولات و معقولات، مذہبیات اور اخلاقیات کی بنیادوں پر ان کے علم و فضل کی تعمیر ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی جرأت مندی نے انہیں تشکیک کے راستے پر ڈال دیا اور وہ آزاد خیالی کے کوچے میں نکل آئے۔ اس لحاظ سے بھی وہ سرسید اور ان کے رفقا کی طرح مشرق کے ذریعہ سے مغرب تک پہنچے مگر نیاز کا مغرب سرسید سے مختلف تھا۔ سرسید کا مغرب برطانیہ اور وہ بھی وکٹوریہ کے عہد کے برطانیہ تک محدود ہے۔ نیاز کا مغرب آسکر وائلڈ کے برطانیہ سے درس نمو پاتا ہے اور فرانس کی رومانی نفاست تک پہنچتا ہے سرسید کا سارا زور تعقل اور اخلاقیات پر تھا۔ نیاز کا سارا زور احساس جمال پر۔ ایک سادگی کا رسیا تھا دوسرا رنگینی کا ایک کو سلاست عزیز ہے دوسرے کو آراستگی۔

نیاز کے طرز و اسلوب کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس کی تاریخی اہمیت سے کون انکار کرے گا۔ مگر تاریخ ایک عمل ہے وہ اہم سے اہم سنگ میل کو بھی پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ ان میں نیاز کی جگمگاتی انشا پردازی بھی ہے جس میں جادو ہے مگر توانائی نہیں، سیرابِ رنگ و نور ہے گہرائی اور عظمت نہیں، رنگینی ہے ملاحت نہیں، اچھی نثر کا بنیادی معیار ہی یہ ہے کہ اس میں سلاست ہو ربط و تسلسل ہو۔ وہ آئینہ نہ ہو کہ اس کے حسن میں نگاہیں الجھ کر رہ جائیں، شیشہ ہو جس سے نگاہیں پار ہو کر اس مفہوم تک پہنچ سکیں جو اس کے ذریعہ سے ادا ہوا ہو۔ نیاز کی نثر رعنائی جمال کا پیکر ہے، رعنائی فکر کا نہیں اس لئے وہ اپنی ساری رنگ آمیزی کے باوجود گزرے ہوئے کل کی یادگار ہے، آنے والے کل کا نشان نہیں ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سادہ اور سلیس نثر تہذیب کا تحفہ ہے اور قوموں کو بتدریج اور حسب توفیق ملتا ہے۔ اردو نثر کے تاریخی سفر میں ایک ایسی منزل آئی تھی جب وہ رنگین و پرکاری کا شکار ہوئی۔ یوں تو آج بھی ہمارے ذمہ دار اور سنجیدہ ادیبوں میں ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے جو اچھی نثر نگاری کی مثالیں محمد حسین آزاد اور ابو الکلام آزاد کی تصانیف سے پیش کرتے ہیں اور انھیں معیاری اسلوب سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی سلاست اور سادگی خارجیت واقعیت نثر کو صرف فکر کی ہمہ جہتی کے قابل بنایا تھا جذبے کی قوت اور توانائی سے اس نئی نثر کا آبگینہ اب بھی پگھلا جاتا تھا۔ ہماری نثر میں جمالیاتی احساس کی کمی تھی۔ نیاز اور ان سے کچھ پہلے یلدرم اور مہدی افادی نے نثر کی اس فنی صلاحیت کو پہچانا، نثر میں بھی مصوری کی جا سکتی ہے اس سے بھی نقاشی اور مرصع کاری ممکن ہے۔ آرائش در و بام کا کام بھی لیا جا سکتا ہے یہ دراصل سرسید اور ان کے رفقاء کی حد سے بڑھی ہوئی اخلاق پرستی اور اصلاح پسندی کا ردعمل تھا جس طرح وکٹورین دور کی اخلاق پرستی اور سماجی افادیت کے تصور نے ادب برائے ادب کا ردعمل پیدا کیا اسی طرح اردو ادیب اخلاق سے عورت کی طرف تعقل سے احساس جمال کی طرف مائل ہوئے اور نثر دھیرے دھیرے غزل بن گئی۔

نیاز کی نثر نگاری کی خصوصیات ان کے انشائیہ مضامین اور طویل مختصر افسانوں میں نمایاں ہوئی ہیں۔ ان میں اپج یا طبعزاد انداز کم ہے۔ مغربی اسالیب کو پیش نظر رکھ کر اردو ادب میں ویسی جمالیاتی آہنگ اور رومانی خروش پیدا کرنے کی سعی البتہ واضح طور پر ملتی ہے۔ یہ کام کسی محقق کا ہے کہ وہ ان صاحبان طرز کا پتہ لگائے جن سے نیاز نے اثر قبول کیا ہے۔ دو باتیں البتہ یقین سے کہی جا سکتی ہیں ایک یہ کہ نیاز کے فکر و اسلوب میں جمالیات پرستوں اور نورومانی ادیبوں کی جذبات اور گھن گرج موجود ہے اور دوسرے یہ کہ نیاز کی رنگینی اور مرصع کاری ظہوری اور رجب علی سرور کے انداز بیان سے مختلف تھی۔ ایک شاعر کا انجام" کے دیباچے میں نیاز نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"یہ نہ تو مذاق پیشین رکھنے کا مدعی ہے کہ قافیہ پیمائی آپ تلاش کریں اور نہ موجودہ ناول طرازی کا ہم آہنگ کہ ضلع جگت اور غزلیات کی آپ کو جستجو ہو۔ نہ آپ اس میں اشعار پائیں گے اور نہ عامیانہ زبان مگر ہاں اس میں کلام نہیں کہ اگر اس افسانے کو آپ نے ایک نگاہ درد مند اور دل مبتلا کے معیار سے دیکھا تو میری وارفتہ نوائی کی داد ضرور مل جائے گی ایک باب کا تسلسل بھی دوسرے باب سے کم پائیے گا لیکن معاف فرمائیے نم پروردہ اشک ہوں مجھے تو موتی کچھ بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ عبارت ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی۔ حالی اور شبلی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اور یہ دونوں سادہ زبان کے بادشاہ تھے۔ شرر اور رسوا کے ناول اس زمانے میں مقبول ہو چکے تھے اور ان کی روانی سلاست اور تازگی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نیاز کے اسلوب میں اس کی سلاست اور روانی کا شائبہ تک نہیں البتہ اس عبارت میں فارسی تراکیب کی کثرت جمالیاتی ذوق اور خود فراموشی اور حسن پرستی میں محویت کا انداز نمایاں طور پر ملتا ہے۔ افسانہ درد پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور جذبات کی زبان کو عقل کے مربوط استدلال پر ترجیح دی گئی ہے۔

پہلے تراکیب پر غور کیجئے۔ مذاقِ پشیمیں، افسانۂ دل، نگاہِ درد مند، دلِ مبتلا، وارفتہ نوائی، نم پرورۂ اشک ان میں بعض صفت اور موصوف کا مجموعہ ہیں اور بعض میں ایک حاسہ کی خصوصیت کو دوسرے حاسہ کے لوازم یا آلہ کا سے متعلق کیا گیا ہے۔ اس قسم کی تراکیب لاتعداد مثال کے طور پر ان کے مضمون "برسات" میں نظر سے گزریں گی۔ جہاں رنگ کی موسیقی اور اجالے کی موسیقی تاریکی کی سرگوشی اور آواز کے شعلوں کا ذکر ملے گا۔ آرٹ کے مختلف شعبوں میں بنیادی وحدت کا یہ احساس ان کی ندرتِ احساس کا ایک پہلو ہے۔ وہ حسن کے بارے میں تقریباً اسی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں صوفیہ ہمہ اوست کے نظریئے کے ذریعے سے پہنچے ہیں۔ یعنی حسن ہر جگہ ہے اور ہر شے اور ہر منظر میں جلوہ گر ہے صرف اسے دیکھنے کے لئے آنکھ چاہئے اور اس سے لطف لینے کے لئے حسن پرست اور احساس آشنا دل، البتہ فرق اتنا ہے کہ حسن نیاز کے ہاں بہت کچھ محسوساتی ہے وہ ماورائیت تک بھی محض احساس کے ذریعے تک ہی پہنچتے ہیں۔

نیاز نے حسن پرستی کو مذہب کی سطح تک پہنچا دیا ہے ان کے ہاں حسن کا حسین تصور اور عشق کا افلاطونی اور ماورائی تصور دونوں ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت ایک "بے غرض انہماک" کا نام ہے اور اگر محبت کرنے والا محبوب سے ملنا چاہتا ہے تو وہ حقیقتاً محبت نہیں ہے بلکہ ایک جذبۂ شہوانی ہے لیکن فراقِ مسلسل کے اس افلاطونی تصور کے باوجود نیاز حسن کو خالص حسین روپ میں دیکھتے ہیں۔ فطری مناظر میں بھی ان کا تصورِ حسن بڑی حد تک مرئی اشیاء کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے ان کے ہاں حسن وہ اعلیٰ پاکیزہ غیر جسمانی اور ماورائی تصور نہیں ہے جو مثلاً ٹیگور کے یہاں ملتا ہے۔ اس اعتبار سے حسن پرستی کے معاملے میں نیاز کی حیثیت کچھ ایسی ہے جیسے غم پرستی کے سلسلے میں میر کے مقابلے میں فانی کی ہے۔ میر خود روتے ہیں فانی رونے کی تلقین کرتے ہیں اسے ایک فلسفہ کی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ نیاز حسن کو دیکھ کر "خود فراموش محویت" کی تلقین زیادہ کرتے ہیں محو کم کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں درد اور نزاکت احساس کم ہے

درد کی عظمت کا ذکر اور اس کا پرشکوہ اعلان زیادہ ہے۔ ان کا طرزِ ترکیب اور استعارے کا ہے اور تراکیب اور استعارے پرشکوہ الفاظ محاکات سے ڈھالے گئے ہیں۔ ان میں سادگی کم آرائش زیادہ ہے۔ بے ساختگی کم کاری گری زیادہ ہے اس لئے ان کا طرز مرعوب کرتا ہے متاثر نہیں کرتا۔ آرائشِ در و بام میں اصل عبارت کو گم کر دیتا ہے۔

نیازؔ کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے وقت تاریخی پس منظر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ نیازؔ نے اسوقت حسن کاری اور حسن پرستی کی آواز بلند کی تھی جب اردو نثر جمالیاتی حسن سے محروم ہوتی جا رہی تھی لیکن یہ وقت کی چیز ہوتے ہوئے ہر وقت اور ہر زمانے کی چیز نہیں ہے اب اس کی تاریخی ضرورت پوری ہو گئی اس سے بعض نئی راہیں کھلیں ہمارے افسانے میں جذبے کی لہک احساس کی مستی اور اندازِ بیان کی سجاوٹ پیدا ہوئی وفورِ جذبات رونما ہوا رومانی خود فراموشی حسن پرستی اور محاکاتی رنگ آیا مگر اس کے باوجود آج بھی ادب کا طالب علم اس طرزِ تحریر کا جائزہ لے گا تو اسے ماضی ہی کے خانے میں جگہ دے گا اس سے اخذِ نور اور اکتسابِ فیض حاصل کرنے کی ہمت نہ کرے گا۔

جہاں تک نیازؔ کے افسانوں کے پلاٹ اور کردار نگاری کا تعلق ہے ان کو بھی معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ ایک نقاد نے مختصر اردو افسانہ نگاری کا بانی پریم چند اور یلدرم اور اس کے بعد نیازؔ کو بتایا ہے۔ پریم چند کی روایت نیاز سے ہوتی ہوئی آگے بڑھی اس نے جمالیات پر زور دیا اور زبان کی آراستگی بیان کی شعریت اور فلسفیانہ آہنگ کو اختیار کیا۔ نیازؔ کے افسانوں . . . اور مضامین . . . . کو جمالیاتی تجربوں کی حیثیت دینا چاہیئے۔ ان میں نہ واقعہ پوری طرح مربوط اور مرتب ہوتا ہے نہ کردار جیتے جاگتے اور منفرد ہوتے ہیں نہ نقطۂ عروج کا واضح تصور ملتا ہے۔ مگر ان میں ایک مضطرب اور متجسس ذہن ضرور ملتا ہے جو نئی تصویروں اور مختلف رنگ و آہنگ کے مجموعوں سے کیف حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے ان کے کردار یا تو مردہ ہیں یا خود نیازؔ کی شخصیت کا روپ ہیں۔ ان کے جسم سوتے ہیں صرف ذہن بیدار ہیں وہ احساس کی بات کرتے ہیں

مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف ان کی ذہانت ان کی پوری شخصیت پر مستول رہتی ہے انکے ہیرو ہیروئن سے محبت نہیں کرتے ۔ اس کے تصور سے یا یوں کہئے کہ محبت میں مبتلا ہونے کے خیال یا حسن پر جان دینے کے دھیان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اگر وہ شہید ہوتے ہیں تو محبوبہ کے ناز و غمزے کے نہیں ہوتے بلکہ اس مجرد اور موہوم تصورِ محبت کے نام پر شہید ہوتے ہیں جس کے پردے میں انہوں نے زندگی بھر اپنی اور اپنے ذوق خود نمائی کی پرستش کی ہے ۔ اس لئے ان کے کردار سب کے سب خود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہیں گویا "پرائی آگ میں جلنا ہے کار مردانہ" اُن کے ہیرو ہمیشہ غیر متوازن حد تک ذہین اور عظیم شخصیتوں کے مالک ہیں جو خود ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی وہ شہاب ثاقب کی طرح آسمان سے ٹوٹتی ہیں اور دور دور تک نور کی ایک لکیر بناتی گزر جاتی ہے ۔

نیاز کو ایسے کرداروں سے محبت ہے ۔ وہ عالم استفہام کے راہی ہیں ۔ وہ صرف نئے سوالوں کے جویا ہیں ان میں سے سب کا جواب خود ان کے پاس بھی نہیں ہے لیکن جرأت سوال ہی ہماری رٗوایت پرست سماج میں بڑی نعمت ہے اس اعتبار سے دو عظیم فن کاروں سے نیاز کی ذہنی اور فکری مماثلت کا دھیان آتا ہے ایک بیدل اور دوسرا آسکر وائلڈ ۔ بیدل کے بارے میں یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ وہ مشکل پسند اور کس قدر "چیستاں گو" شاعر تھا اس کا تخیل ناہموار اور ناشناس راہوں پر دوڑتا ہے وہ مجرد تصورات کو مرئی شکلوں میں ڈھالتا اور کیفیات سے نئے استعارے تراشتا ہے معنی آفرینی اور خیال بندی کا بادشاہ ہے ۔ اور خیال کی ندرت اور باریک بینی کی فکر میں تجسس اور تفکر کی نئی راہیں نکالتا ہے ۔ نیاز کے پاس بیدل کا سا بے کراں تخیل نہیں ہے لیکن استعاروں کی تراش خراش کیفیاتِ حس کے باہمی ارتباط و انتقال اور جرأت فکر میں وہ بیدل سے متاثر ضرور ہیں اس لئے ان کی نثر میں وہی استعاراتی کیفیت آرائش دشوار پسندی اور بوجھل پن جھلکتا ہے ۔

وائلڈ لفظوں کا صیاد ہے اور قولِ محال سے ایک جہان معنی پیدا کر دیتا ہے

وائلڈ کی سی شگفتگی سادگی اور ہلکا پن نیاز کو نہیں ملا مگر جمالیاتی احساس پر اس قدر زور نیاز کے ہاں غالباً وہیں سے آیا ہے۔ حسن کا تصور نیاز کے ہاں بھی کسی قدر مجرّد اور غیر افادی ہے اس کے پیچھے سماجی ذمہ داری کا کوئی احساس جلوہ گر نہیں ہے وہ بھی فنون لطیفہ کو ایک مدت تک من کی موج اور حسن کے پیدا کردہ احساس سپردگی کا نام سمجھتے رہے ہیں۔ یہ کیفیت ان کے مضامین میں جلوہ گر رہی ہے۔

انشا پرداز کی حیثیت سے بھی نیاز کا ایک تاریخی مقام ہے۔ ان کی انشا پردازی غالب اور سرسید کی کھلی ڈلی شخصیت کی غماز نہیں ہے بلکہ ایک شمشیر خوش غلاف ہے جس کی کاٹ بے پناہ نہ سہی مگر اس کے غلاف کی سجاوٹ مسحور کن ہے۔ نیاز سجے سجائے جملوں اور تصویروں کے عادی ہیں اس لئے ان کے مضامین . . . اور مکاتیب بھی . . . ان کے ڈرائنگ روم ہیں گھر کا آنگن نہیں ہیں۔ وہ بے ساختہ اور بے جھجک ملنے کے عادی نہیں۔ وہ کبھی اپنی شخصیت کو بے محابا اور بے غلاف پیش نہیں کرتے وہ اپنے ڈرائنگ روم میں "تہمد اور بنیان پہن کر" کسی کا استقبال نہیں کرتے اور یہ نفاست شائستگی اور آراستگی جزو فن ہے۔ وہ ایک ایسے شیری کی زندگی ہر لمحے گزارتے ہیں جس نے اپنے کو خوبصورتی کی بارگاہ سے منسوب کر دیا ہے اس لئے بڑے پُر کیف اور دلچسپ ہونے کے باوجود ان کے مضامین بے ساختگی سے محروم ہیں۔ وہ ایک ایسی نقاب کی مانند ہیں جس کے پیچھے چھپنے والا ہنوز آرائش جمال سے فارغ نہیں ہوا ہے۔ البتہ وہ تخیل کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو ان کا پیکر تراش ذہن نئے نئے مجسمے ڈھالتا نئی دنیائیں سجاتا اور نئی نئی کہانیاں سناتا گزرتا ہے۔

نیاز کے مضامین ایک سنبھلے ہوئے مگر آزاد خیال ادیب کی تخلیق ہیں۔ ان میں توازن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ نیاز کی شخصیت اور ان کے آرٹ دونوں میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ کبھی احساس کی نذر نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ مجاز یا منٹو نہیں بنے نیاز رہے۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ کس جگہ پر رک جانا ضروری ہوتا ہے۔ مگر بغاوت کے جوش میں بھی وہ کبھی اس سبق کو فراموش نہیں کرتے۔ نیاز نے روایت

پرستی کے جمود کو للکارا۔ جھوٹے پندار اور نقلی زہد کے جبّہ و دستار اتار پھینکے عقلیت کا مذاق بھی اڑایا شہری تمدن اور اس کے کاروباری اور میکانکی انداز زندگی پر طنز بھی کیا مگر وہ کبھی باغی کا سا ابال اور جوش جنوں کی سی وارفتگی کا شکار نہ ہوئے اس لئے ان کے مضامین میں تخیل کا نکھار ہے مگر جوش جنوں کی سرمستی نہیں ہے البتہ تخیل کی فراوانی اور انداز بیان کی دل فریبی کے اعتبار سے ان کے مضامین کی ایک تاریخی حیثیت برقرار رہے گی۔

مگر دونوں حیثیتوں سے بڑی حیثیت مدیر نگار کی ہے۔ نگار نے اردو ادب کی مشاطگی میں ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کی کئی نوعیتیں ہیں۔ ایک اس اعتبار سے کہ نگار نے ہمارے یہاں کے ادبی پرچوں کو علمی مذاق سے آشنا کیا اور پڑھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر دیا جو محض چٹخارے کے لئے چند افسانوں یا غزلوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر دنیا کی موجودہ صورت حال اور اس کے مبلغ علم کے مختلف شعبوں سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ ایک طرف ملاحظات میں عصری سیاست کا جائزہ لیا گیا دوسری طرف استفسارات و جوابات کے دائرے میں ہر قسم کے علمی اور فکری مسائل چھیڑے گئے پھر اسی رسالے کے صفحات مذہبیات تاریخ، اقتصادیات، علم فراست الید، علم تحریر، بھاشا کی شاعری، شہوانیت تک کے مسائل و موضوعات کے لئے وقف رہے۔ اس نے نئی فکری وسعت پیدا کی اور اردو والوں کو ایک کائناتی نگاہ دی۔ اس وسعت نگاہ کا اہتمام اس سے قبل بہت کم رسالوں سے ہو سکا تھا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ نگار نے ہمیشہ کلاسیکی شعرا کی طرف بھی توجہ کی۔ نگار کے خاص نمبر آج تک خاص اہمیت کے مستحق ہیں۔ مصحفی نمبر، نظیر نمبر، اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان شماروں نے ایسے مشاہیر کی طرف ہماری توجہ مرکوز کر دی جنہیں تاریخ ادب میں مناسب مقام نہیں ملا تھا۔ یہ نمبر حرف آخر نہیں تھے مگر انہوں نے تحقیق و تنقید کے سلسلے میں ایک تحریک پیدا کر دی اس سلسلے کی

ایک کڑی خود نیازؔ کا ذوق تنقید ہے ۔جس کا نمایاں طور پر اظہار مالہٗ وما علیہ کے سلسلے میں ہوتا رہا ہے ۔

نیازؔ کی تنقید نگاری اصول تنقید سے متعلق کم ہے اور عملی تنقید سے متعلق زیادہ ان کا مذاق شعر بنیادی طور پر غزل کا پروردہ ہے ۔ وہ نظم میں بھی تغزل کے زیادہ قائل ہیں ۔نظم نگاری کے سلسلے میں جوشؔ اور علی اختر کے درمیان اُنکا محاکمہ بھی اس کی نظیر ہے ۔ اقبال کی فن کاری کو پوری طرح تسلیم نہ کرنے میں بھی یہی زاویۂ نگاہ کارفرما ہے ،نیازؔ کی تنقید کو منطق کی اصطلاح میں DEDCTIVE کہنا چاہیئے وہ پہلے شعر پر غور کرتے ہیں پھر اس کی معنوی اور لفظی خوبیوں سے سلسلہ وار نتائج نکالتے ہیں ۔ وہ نفس مضمون سے زیادہ انداز بیان کے قائل ہیں اور انداز بیان کی نزاکتوں اور بندشوں میں انھیں لطف آتا ہے اسی لئے وہ باستثنائے میر اردو کے سب شعرائے کے دواوین میں سے صرف دیوان مومن کو انتخاب کر لینے پر آمادہ ہیں ۔

نیازؔ کی تنقید شعر سے شروع ہوتی ہے اور انداز بیان کی لطافت کے تجزیئے پر ختم ہوتی ہے ۔ وہ عام طور پر نہ تحقیق پر زیادہ زور دیتے ہیں نہ نفس مضمون کے سماجی اور فکری پس منظر پر ۔ ہاں شعر فہمی اور سخن سنجی ان کے ہاں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔کہیں کہیں وہ اسلوب کے تجزیئے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تنقید نگاری کے سانچے کو لازمی طور پر قدیم قرار دیا جاتا ہے ۔ نیازؔ تراکیب الفاظ کے برمحل اور صحیح استعمال اور حسن ادا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس لئے ان کی تنقید میں اکثر زبان کی خامیوں تراکیب کی ناہمواری کا ذکر اور ان کی گرفت بھی ملتی ہے لیکن بنیادی طور پر نیاز کیفیت کے قائل ہیں اور یہ کیفیت ایک طرح کی پراسرار جمالیاتی احساس کا نام ہے اسی لئے ان کی تنقید میں جمالیاتی ناز آفرینی کی کوشش زیادہ ملتی ہے اور سائنٹفک انداز نظر کم ۔ ان کی تنقید کا مقصد قاری کو دوبارہ اس کیفیت سے گزارنا ہوتا ہے جو تخلیق کے وقت خود اصل مصنف پر گزری ہو گی ۔فرق صرف یہ ہے کہ باز آفرینی کے اس عمل میں وہ نفسیات اور

سماجیات سے اس قدر کام نہیں لیتے جتنا کہ خود علم بیان اور اصول فصاحت سے لیتے ہیں۔

ان کی تنقید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام تر تاثراتی اور غیر متوازن نہیں ہے۔ انشائیہ اور افسانے میں جو رومانیت اور شعریت پرستی بلکہ تغزل پرستی کا میلان ملتا ہے وہ تنقید میں تاثراتی رنگ اختیار نہیں کرتا اس میں وہ شدت کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ انھیں شوخ رنگوں سے زیادہ پیچیدگی اور ترچھا تیکھا انداز پسند آتا ہے بشرطیکہ وہ قدیم طرز تغزل کے دائرے میں ہو۔ اسی لئے انھیں بیدل اور مومن پسند ہیں۔ تنقید میں نیاز کا دائرہ کمال محدود ہے مگر اس میں ان کا کھرا ذوق تغزل اور جمالیاتی کیفیت کی رمز شناسی کا کھلاڈلا انداز صاف جھلکتا ہے۔

جدید اردو ادب کی آرائش و زیبائش میں نیاز کا کیا مقام ہے نیاز کی تخلیقی صلاحیتیں بے پناہ ہیں اور ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ابھی ان کے قلم سے اور کس قدر اہم کارنامے وجود میں آئیں گے اور ان کی روشنی میں انکا ادبی مرتبہ کس حد تک بلند اور ارفع ہوگا۔ ہر اردو دوست کی یہی خواہش ہے کہ انھیں عمر کی درازی اور صحت کی سلامتی تا دیر میسر رہے اور وہ اردو ادب کی آبیاری پوری سرگرمی اور تندہی سے کرتے رہیں لیکن اب تک ان کی تخلیقات کی روشنی میں ان کے ادبی مرتبہ کا تعین کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نیاز ہمارے ادب میں آزاد خیال اور آراستگی بیان کے علمبردار ہیں وہ ہماری نثر کے معیاروں میں ایک ممتاز درجے پر فائز ہیں ظاہر ہے کہ "چراغ راہ ہیں منزل نہیں ہیں'' اور اردو نثر کا قافلہ ان سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کا احساس خود ان کو بھی ہے اس لئے خود نیاز کے طرز میں تبدیلی ہوئی ہے۔ ادھر انھوں نے آراستگی کو کم کیا ہے مگر عربی اور فارسی کی نامانوس تراکیب سے لگاؤ کی وجہ سے اب بھی ان کی نثر کو سلیس نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ انہوں نے اردو دنیا میں جرأت فکر کے چراغ جلائے۔ ہمارے لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے ذہن کی تربیت کے علوم و فنون نے نئے ذخائر فراہم

کر کے کلاسیکی ادب کا نیا شعور پیدا کیا اور قدیم وجدید ذہن کا ایک ایسا امتزاج پیدا کیا جس نے نئی نسل کی پرداخت اور نشوونما میں مدد دی۔

آزاد خیالی کی ہمارے یہاں بڑی اہمیت ہے۔ادب میں نئے سوتے کھولنے کے لئے روایت کے سنگ گراں کو ہٹانا ہی پڑتا ہے۔اس لئے نیاز نے مذہب اور اخلاق کی سطح پر جس آزاد خیالی کا علم بلند کیا وہ نہایت قابل قدر ہے یہ عجیب بات ہے کہ سرسیّد نے جس اعتزال واجتہاد کی روایت کی بنیاد ڈالی ہے اسکو آگے بڑھانے میں نیاز کا نام لیا جاسکتا ہے گو نیاز کی آزاد خیالی سرسیّد سے قطعی مختلف تھی اور سرسیّد نے ادبی روایت میں سلاست سادگی اور روانی کا جو سرچشمہ لا کر ملا دیا تھا اس کی تراش خراش نیاز کے ہاتھوں نہ ہوئی۔آج کل کی نسل کو نیاز سے یہی جرأت فکر سیکھنا ہے۔ان کی نثر نگاری آراستگی زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہے گی مگر ان کی شخصیت زمانے کو یہ بات ضرور یاد دلاتی رہے گی کہ تجسس اور تشکیک، حقیقت اور صداقت کی دریافت کے لئے ناگزیر راستے ہیں اور گوہر آبدار انہیں کے ہاتھ آتا ہے جو ان پرخطر راستوں پر چلتے ہیں اور ان پرپیچ منزلوں سے گزرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

نیاز کے اِنتقادی خیالات

شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں مشہور بات ہے لیکن اگر شاعر اس نظریے پر بھروسہ کر کے شعر کہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ یہ "مالہ وماعلیہ" کے پیش نظر کے ابتدائی الفاظ ہیں اور انہیں چھبیس الفاظ کے اندر نیاز کا پورا نظریۂ تنقید سمایا ہوا ہے۔ "شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں"۔ مشہور بات تو ہے ہی لیکن کیا یہ درست بات بھی ہے۔ نیاز نے اس کی تردید کی ہے۔ گویا نیاز کے نزدیک شاعر کا پیدا ہوتا تسلیم۔ مگر کیا پیدا ہونے کے بعد خود بخود بن بھی جاتا ہے اس خیال سے نیاز کو اتفاق نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے۔ شاعری یا ادب ایک فطری ملکہ سہی مگر اس کو صحیح طور سے بروئے کار لانے کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت کی بھی ضرورت ہے:

مالہ وماعلیہ کے سب مندرجات سے اتفاق کرنا مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی مگر اتنا واضح ہے کہ ان مندرجات میں جو تنقیدی عمل یا طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ انتقاد کے ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جس کی خاص اہمیت ہے مگر اسے عام طور سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ تصور ہے زبان کی صحت اور بیان کی بلاغت کا مسئلہ۔

بعض لوگ زبان کی صحت کے مسئلے کو لفظی حرف گیری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ خیال صحیح نہیں۔ ادب اور تحریر کی ہر قسم میں زبان کی صحت کی بڑی اہمیت ہے بلکہ ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ غور کیجئے تو صاف ظاہر ہوگا کہ کوئی ادبی

تحریر اپنے اظہار و ابلاغ میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے وسائل اظہار بلیغ اور کامیاب نہیں ہو پاتے اور ادب کا واحد وسیلہ اظہار زبان و بیان ہے۔ کیا کسی نے ایسا کوئی مصوّر دیکھا ہے جو اپنے رنگوں کی صحیح ترتیب و ترکیب کے بغیر کامیاب تصویر بنانے کا مدعی ہوا ہے۔ اور اگر ایسا کوئی ہے تو وہ یقیناً ژولید گیِ تصور کا مریض ہے۔ یہی حال شاعری اور ادب کا ہے کہ اس میں زبان و بیان کی بلاغت کے بغیر کامیاب نظم یا نثر لکھنے کا دعویٰ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو پتنگ اُڑانے کا عادی ہے مگر ڈور کے بغیر۔

اُردو تنقید میں نیاز کی حیثیت منفرد ہے۔ اور اس انفرادیت کی بنیاد خاص یہی لفظیاتی تنقید ہے۔ لیکن لفظیاتی تنقید ایک مغالطہ انگیز ترکیب ہے۔ اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ نیاز شاعری اور ادب میں لفظوں کو معنی کے روابط سے آزاد سمجھتے ہیں۔ اور تجربہ و اظہار کی جداگانہ ہستی کے قائل ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں اور صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ نیاز کا مسلک یہ ہے کہ ہر تجربے کی یہ تقدیر ہے کہ وہ اپنے لئے صحیح قالب اظہار اختیار کرے اور اگر کسی تجربے کو صحیح قالب اظہار نہیں ملتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر کو وسائلِ اظہار یعنی زبان و بیان پر قدرت نہیں۔ پس نیاز الفاظ اور زبان و بیان کو کوئی منقطع اور مستقل چیز نہیں سمجھتے۔ صحت زبان و بیان پر ان کا اصرار اس وجہ سے ہے کہ اس کے بغیر تجربے کا صحیح اظہار ممکن ہی نہیں۔"

معلوم نہیں یہ غلط خیال کس نے پھیلا دیا ہے کہ شاعری زبان و بیان پر قدرت کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ رویہ شاید جنگِ عظیم اوّل کے بعد پیدا ہوا جب کہ ایک طرف ذہنی افراتفری اور فکری انار کی کو رواج ہوا۔ اور دوسری طرف ہمارے ادباء ریاضت اور محنت سے جی چرانے لگے اور ان کے نزدیک وہ تربیت ضروری نہ رہی جو قدما کے نزدیک بنیادی بات تھی۔ اعتقادی افراتفری کے موجودہ دَور میں شاید یہ خیال کسی کی سمجھ میں نہ آسکے گا مگر یہ امر واقعہ ہے کہ لفظی

عروضی، سمرقندی' نے (چہار مقالہ میں) یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شاعری کی تکمیل کے لئے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ یہ ساری ریاضت اس لئے لازمی سمجھی گئی کہ شاعری کے آرزومند کو زبان وبیان کے کامیاب اور موثر سانچوں اور وسیلوں کا علم ہوجائے اور تجربے کے اظہار کی راہ میں زبان وبیان مزاحم ہوجائے کیونکہ زبان وبیان کے معاملے میں عجز یا بے احتیاطی یا سہل انگاری کی وجہ سے فطری شاعر بھی تجربے کے صحیح اظہار سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ مالہ وماعلیہ کے ہر مضمون میں اس قسم کی ناکامیوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور ان میں اکثر فی الواقعہ ایسی ہیں جن کی وجہ سے بعض بڑے شاعروں کی شاعری بھی کمزور نظر آنے لگتی ہے۔ اس کا سبب ان شاعروں کی سہل انگاری ہے۔ یا یہ وہم کہ شاعر چونکہ تلمیذ ربانی ہے اس لئے جو کچھ اس کے قلم سے نکلا سب الہام ہے۔ اس کی نوک پلک درست کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سارا ادبی الحاد دراصل بعض مشاعرہ باز اور کم فرصت شاعروں یا ان کے بے فن شاگردوں کا پھیلایا ہوا ہے۔ اگر یہ کوئی اصول ہوتا تو فن پرستوں کو ایک مصرع تر کے لئے سیروں لہو خشک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔

ایک عجیب وغریب مغالطہ یہ بھی ہے کہ شعر محض اشاروں سے مرتب ہوتا ہے اور ان اشاروں کی مدد سے قاری کا تخیل خود بخود تجربے کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ چلئے یہ بھی سہی۔ مگر اشاروں کے لئے "نارسا" ہونا کیوں ضروری سمجھ لیا جائے۔ اگر شاعری اشاروں ہی کا نام ہے تو اس صورت میں بھی یہ لازمی ہے کہ اشارے بلیغ اور "رسا" ہوں۔ ورنہ شاعر کا تجربہ یا خیال اشاروں کے ابہام میں الجھ کر ابلاغ کی خدمت سے قاصر رہے گا۔ زبان کی غلطی اور بیان کی پیچیدگیاں نہ اشاروں کی مددگار ہوسکتی نہ شاعری کی غمگسار۔ یہ تو دونوں کے لئے نیم جان اور خطرۂ ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔

اور اگر سوچا جائے تو لفظی یا لسانی سہل نگاری کا یہ عذر کچھ زیادہ قابلِ سماعت بھی نہیں کیونکہ اشاراتی اندازِ بیان اپنے اختصار و ایما کے باوجود زبان و

بیان کی کمزوری سے پاک ہوتا ہے ۔ اس میں اور ایک عام اندازِ بیان میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ جہاں عام اندازِ بیان تجربے کی ساری اہم جزئیات فطری ترتیب کیساتھ پیش کرتا ہے وہاں اشاراتی بیان ۔ تجربے کی بعض جزئیات کو ترک کر دیتا ہے۔ مگر فطری ترتیب اور فطری اسلوب اظہار کو وہ بھی مدِنظر رکھتا ہے ۔

مثال کے طور پر جگر کے درج ذیل شعر کو لیجئے (جس پر رسالہ وما علیہ میں نیاز نے بھی تنقید کی ہے) اس میں بیان کی اشاریت کا تو خیر جو حال ہے شعر فطری اسلوبِ اظہار ہی سے انحراف کرتا نظر آتا ہے ۔

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گذرے بے نقاب
دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

نیاز نے شعر کے مصرعۂ ثانی کو ناکام قرار دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مصرعہ ثانی مافی الضمیر کے اظہار میں بالکل ناکام ہے کیونکہ اس کا اسلوبِ اظہار غیر فطری ہے ۔ ایسے تسامحات کو شاعر کی الہامی بے ساختگی کہنا۔ الہام کا منہ چڑانا ہے ۔ اور اگر نیاز نے اپنی معاصر شاعری کو اس بگڑی ہوئی الہامیت سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ تو یہ ان کے ذوقِ صحیح اور سلامت مزاج کی علامت ہے ۔

فرض کیجئے کہ شاعری میں آزاد اور بے ساختہ اظہار (Automatism) کو ایک آئینی مسلک قرار دے دیا جائے تو بھی بات نہیں بنتی کیونکہ اس صورت میں شاعر کے ارادہ ومقصد کا سوال سامنے آجاتا ہے ۔ شاعری میں اس قسم کی بے ساختگی کو روا رکھنے والے لوگ زندگی میں ربط۔ تنظیم اور ترتیب کے عنصر ہی کو ضروری نہیں سمجھتے ۔ لہٰذا وہ کچھ فرمائیں فرماتے جائیں۔ ان کو نہ صلے کی تمنا نہ ستائش کی پروا۔ وہ تو اپنے لئے لکھتے ہیں۔ کسی قاری کے نہ منتظر ہیں نہ آرزومند۔ مگر کیا تاویل میں پڑھائے جانے والی غزلوں اور نظموں میں بھی غیر فطری اسلوبِ اظہار چل سکتا ہے یا جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اچھی نظم کے لئے کامیاب وسیلۂ اظہار ناگزیر ہے اور اچھی غزل کے لئے تو فطری اسلوب اور بھی

لازمی ہے کیونکہ اس میں ایما اظہار کی وسعتوں کو پہلے ہی سے سمیٹ کر مختصر کرچکا ہوتا ہے ۔ اس پر ناقص اور غیر فطری پیرایہ ہائے بیان کا بھی اگر اضافہ ہو جائے تو غزل ژولیدہ بیانی کا مظاہرہ بن جاتی ہے ۔

غرض نیاز نے بگڑے شاعروں پر یا اچھے شاعروں کے بگڑے ہوئے اشعار کا تجزیہ کر کے ادبی ذوق کی صحیح رہنمائی کی ہے ۔ البتہ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن میں نیاز کے تصورات کچھ اُلجھے اُلجھے معلوم ہوتے ہیں ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ نیاز اپنے بنیادی طریق انتقاد سے ہٹ کر جب اصول و نظریات وضع کرتے گئے ہیں تو اس سے اکثر موقعوں پر پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ مثلاً نیاز نے مالہٗ و ماعلیہ کے مختصر سے پیش لفظ میں علم اور شاعری کے روابط کا اشارۃً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "کہا جاتا ہے کہ فطری شاعر کا لکھا پڑھا ہونا ضروری نہیں لیکن اگر ایسا شخص فطری شاعر بھی ہے اور لکھا پڑھا بھی تو اُسے جاہل فطری شاعر سے یقیناً بہتر ہونا چاہیئے" ۔ عام طور سے تو نیاز کے اس بیان پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں لیکن اس کو بطور قاعدہ کلیہ تسلیم کرنا مشکل ہے کیوں کہ اچھی شاعری کے علم سے بطور خاص کوئی تعلق نہیں ۔

اس سے یہ مقصد نہیں کہ شاعری کے لئے جہالت ضروری ہے ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی استعداد اصطلاحی اور اکتسابی علم کی قید سے بے نیاز ہے ۔ ایک لحاظ سے شاعری خود ایک علم ہے مگر یہ علم وہ ہے جس کا تعلق مشاہدۂ کائنات اور تمدنی تجربوں سے ہے نہ کہ کتابوں سے ۔

اُردو فارسی میں شاعری کے لئے علم کو اس وجہ سے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ان زبانوں میں شاعری کرنے والے کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے لئے یہ دونوں اکتسابی زبانیں ہیں ۔ اس بنا پر زبان کے ذخیرے تک پہنچنے کے لئے ایسے شاعروں کو تحصیل واکتساب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔

اگر غرض شاعری کے علم سے ہے تو اس علم کا ماخذ علم کے ماخذ سے بالکل مختلف ہیں یعنی مشاہدۂ کائنات اور تمدنی تجربہ ۔ شاعر کا عمل عالم کے عمل سے مختلف

اور اس کے استعداد کا دائرہ بھی اس کے دائرۂ استعداد سے مختلف! پڑھا لکھا ہونا کوئی بڑی بات نہیں اور مہذب سوسائٹی میں پڑھا لکھا ہونا ایک عام سی بات ہے۔ اس لئے کسی شاعر کا پڑھا لکھا ہونا اچنبھے کی بات بھی نہیں۔ مگر شاعری سے اس اکتساب کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ شاعری کوئی عملی چیز نہیں یہ تو محض تخلیقی شے ہے۔

مالہ وماعلیہ میں جو لفظیاتی تنقید کی گئی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کی نارسائی علم کی کمی بیشی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ سہل انگاری سے کام لیتے ہیں ورنہ جگر کی زباں دانی میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اور اگر محض رسمی علم کچھ معنی رکھتا ہے تو پھر جوش (جن کا رسمی علم جگر سے بہتر ہے) کیوں غلطیاں کرتے ہیں۔

میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ نیاز کی تنقیدیں لفظیاتی ہیں مگر ان کے انتقادی کام کی یہ تعریف یا تحدید قدرے ناقص ہے۔ بعض احباب نے نیاز کی تنقید کو جذباتی، رومانی تنقید کہا ہے اور یہ غلط بھی نہیں۔ مگر اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نیاز نے اپنی سب انتقادی تحریروں میں عقلی اصول بندی بھی کی ہے۔ نیاز کو اردو ادب میں رومانیت کی تحریک کا ایک ممتاز رکن خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے تخلیقی ادب اور انتقادی ادب دونوں میں یہ رومانیت در آئی ہے مگر اس کے باوصف وہ اپنے زمانے کے ایک بڑے عقل پسند ادیب بھی ہیں۔

بات کچھ یوں ہے کہ رومانیت یا غیر رومانیت۔ کوئی شے بھی ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی ایک کے مزاج اور اظہار میں ان میں سے صرف ایک ہی رنگ (خالصتاً ایک ہی رنگ بلا شرکتِ غیر) موجود ہو۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض ادیب حیرت انگیز طور پر متضاد رویّوں کے امتزاج کے نمائندہ بن جاتے ہیں۔ فرانس کے ادب میں روسو کی طبیعت کا تجزیہ کیجئے۔ اصلاً وہ حد درجہ رومانی مزاج کا آدمی تھا۔ مگر یہی آشفتہ مزاج شخص جب "معاہدۂ عمرانی" لکھنے بیٹھتا ہے تو اصول بندوں کا گرو معلوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے نیاز کو بھی عقل پسند رومانی کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

نیاز کی تنقیدوں میں مومن کا جائزہ خیال انگیز بھی ہے اور اختلاف انگیز بھی۔

جذباتی اور تاثراتی تنقیدوں کی مصیبت یہ ہے کہ ان میں بحث کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ایسی تنقیدوں میں نقاد یا ناقد اصول پیدی بھی کرتا ہے تو اپنے تاثر کی حاکمیت کے زیرِ اثر۔ یعنی وہ اپنے ہی تاثر کو حکم بلکہ حاکم بنا لیتا ہے اور اس کے احکام کو قابلِ قبول زبان میں پیش کر کے دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کوئی نہیں مانتا تو وہ صاف صاف کہہ دیتا ہے " نہ میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بہ جبر تسلیم کرا سکتے ہیں " من ویزداں " کے مصنف کی یہ چیرہ دستی تنقید آخر تنقید ہے اس میں جبر ہے بھی اور نہیں بھی، مگر اس کا کل فیصلہ ذاتی پسند و ناپسند کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اور اس فیصلے کو مستحکم عقلی اصولوں کی ضرورت ہے۔

مومن کی شاعری پر ذاتی پسند کی بنا پر ایمان لے آنا ناممکن ہے۔ مگر مسلم اصول تنقید کی روشنی میں مومن کو اردو کا سب سے بڑا شاعر کہہ دینا بالکل جدا چیز ہے۔ لیکن نیاز کا اصولیاتی استدلال اتنا زور دار ہوتا ہے کہ ان کی تنقید کو پڑھ کر کچھ دیر کے لئے ان کا ہم نوا ہو جانا پڑتا ہے۔ مجھے کلیاتِ مومن دے دو۔ باقی سب اٹھا لے جاؤ " واقعی مومن بڑا شاعر ہے بہت بڑا شاعر ہے۔ کلیاتِ مومن کے علاوہ باقی سب اٹھا لے جاؤ۔ باقی سب اٹھا لے جاؤ۔

ہم نیاز کے اس دعوے کو تسلیم کر کے آگے بڑھے تو معترض نے کہا۔ اس دعوے کی دلیلیں بھی تو دیکھو اور فکرِ معقول سے ان کا تجزیہ بھی تو کرتے جاؤ۔

دلیلیں یہ ہیں :۔

" کسی خیال پر نقد کرنے کے لئے سب سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اس طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ، " جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔ " اور اس اصول کے مطابق میں مومن کے

کلام پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا۔"

اپنے تاثر پر یہ ناقابلِ شکست اعتمادِ تاثر کی مطلق العنان سلطانی کے آئین سے ملتا جلتا اعتماد ہے۔ لیکن نیاز نے اس کے ہمراہ یہ اصول بھی پیش کیا ہے کہ "سب سے پہلے اصولِ فطرت پر نظر ڈالنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک فطرت کے ساتھ چلا ہے"۔ پس اگر فطرت کو ثالث اور حکم بناتا ہے تو اس صورت میں ہر شے کو سائنس عقلی اور نفسیاتی نتائج کی روشنی میں پیش کرنا لازمی ہوگا۔ کیونکہ فطرت اپنے تجزئے کے لئے ان ہی وسائل کی محتاج ہے اور اس میں تاثر کا حکم اس طرح نہیں چل سکتا جس طرح مندرجۂ بالا اقتباس میں ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔ "کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے"۔

مقصودِ کلام یہ ہے کہ نیاز کی تنقید جذباتی اور تاثراتی ہے مگر نیاز ذہناً عقل پسند آدمی بھی ہیں اس لئے اپنی تاثراتی تنقید کو عقلی اصولوں کے پردے میں چھپا دینا چاہتے ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں تاریخی شعور اور ماحول کے اثرات کا بھی اعتراف پایا جاتا ہے۔ اور بہت سے موقعوں پر وہ شاعر کی شخصیت اور نفسیات سے بھی بحث کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس طرح ملا جلا ہے کہ واضح طور پر انہیں کسی ایک دبستان سے متعلق کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ماسوا اس کے کہ ان کو زبان کے دبستان کا رکنِ اعظم کہہ دیا جائے۔ بہرصورت ان ملی جلی چیزوں کے اندر سے وہ مخصوص طرزِ انتقاد ظہور میں آتا ہے جسے نیاز کا رنگِ خاص کہا جا سکتا ہے۔

شاعری میں صداقت و حقیقت اور اس کے طرزِ اظہار اور اسلوب کے رابطے کی بحث کے بارے میں نیاز کے خیالات قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً انہوں نے فرمایا کہ "شاعری حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے۔ صداقت نہیں بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیرِ بیان کا اختلاف فطرتِ انسانی ہے"۔

ان چند جملوں میں نیاز نے اپنے سب انتقادی مضامین کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری کو جو تحسین نیاز کے مضامین میں ملتی ہے وہ بھی اس نظریے کے زیرِ اثر ہے۔ یعنی ان کے نزدیک حُسنِ خارجی حقیقت سے عبارت ہے اور ادب اور شاعری اور جملہ فنون کی آبرو ان کے طرزِ اظہار سے قائم ہے معانی جو کچھ بھی ہوں ہوا کریں اصل شے ان معانی کا طریق اظہار ہے۔ معانی کے مقابلے میں حسنِ ظاہری پر اصرار لکھنؤ کے ادبی تصورات کے عین مطابق ہے۔ نیاز کے یہاں لکھنؤیت کی حمایت اور طرزِ لکھنؤ کی تحسین کو جو صورتیں ملتی ہیں وہ اسی نظریے کی وجہ سے ہیں یا طرزِ لکھنؤ کی تحسین کی خاطر یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نیاز اپنی آزاد تنقیدوں میں غیر شعوری طور پر معنی اور حُسنِ الفاظ کے فاصلوں کو مٹانے پر بھی اصرار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو ان کی ساری لفظیاتی تنقید بے کار ہو جاتی ہے۔ دلیل یہ کہ زبان کی نارسائی کا شکوہ پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ شاعر کا اصل مقصد بعض تجربات یا معانی کا اظہار تھا جس میں ادیب و شاعر کو اس لئے ناکامی ہوئی کہ وہ معانی سے کامل مطابقت رکھنے والے معنی خیز الفاظ نہ لا سکا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعری بذاتِ خود ایک ایسی حقیقت ہے جس میں معانی اور ان کے اظہار کا اسلوب باہم ملا ہوا ہوتا ہے۔ شاعر کے پیشِ نظر بعض جذباتی سچائیاں ہوتی ہیں جن کا حقائقِ عقلی کے مطابق ہونا ضروری نہیں یہی جذباتی سچائیاں شاعری کے قماش کا جزولاینفک ہیں۔ اظہار اور تعبیر کو ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

میں مضمون کے آغاز میں عرض کر چکا ہوں کہ نیاز اُردو انتقاد کی تاریخ میں امتیازی مقام رکھتے ہیں اور ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے "ناتمام" اور "نارسا" شاعری میں سخت گرفت کی ہے۔ انہوں نے اس سہل انگاری کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے جو شاعر کو اس کے فن کے بارے میں کام چور بنا دیتی ہے۔ شاعری کے چمن میں "سبزۂ بیگانہ" کی نمود نیاز کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور "سبزۂ بیگانہ" سے مراد وہ کمزوری

بے ساختگی ہے جو شاعر کو اپنے کلام پر نظرِ ثانی سے روکتی ہے۔ میرے خیال میں نیاز نے بھونڈی شاعری کے خلاف آواز بلند کر کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسی طرح نیاز کا یہ بھی احسان ہے کہ انہوں نے دلبستانِ دہلی لکھنؤ کے تقابلی مطالعہ میں توازن پیدا کیا اور یہ بتایا کہ لکھنؤ اپنی سب کمزوریوں کے باوجود ادبی حُسن وجمال کے بعض خاص تصورات رکھتا تھا جن میں سے بعض کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ادب میں وضع داری کا سوال۔ یا ادب میں خوش پوشی کی اہمیت جس سے مراد فقط یہ ہے کہ ادب کے لباس یعنی زبان وبیان کو بہر حال حسین ہونا چاہیئے۔ نیاز نے زبان وبیان کے حُسن پر بھی زور دیا ہے اور زبان وبیان کی بلاغت اور "رسائی" پر بھی۔ انہوں نے اپنی تنقیدوں میں بعض اور مسائل بھی چھیڑے ہیں مگر شعر فہمی کو نیاز کے نقادانہ مرتبے کی اصل بنیاد مانتا ہوں۔

پروفیسر وقار عظیم

رومانی افسانہ اور نیاز

(دو طویل افسانوں کے حوالے سے)

مختصر افسانے کی طرح مختصر ناول بھی اردو میں بیسویں صدی کے بالکل شروع میں آیا اور مختصر افسانے کی طرح اس کی فنی روایت کی داغ بیل بھی رومان کی فضاؤں میں رکھی گئی۔ پریم چند جو ہماری افسانوی دنیا کے سب سے بڑے حقیقت نگار ہیں جب افسانے سے خدمت وطن کا کام لیتے ہیں تو رومان کی وادیوں میں گلگشت کرتے ہیں اور سجاد حیدر یلدرم جو رومانی تصورات کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھنے والے قصہ گو ہیں جب اپنے مسلک کی تلقین و تبلیغ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو افسانے کے بام و در کی تزئین رومانی تخیل کے رنگوں سے کرتے ہیں اور نیاز فتح پوری جب پریم چند کی داستان نما کہانیوں اور سجاد حیدر کے شعر آگین افسانوں سے الگ ہٹ کر کہانی کی اس صنف کا تجربہ شروع کرتے ہیں جسے ہم نے آگے چل کر ناولٹ یا مختصر ناول کے نام سے جانا پہچانا تو وہ بھی اپنے قصوں کے سارے خد و خال کی آرائش و زیبائش میں رومان کے نازک موقلم سے ہی کام لیتے ہیں اور یوں مختصر ناول کی فنی روایت کا آغاز اردو میں رومانی تخیل کی سربراہی اور سرکردگی میں ہوتا ہے۔

نیاز فتح پوری نے اپنے دونوں مختصر ناول، شاعر کا انجام اور شہاب کی سرگزشت ایسے زمانے میں لکھے جب ہندوستانی معاشرہ مغربی تعلیم، مغربی معاشرت اور دونوں کے لائے ہوئے اثرات کو آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ نئی تعلیم کے اثر نے نوجوانوں کے مزاج میں ایک نئی طرح کی وارفتگی پیدا کی تھی۔ ان کے فکر و تخیل میں فلسفہ و شعر کی ملی جلی

کیفیتیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ حالت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کی تبدیلیاں ہر گھڑی زندگی کے رخ سے پردے اٹھا کر ایک نیا جلوہ دکھاتی اور نظر کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کرتی ہیں۔ ذہن ان نت نئے جلوؤں کے معنےٰ سمجھنے اور ان کی تاویلیں کرنے میں مصروف ہے اور کبھی فلسفے اور کبھی شعر کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ افرا تفری کے اس عالم میں فلسفہ اور شعر کبھی ایک دوسرے کے ہم نوا بن جاتے ہیں اور کبھی باہم برسرپیکار نظر آتے ہیں اور اس جنگ میں نقصان فلسفے کو سہنا پڑتا ہے کہ اس کی منطق یا تو الجھ کر رہ جاتی ہے یا شعر کے جذباتی جوش اور زور کے آگے سپر ڈال دیتی ہے اور بعض صورتوں میں ایک ایسا فلسفہ جنم لیتا ہے جس کی حدیں شعر سے ملتی ہیں اور جس کی منطق فکر کے بجائے جذبے کی پروردہ ہوتی ہے اور جس کی تاویلات، توجیہات اور نتائج پر ذہن کی نہیں دل کی لگائی ہوئی مہر ثبت ہوتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے یہ دونوں ناولٹ جہانِ افسانہ میں بہترین ناولٹ اس بدلتے ہوئے ماحول کے بہترین مرقعے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بہترین اس اعتبار سے کہ ان دونوں مختصر ناولوں میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ اس بدلتے ہوئے ماحول کے خارجی پہلوؤں کی مصوری کرنے کے بجائے اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے۔ ان دونوں کہانیوں میں چلنے پھرنے والے کردار حقیقت کی دنیا کے کردار نظر آنے کے باوجود خیال کی دنیا میں رہتے بستے سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اور ان کے عمل اور ردِ عمل کے پیچھے ایک ایسا فلسفہ کام کرتا نظر آتا ہے جس کی تشکیل و تعمیر فکر سے زیادہ جذبے کی مرہونِ منت ہے۔

"شاعر کا انجام" کا ہیرو افضال اور شہاب کی سرگزشت کا میر قصہ شہاب بعض باتوں میں منفرد شخصیتوں کے حامل ہونے کے باوجود بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں کہ ان کی سیرتوں کی بنیاد میں ایک ایسے ماحول کے اثرات شامل ہیں جو محسوس کرنے اور متاثر ہونے والے

مزاجوں میں اضطراب پیدا کرتا ہے۔ یہ اضطراب کسی کو مسلسل تڑپاتا اور
بے قرار رکھتا ہے اور یہ تڑپ اور بے قراری اظہار کے نئے نئے راستے تلاش
اور خلق کرتی ہے اور اس طرح عارضی سکون کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔
کبھی کبھی یہ اضطراب التہاب بن کر رگ و پے میں سما جاتا ہے اور جسم و جان اس کی
گرمی سے پگھلنے لگتے ہیں۔ ضبط سے اس کی آگ میں اور تیزی پیدا ہوتی ہے
اور آہوں کا دھواں پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور کبھی یوں
ہوتا ہے کہ یہ اضطراب کا التہاب اور اس کی گرمی کی لپٹ اور لپک صرف آنسوؤں
کے پانی سے کم ہوتی ہے اور مضطرب طبیعتیں اسی کو اپنے سوزِ غم کا مداوا بناتی ہیں
افضال اور شہاب کے علاوہ "شہاب کی سرگزشت" کے کردار محمود، اختر،
اور سکینہ طبیعتوں کے اسی اضطراب کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں اور "شاعر کا انجام"
کے کرداروں میں رقیہ اسی اضطراب کا مجسمہ ہے۔

"شہاب کی سرگزشت" کے سرورق پر یہ مختصر عبارت لکھی ہوئی ہے:-

(ابتدائی بیسویں صدی کا معجزۂ ادب)

حضرت نیاز کا وہ طویل افسانہ جو مطالعۂ جزئیات اور
تجزیۂ کردار کے اصول پر سب سے پہلی بار اردو میں لکھا گیا اور جو اپنی
تخیل کی نزاکت کے لحاظ سے سحرِ حلال کا درجہ رکھتی ہے"

اور "شاعر کا انجام" میں تہدیہ کی عبارت کے علاوہ گزارش
کے عنوان سے لکھی ہوئی ایک عبارت شامل ہے۔

تہدیہ

تقاضائے مصلحت تو یہ تھا کہ میں ان اوراق کو کسی معزز وجوہ
کے ساتھ منسوب کرتا اور اسی کے پر شوکت نام کو ان کا عنوان
بناتا لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ جنونِ خراش، یہ ہذیانِ محبت
دولت کے نزدیک خراشِ سامعہ نہ ثابت ہو، اس لئے

اے دلِ دیوانہ

تیرے نالہائے شکستہ، تیرے پارہ ہائے آہ، تیرے ہی ساز بے خودی کے سامنے پیش کرتا ہوں، خدا کرے یہ عرضِ نغمہ تیری ہستیٔ تمام کے حضور میں خجلت کا دش نہ ثابت ہو۔ اور اس کے بعد

گزارش

اس مجموعۂ اوراق کو جسے اب بھی پریشان سمجھتا ہوں، اس نگاہ سے نہ دیکھئے گا جس نگاہ سے آپ نے، اس وقت تک دیگر قصص وحکایات کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ یہ، نہ تو مذاق پیش کرنے کا مدعی ہے کہ قافیہ پیمائی آپ تلاش کریں اور نہ موجودہ ناول طرازی کا ہم آہنگ کہ ضلع جگت اور غزلیات کی آپ کو جستجو ہو۔ نہ آپ اس میں اشعار پائیں گے اور نہ عامیانہ زبان مگر ہاں اس میں کلام نہیں کہ اگر اس افسانۂ درد کو آپ نے ایک نگاہِ دردمند اور دلِ مبتلا کے معیار سے دیکھا تو میری وارفتہ نوائی کی داد ضرور مل جائے گی۔ ایک باب کا تسلسل بھی دوسرے باب سے ذرا کم پائیے گا۔ لیکن معاف فرمائیے، نم پروردۂ اشک ہوں، مجھے تو موتی کچھ بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں

غالباً دوران مطالعہ میں، نوائے ترکیب، لطافتِ بیان پاکیزگیٔ خیال آپ ہر جگہ پائیں گے، اور یہی میرا ذوقِ حدیث ہے۔ اگر جناب کی نگاہ میں یہ آشفتہ بیانی محمود سمجھی گئی تو میں اس کا دوسرا حصّہ بھی پیش کر سکوں گا، ورنہ میری یہی پرفشانیٔ حسرات کیا کم ہے!!

شہاب کی سرگزشت کو ابتدائی بیسویں صدی کا "معجزۂ ادب" کہا گیا ہے اور "مطالعۂ جزئیات"، "تجزیۂ کردار" اور "تخیل کی نزاکت" کو اس کی اہم خصوصیات بتایا گیا ہے۔ بلکہ پہلی دو خصوصیتوں سے زیادہ زور تیسری خصوصیت پر دیا گیا ہے کہ اسی کی بدولت اس میں سحرِ حلال کی تاثیر پیدا ہوئی ہے۔

"ایک شاعر کا انجام" کے متعلق جس تفصیل سے باتیں کہی گئی ہیں۔ وہ نیاز کے فنی مسلک کی زیادہ واضح نشان دہی کرتی ہیں۔ تمہید، میں "جنون فروشی" اور "ہذیانِ محبت" کے علاوہ "نالہائے شکستہ" "پارہ ہائے آہ" "سازِ بے خودی" "عرضِ نغمہ" اور "ہستی متالم" کی ترکیبیں معنی خیز ہیں۔

گزارش، میں اس "افسانۂ درد" کو "نگاہِ دردمند" اور "دلِ مبتلا" کے معیار سے جانچنے کی دعوت دے کر "وارفتہ نوائی" کی داد چاہی گئی ہے۔ ایک باب اور دوسرے باب میں تسلسل کی کمی کی معذرت اس بنا پر کی گئی ہے کہ "غم پروردۂ اشک" کو موتی بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کی خصوصیتوں کے سلسلے میں نوائے ترکیب، لطافتِ بیان اور پاکیزگیٔ خیال کو اپنے "ذوقِ حدیث" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"شہاب کی سرگزشت"، کو تخیل کی نزاکت نے سحر حلال بنایا ہے اور "شاعر کا انجام" میں نوائے ترکیب، لطافت بیان اور پاکیزگیٔ خیال کو آشفتہ بیانی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور یوں اِن دونوں کتابوں کی قدرِ مشترک اس کا ایک خاص قسم کا طرزِ بیان ہے جس کی بنیاد تخیل کی نزاکت اور پاکیزگیٔ خیال پر ہے، وارفتہ نوائی، جنون فروشی، ہذیان محبت، سازِ بے خودی اور عرض نغمہ کی ترکیبیں بھی براہِ راست یا بالواسطہ بیان کے اسلوب کے بعض رخوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ "نالہائے شکستہ"، "پارہ ہائے آہ"، "ہستی متالم"، "افسانۂ درد"، "نگاہِ دردمند"، اور "غم پروردۂ عشق"، میں سوچنے اور محسوس کرنے کے جس انداز کا عکس ہے، اس میں اور بیان کی ان خصوصیتوں میں جن پر بار بار زور دیا گیا ہے

بڑا قریبی رشتہ ہے اور اس قریبی تعلق سے ان دونوں نئی طرح کی طویل کہانیوں کی فنی ساخت اور ترتیب اور اس کے مختلف اجزاء کی تعمیر و تشکیل اور پھر اس تعمیر، تشکیل، ترتیب اور ساخت و پرداخت کے پیدا ہونے والے مجموعی آہنگ اور تاثیر کی تخلیق ہوئی ہے۔

نیاز فتح پوری نے اپنی دونوں کہانیوں کا تعارف کراتے وقت قاری کو جس طرح کی کہانیاں پڑھنے کی طرف مائل کیا ہے اس کے لئے وہ اپنے قاری سے ایک خاص طرح کی ذہنی اور جذباتی آمادگی کی توقع رکھتے ہیں۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ غم والم کے جس جوش، جنون و محبت کے جس خروش اور درد وکرب کی جس خلش اور اضطراب نے ان افسانوں کی تخلیق کی ہے وہ زندگی کے سفر میں عقل وخرد کی نہیں وارفتگی و شوق کی رہنمائی کا قائل ہے، یہاں فکر کی نہیں احساس کی حکومت ہے۔ یہاں عقل، جنون کی اور ذہن قلب کا تابع رہا ہے۔ اس دُنیا کی منطق دلیلوں کے اساس پر نہیں، شعر و نغمہ کے سوز و گداز کے سہارے مستحکم ہوتی ہے۔ یہاں الم لذت کا سب سے بڑا سرمایہ اور اشک خوں، سکونِ دل کا سب سے مؤثر وسیلہ ہے۔ یہاں نظر صرف حسن کی جستجو کرتی اور اسی کی جستجو میں تڑپتی، تلملاتی، مضطرب رہتی اور یوں اپنی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرتی ہے۔ نیاز کے ان دونوں مختصر ناولوں کی دنیا رومانوں کی زبانوں کی حسین رنگینیوں کی، رومانوں کی حسین رعنائیوں کی، رومانوں کے نشاطِ اضطراب کی اور اس سے بھی بڑھ کر کیف و نغمہ کی اور شاعرانہ تصویروں کی دُنیا ہے۔ اور اس دنیا سے تعلق رکھنے والی ہر چیز۔ اس کے کردار، اس کے واقعات، اس کی فضائیں اور ان کرداروں اور فضاؤں کی ترجمانی اور مصوری کرنے والے الفاظ۔ رومان کے اس گہرے رنگ اور اسی حسین اضطراب سے ہم آہنگ ہے۔

"شاعر کا انجام" کا ہیرو افضال ہر تأثر سے تڑپ جانے والا، ہر حسین شئے پر مٹنے کے لئے آمادہ و منتظر افضال ہے جو حساس شاعر اور فکر آمغنی ہے۔ بیرسٹر کے

شعر دن پر گھنٹوں سر دھنتا ہے، راتوں کو اپنے نشۂ حیات میں مستغرق، "شعر و موسیقی کے عمانِ بے پایاں کی کسی مچھلی" کی طرح اِدھر اُدھر تیرتا پھرتا ہے وہ اپنے جذبات سے عملی لذّت اٹھانے کا شائق ہے۔ یہی جذبات اس پر کبھی یہ کیفیت طاری کرتے ہیں کہ وہ "اپنے سینے سے ایک کاغذ نکال کے چاندنی میں دیکھنے لگتا ہے اور بے اختیار رونا شروع کر دیتا ہے،" "جو ہچکیوں کے سلسلے پر ختم ہو کر" اسے دیوانہ وار پھر آبادی کی راہ بتا دیتا ہے۔ کسی ان دیکھے محبوب کی تحریر نظر کے سامنے آتی ہے تو بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ کبھی "تپش نظارگی" اس کی کشادہ اور متحیر آنکھوں کو مضطرب تخیلات کا محل بنا دیتی ہے۔ کبھی اس کے "حیاتِ تند" اسے ایک ایسا آنسو بنا دیتے ہیں جو نوکِ مژگاں پر ٹھہرا ہوا ہو اور ذرا سی جنبش، خفیف سی ہمدردی جسے منتشر کر دینے کے لئے کافی ہو۔ ہر نئی صبح اس کے جوشِ جنوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی دیوانگی ہی اس کی حیات کی ضامن بنتی ہے اور طبیب اس کے متعلق یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ "اگر وہ کسی وقت ہوش میں آ گیا تو اس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی"۔ . . . افضال کا وجود سرتاپا عاشقانہ ہے لیکن زندگی کے متعلق اس نے فلسفیوں کی طرح سوچا ہے یہ بات اور ہے کہ اس کا فلسفہ فلسفے سے کہیں زیادہ شعر ہے۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں اُس نے کہا تھا کہ :-

> کھلا ہوا پھول نکہت بیز زیادہ ہوتا ہے مگر اس میں، وہ شعریت و موسیقیت کہاں جو غنچۂ ناشگفتہ میں ہے، پھول کھل جانے کے بعد اپنی زندگی کا جلوۂ آخر ہے، مگر غنچہ جس کو انجام دیکھنے کی، آرزو ہوتی ہے، ایک دنیائے اشتیاق ہے اس لئے لطف یہی ہے کہ اس کی لذتیں اپنی ہی نگاہوں کے سامنے منتشر ہوں"

دوسرے طویل افسانے کا ہیرو شہاب نازک و نحیف جسم رکھنے والا،

نوجوان ہے، جس کی ادائیں ہر دل میں گھر کرتی ہیں۔ لفظ شہاب کا مفہوم ہی متانت سنجیدگی، خودداری، رعنائی، ذہانت اور تہذیب قرار پایا ہے۔ نقاشی و مصوری اس کے محبوب ترین مشاغل ہیں۔ اس کے نزدیک کتاب سے زیادہ ساکت بات کرنے والا اور صفحۂ تصویر سے زیادہ خاموش مخاطب کوئی نہیں۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اضطراب اور اُس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس اضطراب کا ترجمان ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ احساس یہ ہے کہ جو نگاہوں کی التجاؤں کو نہیں سمجھتا اس کے سامنے زبان کو شرمندۂ تکلم نہ کرو۔" اس کا ذوقِ نظر کسی ایسی چیز کی جستجو میں مضطرب اور بے قرار ہے کہ وہ مل جائے تو وہ اپنا دلِ خون کر دے۔ اس کے فلسفے نے اُسے یہ شاعرانہ تعلیم دی ہے کہ "آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے اور لطف کا حقیقی راز صرف خلش ہے۔" وہ اپنے عزیز دوست کو خلش کی اس لذّت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے تو اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے :-

> تم طلوع و غروب کے مناظر دیکھو اور ان میں بالکل جذب ہو جاؤ۔ تم ایک پھول کو شاخ پر جھومتا ہوا دیکھو اور کائنات کو فراموش کر دو۔ تم ایک خشک پتّی کو دیکھو اور خزاں کی ساری کیفیات اپنے اوپر طاری کر لو۔ تم ایک سبز گھاس کا تنکا دیکھو اور بہار کے اثرات کو اپنی روح میں منتقل کر لو تم پانی کو دیکھو اور تڑپو، چاند کو دیکھو اور بے قرار ہو جاؤ، یہاں تک کہ . . تمہاری ہر نظر تمہارے لئے ایک دفترِ جذبات ہو جائے اور تم اپنے وجود کو بالکل بھول جاؤ۔"

طلوع و غروب کے مناظر میں جذب ہو جانا، اپنے اوپر خزاں کی ساری کیفیتیں طاری کر لینا۔ بہار کے اثرات کو اپنی روح میں منتقل کر لینا، پانی کو دیکھ کر تڑپنا اور چاند کو دیکھ کر بے قرار ہو جانا، ہر نظر کو اپنے لئے دفترِ جذبات بنا لینا اپنے اوپر خود فراموشی طاری کرنے اور اپنے وجود کو بھول جانے یا کسی حسن کے

رنگ دلو میں جذب اور فنا کردینے کا دوسرا نام ہے۔ یہ فلسفہ شہاب کا نہیں، نیاز کا ہے اور اس لئے نیاز کے دونوں ناولوں کے کم و بیش ہر کردار کا عملی فلسفہ ہے۔ نیاز کے یہ سب کردار اپنے اپنے انداز میں ایک دوسرے سے الگ اور اس لئے منفرد شخصیتوں، سیرتوں اور مزاجوں کے حامل ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بھول جانے، فنا کردینے یا کسی چیز کی خاطر مرمٹنے کو اپنی زندگی کا آخری مقصد اور نصب العین جانتے ہیں۔ اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے آمادہ و تیار دکھائی دیتے ہیں! ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے اور اپنے سفر کی منزل آخر تک پہنچنے میں ہر طرح کی صعوبت جھیلنے کے لئے۔ سفر کی صعوبتوں میں ان کے لئے ایک ایسی لذت ہے جو زندگی کی کسی اور چیز میں نہیں۔ اس لئے وہ ان صعوبتوں کی طرف پوری بے تابی، بے قراری اور بے صبری سے بڑھتے ہیں۔ ان کا شوقِ فراواں، ان کی رفتار میں تیزی پیدا کرتا ہے۔ ان کے عمل اور ردِ عمل کی نوعیت اضطراری بن جاتی ہے۔ انھیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا اور اس بے اختیاری میں ان سے ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں جن کا عام حالات میں کوئی جواز تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کے تاثرات ہمیشہ شدید ہوتے ہیں۔ اور ان کا جو عکس ان کے قول و فعل پر پڑتا ہے۔ ان کی نوعیت بھی ہمیشہ شدید ہوتی ہے۔ ہیجان، تڑپ، تپش، بے تابی ان کی طبیعتوں کا معمول ہے جو قدم قدم پہ ظاہر ہوتا اور کہانی کی فضا کو متاثر کرتا ہے۔

شہاب کی سرگزشت، کی حسین و جمیل" اختر" مایوس ہوتی ہے تو اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں" اضطراب ختم ہو کر سکون میں تبدیل ہونے لگتا ہے —— زندگی کے ایک مرحلے پر" بے انتہا حزن و ملال کہیں شدید ترین اشتعال (وہ اشتعال جو ایک انسان میں نہایت ہی خطرناک جذبۂ انتقام پیدا کردیتا ہے، لے کر" اپنے محبوب کے پاس سے رخصت ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت" ایک ایسے پروانہ کی تھی جسے نیمۂ داغ نیمۂ خاکستر کہہ سکتے ہیں۔ اگر ایک لمحے میں وہ اپنی مایوسیوں کو

حیات شکن حد تک بڑھا ہوا دیکھتی تھی تو دوسرے لمحے میں محسوس کرتی تھی کہ تڑپنے کی قوت اس میں باقی ہے۔ اگر کبھی وہ خیال کرتی ہے کہ عالم نامرادی کی تلخ کیفیات دور کرنے کا بہترین طریقہ اپنے کو ہلاک کر ڈالنا ہے تو کبھی وہ اس نتیجے پر پہنچتی تھی کہ انتقام میں بہت لذت ہے۔

شہاب کا دوست محمود جو بقول شہاب کے شاعر ہے، ادیب ہے اور ایسا شاعر اور ادیب کہ زمانہ کم پیدا کرتا ہے۔ وہ فطرتاً نقاش اور مصوّر پیدا ہوا ہے۔ ایسا نقاش و مصور کہ اگر اُسے خود فطرت کا موقلم کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ذہین و حساس ہے، ایسا ذہین و حساس کہ قدرت شاذونادر ایسے افراد پیدا کرتی ہے۔ جب شہاب سے بحث کرتا ہے تو اس کی شاعرانہ روح فلسفے کے پیکر میں ڈھل کر سامنے آتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ:۔

"حیّات قلب کا حد سے بڑھ جانا عین روحانیت ہے اور اس لئے اگر کوئی شخص تاثرات سے مغلوب ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس پر جذبۂ روحانی طاری ہے"

اور جب حیّات قلب کے حد سے بڑھ جانے کو عین روحانیت کہنے والا یہ شاعر فلسفی یا فلسفی شاعر (جو بقول شخصے فکراً شاعر اور فکراً مغنی ہے) شہاب کی دلیلوں سے تنگ آجاتا ہے تو اس کی طبیعت کا ہیجان ابل کر جوش میں آتا ہے اور الفاظ کا دریا ایک بحر تلاطم خیز کی طرح کبھی اترتا کبھی چڑھتا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ محمود کی لمبی لمبی خطابت کے زور کی صورت ظاہر ہوتی ہے

"کیا کہوں شہاب! میرے بس کی بات نہیں ورنہ تمہیں کہیں محبت میں مبتلا کر دیتا اور پھر پوچھتا کہ کہئے قلب کا کیا حال ہے۔ اس وقت روح پر کیا بن رہی ہے۔ تم کچھ کہتے اور میں کہتا کہ یہ تو قلب کا تاثر ہے، روح کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم بگڑتے اور میں خوش ہوتا، تم تڑپتے اور میں

مسرور ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کر سکتا، اس لئے
سنتا ہوں جو تم کہتے ہو اور برداشت کرتا ہوں جو سنتا ہوں
آزاد ہو، خلش سے نا آشنا ہو، جس طرح چاہو حکیم بن لو
فیلسوف ہو جاؤ، محبت کرنے کا سلیقہ ہوتا۔۔۔۔۔
تو معلوم ہوتا کہ دل جب تک مبتلا نہیں ہے سب کچھ ہے۔
لیکن جہاں مبتلا ہوا پھر وہ خود کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو ساری
ہوش کی باتیں ہیں کہ روح کیا ہے اور قلب کیا ہے۔ اس کے
تاثرات کیا ہیں اور اس کی بے تابیاں کیا، وہ کب پیدا ہوتے
ہیں اور یہ کس وقت، لیکن جہاں یہ ہوش جاتا رہا تو پھر یہ خبر
بھی نہیں ہوتی کہ دل کہیں تھا۔ اگر تھا تو اب وہ کہاں ہے۔
آہ! شہاب! اگر کبھی تم محبت کرنے لگو تو خدا جانے کیا ہو جائے

جذبات کے دریا کے بند جب ٹوٹتے ہیں تو انھیں کوئی روک نہیں سکتا اور عموماً ہوتا یہی ہے کہ یہ بند کسی نہ کسی بہانے ٹوٹتا ضرور ہے۔ اور جب ٹوٹتا ہے تو سامنے آنے والی کوئی چیز اس کی زد کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔ ایک ہستی فنا ہوتی ہے اور دوسروں کی ہستی کی فنا کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں، ایک شعلہ اٹھتا ہے اور اس کی تپش نہ جانے کسے کسے اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ شہاب کی سرگزشت، والی سکینہ اور شاعر کا انجام والے طفیل، رقیہ اور حمیدہ اسی آگ کے جلائے اور مٹائے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کے ذکر سے پہلے محمود کے طوفان کی ایک جھلک اور دیکھ لیجئے۔

اگر میری دُعا مقبول ہوتی تو میں تمہارے اس لمحۂ الوہیت
گزر جانے کے بعد خدا سے التجا کرتا کہ الٰہی شہاب کو انھیں
میں سے کسی پیکرِ سنگین کی محبت میں اس قدر شدت کے ساتھ
مبتلا کر دے کہ وہ دیوانہ وار اس پتھر کی صورت کے سامنے

جیسی سائی کرے۔ وہ فریاد کرے اور کوئی سننے والا نہ ہو۔
وہ محبت سے چیخ چیخ اُٹھے اور کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ رو رو کر
طوفانِ نوحہ برپا کر دے لیکن کوئی اس کے آنسوؤں کا پونچھنے والا
نہ ہو تاکہ میں اس وقت نصیحت کر دوں کہ شہاب حُسن کو صرف حُسن
کے لحاظ سے چاہو۔ محبّت کو صرف محبّت کی نگاہ سے دیکھو۔
یہ بے قراری کیوں ہے؟ یہ اضطراب کس لئے ہے؟ تمہارا ذوقِ
نظر پورا ہو رہا ہے۔ تمہاری نگاہیں اچھی طرح آسودہ ہو رہی ہیں
پھر اور تمہیں کیا چاہیئے۔ سچ بتاؤ شہاب کیا ہو، اگر واقعی تمہیں
کسی مجسّمہ یا تصویر سے عشق ہو جائے، کم از کم مجھے تو بڑا لطف آئے،،

سکینہ جو محمود کے انتظار میں فراق کی گھڑیاں گن گن کر کاٹ رہی تھی اُسے
خط لکھتی ہے تو اپنی بے قراری کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

خدا جانے گھبرا کے کتنی مرتبہ ارادہ کیا کہ میں آجاؤں۔ میں جانتی
ہوں کہ نہیں جا سکتی، میں سمجھتی ہوں کہ تم تک نہیں پہنچ سکتی،
لیکن جی یہی چاہتا ہے، دل اس کے لئے بے قرار ہے۔۔۔۔،،

اپنے ایک اور خط میں ایک گزری ہوئی کیفیت کا حال یوں بیان کرتی ہے:۔

"ایک دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا" تم کھوئی ہوئی سی
کیوں رہتی ہو؟" میں اس وقت کوئی جواب نہ دے سکی کیونکہ
زبان کی جنبش بھی میرے قابو سے باہر تھی۔ لیکن اب بتاتی ہوں
کہ آپ کو پا لینے کے بعد میں خود کھو گئی تھی۔۔۔۔ پھر آپ کو
یاد ہے کہ میری یہ بے خودی کب تک قائم رہی؟"

سکینہ کی بے قراری میں، اس کے کھوئے ہوئے سے رہنے میں، اور پھر
کسی کو پا لینے کے بعد خود کھو جانے اور نہ جانے کب تک اس عالم بے خودی میں
رہنے میں جو اضطراب، جو تڑپ ہے، اس پر سکون کا سایہ ہے لیکن یہ سکون بھی

حقیقت میں اضطراب ہی کا ایک پہلو ہے اور اس لحاظ سے سکینہ کی تعمیر میں بھی وہی آب و گلِ صرف ہوا ہے جس نے شہاب، محمود اور اختر اور افضال کے پیکروں میں اضطراب کا خون دوڑایا۔

طفیل کے کردار میں اس اضطراب، حرکت، ہلچل اور تڑپ نے ایک اور انداز سے جگہ پائی ہے:۔

"طفیل سے زیادہ خوش زندگی بسر کرنے والا اور اس سے زیادہ اپنے اوقات کو لطف و مسرّت میں گزارنے والا اور کوئی نہ تھا کہ ہر جذبہ صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ پورا کیا جائے اور اسی کا نام زندگی ہے۔ اس کے ہاں ماضی و مستقبل کا مفہوم کوئی نہ تھا۔ وہ صرف حال کو دیکھتا اور چاہتا کہ ہر ممکن صورت سے اس کو کام میں لایا جائے۔۔۔۔۔"

شہاب کی سرگزشت کے آخری چند فقرے اسی کے بیان پر ختم ہوتے ہیں۔

"طفیل نے آخری مرتبہ بمبئی کی ایک مشہور رقاصہ سے تعلق پیدا کر کے اس کو بھی تباہ و برباد کر دیا ہے، لیکن ابھی تک اس سے تعلق قائم ہے کیونکہ چند قطرے خون کے ابھی اس میں اور باقی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب ان کے نچوڑنے کے لئے کس قسم کا نشتر استعمال کیا جا رہا ہے۔"

طفیل کی طبیعت کا اضطراب دوسروں کو تباہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا اور موقعے تلاش کرتا ہے اور "شاعر کا انجام" کی رقیہ کے لئے افضال کا حسن عالم آشوب تباہی کا بہانہ ہو جاتا ہے:۔

اس کے دردمند سینے کو شفق ہو جانے کے لئے صرف ایک حیلہ درکار تھا اور آخر کار وہ حیلہ اُسے گھر بیٹھے ہاتھ آ گیا" ناول میں رقیہ کا تعارف ان الفاظ میں کر دیا گیا ہے:۔

"رقیہ" ایک دولت مند خاندان کی ناز پروردہ لڑکی، اثراتِ
تعلیم کی وجہ سے نہایت فہیم، بیباکانہ خصائل سے متصف،
حسنِ صورت کے ساتھ جذباتِ لطیف سے مالا مال، عنفوانِ
شباب کے ناقابلِ ضبط جوش سے ہیجان سینہ رکھنے والی شاعرانہ
کیف کی مبہوت دارفتگیوں سے مزہ لینے والی، یوں ہی اپنے
مست و مخمور قدموں سے آمادۂ ہلاکت تھی کہ دفعتاً افضال
کا حسن عالم آشوب . . . . . "
اسے یہ کیا خبر نہ تھی کہ حصولِ مقصود کے بعد شباب کی لذات
منقبض کیسا پر لطف انبساط، کیسا پُر مزہ انتشار چاہتی ہیں۔
رقیہ کو چاہنے اور چاہے جانے کی لذتوں سے صرف خیالی
آگاہی تھی اور اس لئے اس غریب کو کیا خبر تھی کہ محبت
صرف ایک پسندیدگی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک پرستش ہے
بیتاب ایک لذت ہے مضطرب، ایک لطف ہے بے قرار"

رقیہ کا حال بیان کرتے ہوئے نیاز نے محبت کو پرستشِ بے تاب، لذتِ مضطرب اور لطف بے قرار کہہ کر محض ایک کردار کے احساس کی ترجمانی نہیں کی۔ حقیقت میں یہی احساس اور اسی احساس کی شدت ہے کہ وہ ایک خاص طرح کے فلسفے کی واضع اور خالق بنتی ہے اور اس کی گونج کہانی کے ہر موڑ پر سنائی دیتی ہے کرداروں کے مکالمے اسی فلسفے کی لڑیاں جوڑ کر اسے مربوط زنجیر بناتے ہیں، کہانی میں پیش آنے والے واقعات میں اسی کا عکس دکھائی دیتا ہے اور حسنِ فطرت اسی کے نغمے گاتی اور دلوں کو وجد میں لاتی ہے، شاعرانہ فکر، شاعرانہ نغمے اور شاعرانہ تخیل کا یہ فلسفہ جس جس رنگ میں ابھرتا، نمایاں ہوتا اور نظر کے سامنے آتا ہے اس کی پرورش، رومانی جوش، اضطراب اور بے تابی کی آغوش میں ہوتی ہے۔
شاعر کا انجام، میں یہ فلسفہ کس کس طرح سامنے آتا ہے :-

محبّت ! محبّت ! ایک جذباتِ فانی کا انعکاس، داعیاتِ
شباب کا ایک فوری جوش، سیلابِ خواہشات کا ایک موقت مد
وہ سمجھتا تھا کہ حسن و محبت ایک چیز ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آنکھیں
بارِ اُلفت سے دبی ہوتی ہیں، ورنہ جھکی ہوئی کیوں ہوں؟ وہ باور
کرتا تھا کہ ایک لطیف سینہ کی تمنائیں محبّت کی مختلف صورتیں ہیں۔۔
وہ یقین کرتا تھا کہ عورت نام ہے عشق کا اور اس کی ادائیں اس عشق
کا نطق ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شہاب کی سرگزشت، میں قدم قدم پر اس کے جلوے
نظر آتے ہیں:۔

"محبّت سے لذّت جدا نہیں ہوتی اور اگر ہو جائے تو محبت نہیں"

"محبّت نام ہے ایک بے غرض انہماک کا، ایک خود فراموش محویت کا
جو پیدا ہو حسن کو دیکھ کر، خواہ وہ حسن ظاہری ہو یا باطنی۔"

"یہی جذبہ ہے کبھی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے، یعنی مادّی محبت روحانیت
اختیار کر لیتی ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب محبّت ناکام و نامراد ہو"

"محبّت کا وجود کہیں نہیں ہے اور اگر ہے تو ایسی جگہ جہاں ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں"

"محبّت جو ظلم کی طرف سے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اس کا مداوا ممکن نہیں"

"دنیا جس چیز کو حسن سمجھتی ہے وہ اکثر و بیشتر صرف ملمّع ہے اور محبت ریاکاری
ہم میں کم ایسے ہیں جو حسن کو جسارت و فریب سے جدا کر سکیں اور محبّت
کو نمود و تصنّع سے۔"

"تباہیاں محبت سے پیدا ہوتی ہیں، دوستی سے نہیں۔ محبت ہماری بصارت سلب کرتی ہے اور دوستی ہماری روح کو منور بنا دیتی ہے وہ دعوتِ خسران ہے اور یہ کسب فیضان"

"جوانی کو اپنی سرشاریوں کا علم اس وقت ہوتا ہے جب ہر شام اسے انتظار نظر آنے لگے اور ہر رات آغوش بیدار"

جوانی، آہ وہ جوانی جس کی لذتوں، جس کی کیفیتوں کا بیان الفاظ سے ممکن نہیں، جس کی حقیقت کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کسی کو حاصل ہو، جس کے نشہ کا کیف وہی جان سکتا ہے جس نے اس شراب کو پیا ہو۔ کس قدر جی چاہتا ہے کہ یہ اپنے قابو میں ہو۔ آئے جس وقت اس کا جی چاہے، لیکن جائے اس وقت جب ہم چاہیں۔

یوں تو کون ہے جس پر شباب اور کیفیاتِ شباب طاری نہیں ہوتیں لیکن سچ پوچھئے تو جوانی اُسی شخص کی ہے جس نے اسے بُری طرح ضائع کیا۔ دنیا میں اگر کوئی چیز ضائع کرنے کی ہے تو وہ جوانی ہے اور یہی وہ بربادی ہے جس کے خیال میں بھی قریب قریب وہی لذت ہے جیسی نفس کی تباہی میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں اور اس لئے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں یہ قیمتی ہی صرف اس لئے ہے کہ اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی اس کو محفوظ رکھ سکے تو وہ جوانی نہیں کچھ اور ہے۔

نیاز نے اپنی دونوں کہانیوں میں اپنے کرداروں کی مزاجی کیفیت اور ان مزاجوں سے پیدا ہونے والے فلسفۂ حیات کے اظہار کے لئے خلشِ بے تابی، ہیجان، بے اختیاری خود فراموشی، تپشِ نظارگی، مضطرب تخیلات، حیاتِ تند، شوقِ فراواں، مسرتِ وابستگی، آمادۂ ہلاکت، پرمژدہ انتشار، سیلابِ خواہشات، خود فراموشِ محویت، حسن کی جسارت، جوانی کی سرشاری اور شباب کا ناقابلِ ضبط تہیج جیسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ ان سب الفاظ اور ترکیبوں کی بنیاد مصنف کے پرجوش اور اضطراب انگیز رومانی تخیل اور ایسے فلسفۂ حیات پر ہے جو رنگین شعریت کا تابع ہے، جو ذہن کے بجائے قلب کی گہرائیوں سے ابھرا ہے اور جس میں فکر نے ایک لمحے کے لئے بھی جذبے کی جدائی گوارا نہیں کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان ناولوں کے پورے فن پر جس میں سیرت کشی کے علاوہ، واقعات کا بیان، فضا اور منظر کی مصوری، کرداروں کے مکالمے اور مصنف کے تبصرے سب چیزیں شامل ہیں۔

ان میں وہ گہرائی ہے جو فلسفیانہ غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور وہ دلکشی اور دل نشینی ہے جو اکثر اوقات دل دوز، دل گداز اور دل ستاں بنتی ہے اور بغیر جذبے کی شدت کے پیدا نہیں ہوتی۔ اس فن میں فلسفہ آمیز شاعری اور رومان آمیز فلسفے کی یکساں اہمیت ہے۔ کہانی میں مختلف موقعوں پر جس تاثر کا آغاز فلسفے سے ہوتا ہے اس کا انجام شعر پر ہوتا ہے۔ جو کچھ فلسفہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے شاعری پورا کرتی ہے حقیقت اور شعریت ہر جگہ ایک دوسرے میں جذب نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار کسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اس کے گرد شاعرانہ تصورات کا ہالہ بناتا ہے۔ شاعرانہ تصورات احساس اور تخیل کی دنیا میں ہلچل مچاتے ہیں اور موقلم حسین تصویریں بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ نگاری اصل میں شاعرانہ بیان کا دوسرا نام ہے اور اس شاعری کو حسین سے حسین تر بنانے میں مناظرِ فطرت کا حسن، شہری زندگی کی گہما گہمی، محبوبوں کی ادائیں اور عشوہ طرازیاں اور ان عاشقوں کے دلوں کی دھڑکنیں مصنف کی شاعرانہ

سازش میں اس طرح شریک ہیں کہ جیسے حسن و جاذبیت اور رومان و اضطراب کے ان مرقعوں کی تخلیق کی ذمہ داری تنہا افسانہ نگار پر نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک پر ہے اب اس طرح کے چند مرقعے ملاحظہ کیجئے۔ پہلا مرقع شہاب کی سرگزشت کا ہے۔ کہ جہاں شہاب کا دلِ دیوانہ اور فطرت کے اَن گنت حسین و جمیل مناظر باہم مل کر اس مرقعے میں رنگ بھرتے ہیں۔

شہاب اختر سے مخاطب ہے :-

"اختر صاحب! یہ کھیل کھیلنے کے لئے اب دل کہاں سے لاؤں؟ ایک تھا سو اس کا حال یہ ہے کہ اب یہ بھی خبر نہیں کہ وہ ہے کہاں آسمان کو دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ شاید اس نیل میں ڈوب کر رہ گیا ہے۔ سمندر کو دیکھتا ہوں اور خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے تلاطمِ امواج میں مِل گیا ہوگا۔ شفق نظر آجاتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ کہیں اس رنگ میں نہ تحلیل ہو گیا ہو۔ چاند اپنی چاندنی پھیلا دیتا ہے میں کوشش کرتا ہوں کہ کہیں اس فرشِ سیمیں میں کوئی شکن نظر آجائے تو سمجھوں کہ دل یہیں ہے۔ جب بہار اپنی شگفتگی چاروں طرف منتشر کر دیتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ہر ہر پھول اور پھول کی ہر ہر پنکھڑی میں دل ملفوف ہے۔ تیتری اُڑتی ہوئی گذر جاتی ہے تو میں تڑپ جاتا ہوں کہ یہ کہیں ٹھہرتی تو میں اس کے پَروں کے غبار رنگ سے اس کے آوارہ ہو جانے والے کا پتہ پوچھتا۔ جھنجھری اک اضطراب بنی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں ذرا بھی نگاہ قائم ہو تو اس رعشہ پرواز سے لے جانے والے کا سراغ لگاؤں۔"

یہاں حسنِ فطرت کا اضطراب اور دلِ عاشق کا اضطراب ایک دوسرے میں جذب اور حل ہو رہے ہیں۔ لیکن نظر نیلگوں آسمانوں، متلاطم سمندروں، شفق کی سرخیوں، بہار کی شگفتگیوں اور تیتری کے غبارِ رنگ سے ہٹ کر حسنِ ارضی کے

نظاروں میں گم ہوتی ہے تو اس کی بے تابی اور بے قراری اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے

محمود اور طفیل تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے اور :۔

اختر اپنی تمام رعنائیوں اور دل ربائیوں کے ساتھ . . . نمودار ہوتی ہے۔ اس کی ساری کا وہ زرکار پلّو جو روشنی میں اپنے اندر بجلیاں لئے نظر آتا ہے، سر پر پڑا ہوا ہے اور اس کی ضو سے پیشانی پر پیدا ہونے والی روشن لرزش دلوں کو متوّر کر رہی ہے۔ وہ تمام تر شاہانہ اداؤں کے ساتھ اُس کی قامت کی رعنائی، وُہ یکسر برق پاش کیفیتوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے چھلک پڑنے والا تبسم۔ وہ بیک وقت جاں فرسا و حیات بخش اثرات کے ساتھ چہرے کے رنگ میں امتزاج شعلہ و بلّور۔ وہ تمام ممکن التہاب کے ساتھ ایک ایک عضو سے لپٹ جانے والا شباب۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ دنیا سے آثارِ حیات مٹا دینے کی قسم کھا کر آئی ہے اور ادھر دنیا بھی اس کے قدموں پر جان دینے کے لئے اشارے کی منتظر ہے''

یہ منظر ساحلِ اپالو کا ہے :۔

''وہ ہلکی ہلکی ریشم کی ساریاں اور اُن ساریوں کے آنکھوں کو خیرہ کرنے والے زرکار پلّو، وہ صدف ہائے کانوں میں رنگین رخساروں سے چھو کر کانپ کانپ اٹھنے والے آویزے اور ان آویزوں کے دُرِ درخشاں و تابناک الماس۔ وہ پیشانیوں کی محدود و مختصر فضا میں ناقابلِ شمار اداؤں سے گیسو کی آرائشیں اور اُن آرائشوں کی وہ مبہوت و دیوانہ بنانے والی نکہت باریاں . . . . یہ معلوم ہوتا تھا آج یہ قطعۂ زمین پر لگا کر اُڑ جائے گا۔''

اسی ساحل پر جب شہاب نے پہلی مرتبہ اختر کو دیکھا ہے تو اس رنگ میں :۔

''اختر کے سانولے رنگ میں یہ خصوصیت اور زیادہ قیامت خیز تھی

کہ جس قدر زیادہ غور سے دیکھا جاتا اتنا ہی وہ کھلتا ہوا نظر آتا۔
یہاں تک کہ بعض دفعہ تو یہ معلوم ہوتا کہ اس میں بجلیاں کوٹ کر
بھر دی گئی ہیں۔ اس کا جسم اس قدر نازک تھا کہ بعض دفعہ تو یہ
اندیشہ ہوتا کہ اگر وہ ساحل پر کھڑی ہو گئی اور ہوا تیز چلنے لگی تو
اُڑ کر سمندر میں گر جائے گی۔ جس وقت وہ یہاں آئی تو اپنی اُڑنے
والی ساری کے آنچل کو سنبھالتی تھی اور لچک جاتی تھی . . . . .
اس کی پیشانی کی فراخی کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ بل کھائی
زلفوں کے چھلّوں نے اس کی وسعت کو چھپا رکھا تھا۔ لیکن اس میں
بھی کوئی شک نہ تھا کہ اس کی پیشانی کا صندل گیسوؤں کی ناگنوں
کو پوری طرح آسودہ کر رہا تھا . . . . .''

اب ایک دو تصویریں دل کی چھپی ہوئی کیفیتوں کی :۔

پہلی تصویر ''شاعر کا انجام'' والی زبیدہ کے جذبات کی ہے :۔

''جب . . . . گرمی نہ تھی مگر اس کی کافوری پیشانی عرق آلودہ تھی۔
وہ گھڑی گھڑی اپنی انگشتِ شہادت کے ہلال سے اُن قطرات کو
زمین پر گرا گرا کے شہاب ثاقب کا منظر پیش کر رہی تھی وہ پریشان
بالوں کو رخساروں سے گھڑی گھڑی ہٹاتی، مگر آتشِ گل کا دھواں
کہیں یوں مٹتا ہے۔ وہ پھر آ آ کر سینے میں چپک کر رہ جاتے تھے۔
آنکھوں میں آنسو بھرے تھے، مگر موتیوں بھری صورت کا کوئی قدردان
وخریدار نہ تھا . . . . .''

''شاعر کا انجام'' کی ایک شاعرانہ تصویر اور :۔

''رقیّہ حیّاتِ خجل کی شبیہہ، لذّاتِ منفعل کی مجسّم تصویر بنی ہوئی
انفعال کے روبرو بیٹھی تھی اور جھکی ہوئی نگاہیں، مائل نشیبِ
مژگاں سے ملی ہوئی، دفترِ ندامت کا شیرازہ بنی ہوئی تھیں . . .

آنکھوں میں پھیلا ہوا سرمہ، دودِ مستی بنا ہوا صحبتِ دوشینہ
کے پُرکیف دقیقہائے مسرّت پر روشنی ڈال رہا تھا لبوں کی پپڑائی
ہوئی سُرخیاں مَلی دَلی پنکھڑیوں کی طرح مرجھائی ہوئی نظر آتی تھیں
اس کا کُندنی رنگ رات بھر کی حدّتِ آغوش سے اور بھی دہکنے لگا
تھا۔ اس کے رخساروں کا شہاب بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب
ٹپکنا ہی چاہتا ہے۔ چہرے کی نازک رگوں میں تبسّم دوڑ رہا تھا،
مگر آنکھوں تک آکر اس کھُلی ہوئی آغوشِ ندامت میں پہنچ کر
خدا معلوم کہاں غائب ہو جاتا تھا . . . . "

مناظر فطرت کے یہ مرقعے، خارجی زندگی کے حقائق کی یہ تصویریں...، حسن و محبت کے سربستہ معرا رازوں کی یہ داستانیں، دل پر گزرنے والی کیفیتوں کی یہ ترجمانیاں، مشاہدے کی اساس پر نہیں تخیل کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ افسانہ نگار کے تخیل نے زندگی کے کسی ایک سیدھے سادے مشاہدے، تجربے یا احساس کو خیال کی رنگینیوں میں ڈبو کر ہر جگہ ایک ایسی صورت دی ہے کہ پڑھنے والا ایک خوابوں کی دنیا میں، ایک سحر و افسوں کی دنیا میں، اور ایک پُرکیف رومانوں کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اُسے ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں جو اُس کی دیکھی بھالی دنیا کے واقعات سے مشابہ نہیں ہوتے اور جہاں اُسے ایسے کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے سوچنے، محسوس کرنے، عمل کرنے، بولنے چالنے، کہنے سننے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متاثر ہونے اور تاثرات کو ظاہر کرنے کا اندازِ زندگی کے عام کرداروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کے فلسفے میں شعر کا رنگ ہے اور ان کی شاعری فلسفیانہ فکر کی طرف مائل ہے۔ یہاں احساس اور جذبے کی رو چلتی ہے تو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کے بہاؤ میں ایسا زور اور ایسی روانی ہے کہ اس کے جوشِ مضطرب اور سیلِ مسلسل کو کوئی قوت روک نہیں سکتی اور تخیل کی قوت اور جوش کا نتیجہ ہے۔ مصنّف کے لئے ہر حسین منظر میں خواہ یہ منظر فطرت کے

حسین وجمیل مظاہر کا ہو، خواہ کسی حسین وجمیل انسانی پیکر کا، خواہ جذبہ کی لطافت
نزاکت اور شوخی کا سرور وانبساط کا سرمایہ مہیا کرتا ہے۔ اس کے مشاہدے سے
اس کے احساسات میں تموّج اور جذبات میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور احساس
وجذبے کے اس تموّج واضطراب سے شاعرانہ طبیعت اور رومانی مزاج میں
اس حسین منظر کی مصوّری کا ولولہ کروٹیں لیتا ہے۔ خیال کی رنگینی ولولے کی اس آواز
پر لبیک کہتی ہے اور حسین منظر کی مصوری کے لئے پرشکوہ لفظوں، مترنم ترکیبوں
اور خیال انگیز تشبیہوں کا ایک سیلاب اُبلنا شروع ہو جاتا ہے اور اس سیلاب
کی رَو میں بہنے اور بہتے رہنے میں ایک ایسی لذّت ہے کہ پڑھنے والا ہرگز یہ نہیں
چاہتا کہ یہ لذّت اس سے چھین لی جائے۔

نیاز کا فن یا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ ان دونوں ناولچوں میں نیاز
کا فن اسی لذّت کا فن ہے۔ لیکن اس لذّت کے مہیّا کرنے میں اتنی بہت سی چیزوں
کا قصّہ ہے کہ ہم اس فن کو شوقِ فراواں اور آرزوئے بے تاب کا فن بھی کہہ سکتے
ہیں اور کلیوں کی نیم خوابی اور پھولوں کی بیداری کا فن بھی۔ یہ نغمہ مسّرت کی جھنکار
کا فن بھی ہے اور سوز وگداز کی خاموش پکار کا فن بھی۔ یہاں فلسفہ شعر کا تابع ہے
اور منطق کا ہر قدم تخیّل کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے۔ اور یوں یہ فن فکر کی
سنجیدگی سے زیادہ تخیّل کی رنگینی اور جذبے کے شوق، اضطراب اور بے تابی کا
فن بنتا ہے۔ یہ فن حقیقت کی رنگینی اور جذبے کی دنیا میں رہ کر اُن عواقب
سے بے خبر اور بے نیاز ہے جو انسان کی بربادی کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ شوق کی اسی
فراوانی اور اضطراب کی اسی شدّت نے اس فن میں انشاء کی ایسی تیزی پیدا کی
ہے کہ قاری کا ذہن کبھی کبھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ لیکن واقعات اور اتفاقات
کرداروں کے خیالات اور جذبات اور اس سے بھی زیادہ ان کی رفتار، گفتار
اور عمل وردِّ عمل میں اس تیزیٔ رفتار کی موجودگی کے باوجود قاری ناول پڑھتے وقت
کسی جگہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ جو دنیا افسانہ نگار نے اپنے ناولوں میں بنائی ہے۔

اس میں اس کے لئے کسی طرح کی اجنبیت ہے، اس معنی میں کہ ناول کسی نہ کسی صورت میں اس کے لئے دلچسپی، لطف، انبساط اور ذہنی نشاط کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ناول میں برابر تحیّر کے موقعے اور محل پیدا ہوتے رہتے ہیں حل طلب معمّے برابر اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اور یوں اسے برابر گرہیں کھولنے میں معروف رکھتے ہیں۔ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور مناسب موقع اور محل پر دور ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی فلسفیانہ باتیں کہی جاتی ہیں جو بعض اوقات بے حد الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن ان باتوں میں کوئی نہ کوئی صورت بھی نکلتی رہتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن تھوڑی سی کاوش سے انھیں سلجھا لیتا ہے اور یہ بات اس کے لئے بڑی تسکین اور خوشی کی ہوتی ہے کہ کہانی کے تخلیقی عمل میں اس نے بھی تھوڑا سا حصّہ لیا ہے۔

شہاب کی سرگزشت، اور ایک شاعر کا انجام، کے انجام کی ایک بڑی خوبی جسے ناول نگار کے نازک فنّی احساس وادراک کا نتیجہ سمجھنا چاہئے یہ ہے کہ ان دونوں ناولوں کی پوری فضا اس کے باوجود کہ خیالی ہے قاری کو یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں دیتی کہ اس کی نظر کے سامنے جو واقعات گزر رہے ہیں وہ محض شاعرانہ ہیں یا ان ناولوں کے کردار جو کچھ بولتے اور کرتے ہیں اس کا اندازہ عام انسانوں کی گفتار و رفتار سے مختلف ہے۔ نیاز نے فلسفے، تخیّل اور شاعرانہ احساس اور بیان کی مدد سے دونوں ناولوں کو حقیقت شعری کا ایسا حسین وجمیل، ایسا موثر اور دل نشین مرقع بنایا ہے کہ پڑھنے والے پر برابر ایک طلسم وافسوں کا سایہ رہتا ہے اور وہ اپنے آپ سے یہ سوال کئے بغیر کہ ایسا کیوں ہوا اور ایسا کس طرح ہوا ہر بات کو دل میں جگہ دیتا اور بے یقینی کو یقین میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ نیاز نے اپنے فن کی "بنیاد" "کیا ہو سکتا ہے" کے بجائے "کیا ہونا چاہئے" پر رکھی ہے اور قاری کو اپنی فنّی چابک دستی سے اس طرح اپنا ہم خیال بنایا ہے کہ خیال کی اس دنیا کو جہاں فلسفہ بھی شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، وہ حقیقت کی دنیا سمجھ کر اس میں چلتا پھرتا اور اس دنیا کے مشاہدات و تجربات کو حقیقی مشاہدات

وتجربات سمجھ کر ان سے متاثر ہوتا ہے۔

نیاز فتح پوری نے اپنے شاعرانہ تخیّل کی قوت سے دو ایسے ناولوں کی تخلیق کی ہے جن میں حقیقت اور رومان کا بڑا لطیف امتزاج ہے، جہاں فلسفہ، نفسیات اور منطق نے ایک حد تک اپنا اپنا منصب ادا کر کے خود کو شاعری کے حوالے کر دیا ہے۔ یہاں کرداروں کے ساتھ زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ انھیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ واقعات کی رَد انھیں کشمکش میں مبتلا کرتی ہے، لیکن بالآخر فیصلہ دل کے ہاتھ رہتا ہے۔ کردار چلتا اسی راستے پر ہے جدھر اس کے جذبے کا جھکاؤ ہے۔ یہ کردار گفتگو شروع کرتے ہیں فلسفیانہ انداز میں، لیکن یہ فلسفہ اپنے اظہار کے لئے ہمیشہ شاعرانہ اسلوب کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور اپنی تاثیر کے لئے شاعرانہ ترکیبوں، شاعرانہ لفظوں شاعرانہ تشبیہوں اور اشاروں کنایوں سے مدد لیتا ہے۔ کرداروں پر کبھی کبھی یہ کیفیت بھی طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنا تجزیہ خود کرتے ہیں لیکن تجزیے کا یہ راستہ اختیار کر کے بھی بالآخر پناہ انھیں وہیں ملتی ہے جہاں دل کی دھڑکنوں کی آواز ہر آواز پر غالب آتی ہے کرداروں کا زیادہ وقت عمل سے زیادہ گفتگو میں صرف ہوتا ہے اور اس گفتگو میں بات پوری دلیلوں کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ باتوں کی زنجیر منطقی فکر کی کڑیوں سے جڑتی اور بنتی ہے لیکن اس زنجیر میں جھنکار شعر کی سنائی دیتی ہے۔ باتوں میں معمّوں کا رنگ ہوتا ہے۔ لیکن یہ معمّے کہانی کو فکر انگیز بنا کر اس میں زیادہ دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ یہاں فلسفیانہ باتیں ادیبوں اور شاعروں کی زبان میں کہی جاتی ہیں، گفتگو میں سوال وجواب کا تیکھا پن پڑھنے والے کو برابر اپنی طرف متوجہ اور اس کے ذہن کو پوری طرح بیدار رکھتا ہے۔ سوال وجواب قاری کے تخیّل کے لئے تازیانہ بھی بنتے ہیں اور لفظوں کے استعمال کی چابک دستی اس کے نشاط کی کیفیت کو مستقل بناتی ہے۔

دونوں ناولوں میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو صرف خوابوں کی دنیا میں پیش آسکتے ہیں۔ ان واقعات کے بیان میں شاعرانہ مبالغے سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہ شاعرانہ مبالغہ کہانی کی اس مجموعی فضا سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو خیال کی شوخی اور شدت

نے بنائی ہے۔ فضا کا یہ کیف کسی جگہ کم نہیں ہوتا۔ ہر چیز طلسم وافسوں کا سایہ ہے۔ ہر تصویر میں قوس قزح کے رنگ ہیں اور اس طلسم وافسوں کی دنیا اور قوس قزح کے ان رنگوں کی مصوری شاعرانہ زبان کے موقلم سے ہوتی ہے۔ لفظوں اور ترکیبوں کا حسن اپنی طرف کھینچتا ہے۔ حسنِ تعلیل کی جدّتیں نئی سی نئی تاویل کی صورتیں پیدا کرتی ہیں۔ خیال کی رنگینی اور جذبے اور احساس کا جوش اور زور ہر آن ایسے بیان کا طالب ہوتا ہے جو صرف لفظوں کو سب کچھ سمجھے، جو معنی کے حسن کو لفظوں کے غازے سے نکھارے اور جو تصوّر کے سامنے ہر گھڑی تازہ بہ تازہ نقش بنائے اور انھیں ایسے رنگوں سے سجائے جن کی شوخی برابر بڑھتی رہے۔ ان ناولوں میں خیال میں جو زور اور جذبے میں جو جوش ہے سادگیٔ بیان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لئے نیازؔ نے اس کے لئے ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو کہانی کا اسلوب نہ معلوم ہونے کے باوجود اس لئے پڑھنے والے کے دل میں گھر کرتا ہے کہ یہ اسی زور اور جوش کا پیدا کیا ہوا ہے جو ان کہانیوں کی رگ وپے میں سمایا ہوا ہے، جو اس کے رواں دواں لہو میں دوڑ رہا ہے۔ اور جس سے برابر اس کی نبض کی رفتار بڑھتی رہتی ہے۔

جس طرح "شہاب کی سرگزشت" اور "ایک شاعر کا انجام" نے ایک ایسے دَور میں جب کہانی تیزی سے زندگی کی سچائی کو اپنانے کی طرف قدم بڑھا رہی تھی، رومان کی روایت کے پرچم کو اونچا کیا اور فن کے اس مسلک کی قیادت کا صحیح حق ادا کرکے اس تصوّر کو تقویت دی کہ کہانی محض حسنِ خیال کی جنم دی ہوئی حقیقتوں کو حقیقت سمجھ کر اور اس حقیقت کو شعر ونغمہ کی زبان دے کر بھی دلوں کو تسخیر کرسکتی ہے اور یوں رومان حقیقت سے بھی زیادہ موثر اور دل نشین بن سکتا ہے۔

"شہاب کی سرگزشت" اور "ایک شاعر کا انجام" کہانی کی روایت میں رومانی تصوّرات کے فن کے سنگِ میل اور روشن مینار ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

نیاز فتح پوری ۔ مکتوبات کے آئینے میں

ادبِ لطیف کی ائمہ میں نیاز فتح پوری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے...
ریاض خیرآبادی اور خلیقی دہلوی نے جس چیز کو دلآویز بنادیا تھا، نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کر دی۔ سجاد حیدر یلدرم اور ل۔ احمد نے نثر میں شاعری کی اور انشاء پردازی کو آتشِ سیال بنادیا۔ انہوں نے زندگی کے حقائق پر غور نہیں کیا۔ بلکہ اسے شراب و شعر اور نور و نغمہ سے معمور کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت طرح داری، خود پسندی اور صناعانہ پختگی ہے۔ یہ لوگ شاعر پہلے تھے اور نثر نگار بعد میں۔ اس لئے انہوں نے نثر اور شعر کی حدوں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

اس زمانہ میں جو مکتوباتی ادب پیدا ہوا، وہ فضا کے مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" ادب طرازی کا لائقِ رشک نمونہ ہیں۔ لیکن وہ خطوط نہیں۔ خطوں کے پیرائیہ میں مضامین ہیں۔ اسی طرح نیاز فتح پوری نے جو خط لکھے ہیں، وہ ایک خاص قسم کی انشاء پردازی کی بہترین مثال ہے۔ لیکن خط کی تعریف ان کے جسم پر چُست نہیں آتی ۔ اصلی خط تو وہ ہیں جن میں جذبۂ بے اختیارِ شوق ہو اور خیام کی زبان میں "چناں کہ می نمایم ہستم" پہ زور ہو۔ اگر ان میں عاقلانہ حزم و احتیاط برتی گئی ہے یا اسلوب کی نوک پلک اور تراش خراش کا قدم قدم پر لحاظ رکھا گیا ہے، تو وہ مضمون آفرینی سے زیادہ وقیع نہیں۔ نیاز کے مکتوبات کے تین مجموعے "مکتوباتِ نیاز" کے نام

سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نہ مکتوب الیہ کا نام درج ہے، نہ تاریخ، نہ وقت، نہ مقام، حالاں کہ ان چیزوں کی موجودگی سے ایک خاص قسم کی فضا تیار ہوتی ہے اور جب پڑھنے والا اس "خلوت کدہ" میں داخل ہوتا ہے، تو اس کی حیرت اور مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔ نیاز نے ہمیں اس لطفِ خاص سے یکسر محروم رکھا ہے، جو غالب کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انہوں نے ایک جام بھر کر محفل میں تو رکھ دیا ہے۔ لیکن ساقی کی اداؤں سے ہمیں لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔ حالاں کہ بعض اوقات اس کی دل ربایانہ نیم نگاہی اور خجل تبسم فروشی اور جرعۂ شراب سے زیادہ سُرور انگیز ہوتی ہے۔

نیاز فتح پوری کے یہ خطوط ماہ بہ ماہ رسالہ "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ شائع کئے جائیں۔ اس لئے ان میں "نگاہے سرِ اہم رفت" کا لطف نہیں ہے۔ ان خطوں میں اسلوب کا اچھوتا پن، بیان کی ندرت، تخیل کی بلندی، ظرافت کی بہار سب کچھ ہے۔ لیکن خلوص کی گرمی نہیں ہے۔ ان تینوں مجموعوں کو پڑھتے وقت وہ خوشی ہوتی ہے، جو چڑھتی ہوئی ہوائی کو دیکھ کر۔ لیکن ختم کرنے کے بعد وہ کوفت بھی جو گرتی ہوئی ہوائی کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ ان مست ہواؤں اور گھنگھور گھٹاؤں میں ہمارا مقابلہ جام خالی ہی رہتا ہے۔ غالب کے خط پڑھ کر دوئی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ان کی بھرپور انسانیت اور ارضیت ہمیں غم گساری کے آداب سکھاتی ہے۔ لیکن نیاز کے ساتھ یہ ہم دردی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم ان کے ساتھ دور تک نہیں جا سکتے۔ وہ خضر کی طرح بہت سی شرطیں لگاتے ہیں، جو ہمیں قبول نہیں ہوتیں۔ وہ شوق تو پیدا کرتے ہیں لیکن رخصتِ نظر نہیں دیتے۔ "وہ خود نمائی اور خود پرستی کے درمیان جھولتے رہتے ہیں"۔ ہم اگر چاہیں کہ ان کی شخصیت دیکھ لیں، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ صرف ان ہی گوشوں کی نمائش روا رکھتے ہیں، جن کی نمائش وہ چاہتے ہیں کہ ہو۔ ان کی شخصیت پر اس قدر دبیز اور تہ بہ تہ نقاب پڑے ہوئے ہیں کہ محرومیاں سر پٹک پٹک کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن ان کی بزمِ وصال میں ایک نگاہ سے زیادہ نظارہ میسّر نہیں آتا۔ نقاب شبلی کے

یہاں بھی ہے۔ لیکن وہاں "نقاب نے خود جلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے"۔ غالبؔ، شبلیؔ اور مہدیؔ کے خطوں میں حُسنِ اتفاق کی جلوہ گری ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دفعتاً ہرنوں کی ایک قطار کمین گاہ سے نکل پڑی ہے۔ نیازؔ کے یہاں بات پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی ہے۔ ان کے مکتوب الیہ سوچ سمجھ کر انتخاب کئے گئے ہیں۔ ان میں ہر ایک کا علم نیازؔ کے برابر ہے۔ ہر ایک کو شعر و سخن کا تھوڑا بہت ذوق ہے۔ انہوں نے اس مجموعے میں کوئی خط بھائی، بہن، بیوی، ماں، باپ، ملازم یا متوسل کو نہیں لکھا۔ اس لئے ان خطوں سے نیازؔ کے متعلق کم اور ان کے مکتوب الیہم کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے؟ اور نیازؔ کے اس سے کس قسم کے اور کب سے مراسم ہیں؟ ان کی محفل میں رند، قلندر، شاعر، ادیب، صحافی، عالم سب موجود ہیں۔ لیکن ان سے ان ہی رموز پر گفتگو کی گئی ہے جو ایک خوش مزاج اور شائستہ انسان کو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔

نیازؔ کے ہر خط میں رومان پسندی جاری و ساری ہے۔ انہوں نے کسی حقیقت کا ذکر رومانیت سے ہٹ کر نہیں کیا۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ دنیا انہوں نے بڑے اہتمام اور کوشش سے سجائی ہے۔ بارگاہِ حسن، کارگاہِ مے و مینا، صحبتِ رقص و نغمہ، اہتماماتِ رندی و سرمستی، شاہد و شعر، غرض دُنیائے خرابات کا کوئی خُلد فروش منظر ایسا نہیں ہے جو اِن خطوں میں موجود نہ ہو۔ رندانہ خوش طبعی نے اس رومانی فضا کو اور چمکا دیا ہے۔ ان کے طنز میں تیکھا پن ہے، ہمدردی نہیں۔ ایک پندارِ تفوق ہے جو ہر جگہ نمایاں ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت، آپ نے بالکل درست فرمایا۔ خوباں سے چھیڑ چلی جانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن وصل آپ کے حصّے میں آئے اور حسرت میرے حصّے میں۔ اس پر قناعت ہمت دشوار ہے۔

محض آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ بحث میں نے چھیڑی تھی، اس اُمید پر کہ آپ

میرا ساتھ دیں گے۔ لیکن معاف فرمائیے کہ آپ نے بالکل خلافِ توقع وہی حرکت کی جو کوفیوں نے کی تھی۔ بہتر ہے۔ میں تو شہید ہوا جاتا ہوں۔ لیکن یاد رہے آپ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یزید کی سی قسمت پانا آسان نہیں۔ اس کی ہستی کو غیر فانی بنا دیا۔ اور میں یہ موقع بہ موقع کسی سے نہ کہوں گا کہ "آپ کا فریب خوردہ ہوں"۔[۵۱]

ایک شیخ صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"گرامی نامہ پہنچا۔ یقیناً نہ میں آپ کا سا تجربہ رکھتا ہوں، نہ آپ کی سی عقل و فراست۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ناتجربہ کاری و حماقت دونوں بہت عزیز ہیں کیونکہ وہ میری اپنی ہیں۔"[۵۲]

یہ مثال بھی ملاحظہ ہو:۔

"میں آپ سے زیادہ عقل مند ہونے کا مدعی نہیں ہوں لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ آپ کی "فکرِ بیدار" کی داد نہ دے سکوں۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے، اسے آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو "خوب" کہہ دوں۔ ورنہ سچ پوچھیے تو میں اسے آپ کی ذہانت و فراست سے فروتر سمجھتا ہوں۔"[۵۳]

یہ زخمِ تیغ بھی ملاحظہ ہو:۔

"جی ہاں۔ دو دیکھا۔ کیا کہنا ہے کہ آپ کے انتخاب کا! ماشاءاللہ! دو عالم از اثر شعلہ جانش سوخت۔

دیکھئے آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔

سچ کہتا ہوں کہ میں نے ایسے مجرمانہ قیافہ کا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ ان میں وہ آخر کون سی بات ہے جس نے آپ کو اتنا گرویدہ کر لیا۔ صورت دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا شاید اولیں نقشِ ناکام کچھ ایسا ہی رہا ہوگا۔ وہ

---

[۵۱] مکتوباتِ نیاز ج ۲۔ ص ۱۰۹۔ [۵۲] مکتوباتِ نیاز ص ۱۳۸۔ [۵۳] مکتوباتِ نیاز ص ۱۴۲۔

چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی گول گول آنکھیں کہ کیا کوئی پرکار سے ایسا صحیح دائرہ کھینچ سکتا ہے۔ وہ "تنگیٔ چشمِ حسود" رکھنے والی بھدّی پیشانی۔ وہ رخسار اور ابرو کی ہڈیوں کا افقی اُبھار، وہ ٹیبل لیمپ قسم کی چوڑی چکلی ناک۔ وہ کچی کلیجی کی طرح کالے کالے ہونٹ اور اس پر وہ دیمک خوردہ مونچھ اور داڑھی۔

"اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی"[۱]

بعض جگہ نیاز فتح پوری واقعہ کا انتخاب اور جزئیات کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور طنز کی شگفتگی کم اور زہرناکی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک نواب صاحب کو جو عازمِ حج ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میرے لئے آپ جارجیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آئیے گا۔ اور یہ ناممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی۔ لیکن خاکِ شفا اور زمزم کے پانی سے اسے علاحدہ ہی رکھیئے گا، ورنہ ممکن ہے خراب ہو جائے۔"[۲]

یا ایک دوست کو جو میر صاحب کے ساتھ ان کے گھر مہمان ہونا چاہتے ہیں، لکھتے ہیں:

"آپ شوق سے میرے یہاں قیام فرما سکتے ہیں۔ لیکن قبلہ میر صاحب کی مہمان داری ان کے شایانِ شان مجھ سے ممکن نہیں۔ ان کے زہد و تقدس کا مجھے اعتراف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت کھلے ڈلے انسان ہیں۔ لیکن یہ رات بھر کی ہُو حق میری برداشت سے باہر ہے۔ علاوہ اس کے، ایک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل میرے ایک دوست، میرے ہی مکان پر رہتے ہیں اور بہت صبح اُٹھ کر ریاض کرتے ہیں۔ ممکن ہے میر صاحب کی شب بیداریوں میں ان کی موسیقی حائل نہ ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے گانے میں کوئی ہرج واقع ہو اور یہ مجھے گوارا نہ ہوگا۔"[۳]

نیاز نے ایک خط میں جنت کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ لیکن اس بیان میں غالب

---

[۱] مکتوبات نیاز ج ۲، ص ۱۱۵ و ۱۱۶۔ [۲] مکتوبات نیاز جلد دوم ص ۸۲۔ [۳] مکتوبات نیاز جلد دوم ص ۲۰۰

کی سی شگفتگی نہیں ہے ابتذال اور سوقیت ہے۔

" حوروں کی آرزو کیا کروں۔ جانتا ہوں کہ من وسلوٰی کھانے والے بھی لہسن و پیاز پر اُتر آئے تھے۔ سونے، چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے۔ جیب کراتنی ایمنٹ بھی فروخت کر کے یورپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ رزرو نہیں کراسکتا۔ رہ گئے پھل، سو آپ جانتے ہیں کہ یہاں یوں ہی نزلہ کا زور رہتا ہے۔ چہ جائیکہ اس پر پھلوں کی بھرمار۔ جو سریع الاستحالہ ہونے کی وجہ سے فوراً خلط غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں[1]"

نیاز فتح پوری جب زہد اور مولویت پر قلم اُٹھاتے ہیں، تو اپنے طعن وطنز کا سارا ترکش ختم کر دیتے ہیں :۔

" آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ "محرابِ دعا" سے حلقۂ دام تیار کرنے والے باوجود کوتاہ آستینی" کے "انتہائی دراز دستی" سے کبھی نہ چوکنے والے اور وہ سب کر گزرنے والے جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے، ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنھیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہیئے کہ جب تک آپ انہیں پھوڑ نہ ڈالیں، راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں تک کو کھالیا۔ قوموں کو ہضم کر لیا۔ مذہب کیا چیز ہے۔ یہ ملک وملت کے لئے بیماری ہے اور بیماری بھی دق کی استقسا کی جس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اس لئے اگر اتنے طویل وتلخ تجربہ کے بعد، اس سے کوئی توقع فلاح کی رکھیئے تو اس کے "اہل جنت" ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

" لڑکپن میں ایک طرف حجام تمہاری سر تراشی کیا کرتے تھے اور دوسری طرف مولوی تمہاری دماغ خراشی۔ کیا سمجھ سکتے ہو کہ خدا اگر ہے تو وہ منطقی حدود سے بالاتر ہے[2]"

نیاز کی بے زاری مولویوں سے مسلّم ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ان کے دوستوں میں

---

[1] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۱۱۵، ۱۱۶ ۔ [2] ۔ نگار (لکھنؤ) نومبر ۲۷ء ص ۱۵۔

کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ان ہی کے الفاظ میں القارعہ کی عین استفراغ کی حد تک نکالتے ہیں اور جن کے چہرے وضو کرتے کرتے اچھے خاصے کمبخت بن گئے ہیں۔

نیاز کے خطوں میں ایسے مواقع بھی۔۔۔ ہیں جب ان کی عبارت کو پڑھ کر ہمارے اندر شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اور ان کے طنز میں زہرناکی نہیں لیکن تیزی باقی رہتی ہے۔ اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میں انیسویں صدی کی چیز ہوں، جب خشک سالیوں میں بھی لوگ تر دامنی کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے۔ اور آپ بیسویں صدی کے پیداوار ہیں۔ جب باوجود خوش خیالی کے بھی عشق میں کسی کا بُرا حال دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہمارے زمانے میں دُنیا اتنی عقلمند نہ تھی۔ حُسن زیادہ دلکش رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن جوانی ضرور اندھی تھی۔

"دیدن ہماں و دل دادن ہما"[۱]

نیاز کی شوخیاں ان خطوں میں بہت زیادہ ہیں جو انہوں نے عورتوں کو لکھے ہیں:۔

"بارے آپ نے یاد تو کیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ برہم ہو گئیں۔ اور آپ کبھی نہ بولیں گی۔ میری سمجھی ہوئی کوئی بات بھی آج تک صحیح نکلی ہے۔ جو یہ صحیح نکلتی۔ اور سچ پوچھئے تو اسی امید پر جی رہا تھا۔ ڈرتا ہوں اس وقت سے جب مجھے آپ کی محبت کا یقین آجائے کہ پھر تو آپ کی عداوت مسلّم ہے۔"[۲]

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"عنایت نامہ پہنچا۔

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنام ناتمام کسے

جاں کنی کا لطف جب ہے جب شاہد و مشہود دونوں یک جا ہوں۔ آپنے

---

[۱] مکتوبات نیاز ج ۲ ص ۱۹۔ [۲] نگار لکھنؤ، ص ۱۷۴۔

کوئی الزام قائم کیا۔ میں نے اسے رد کر دیا۔ آپ کو اس پر غصہ آیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی پہ آپ کی برہمی اور بڑھی۔ میں ہنس پڑا۔[1]

نیازؔ کو اسلوبِ بیان پر بڑی قدرت ہے۔ جدّت طرازی کے جیسے اچھوتے نمونے ان کے یہاں ملیں گے وہ مکتوباتی ادب کے گوہرِ نایاب ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"جب تک خواہش کا اظہار صرف آنکھوں سے ہو رہا ہے وہ "تمنا" ہے لیکن زبان سے کہا اور اس نے گدائی کی صورت اختیار کی۔ پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ جو اتنا شدید احمق ہو اس کو مجبور کرنا کہ وہ کہے اور بار بار کہے کتنی عظیم الشان دانائی کی ذمّہ داری اس کی گردن پر رکھتا ہے"۔[2]

ایک دوست سے رنج پہنچتا ہے۔ ان کو لکھتے ہیں:۔

"درِ توبہ کبھی بند نہیں ہوتا" یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمہارے اعتراف کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ بت شکنی کا کفارہ "تعمیرِ کعبہ" سے بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہاری چھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے"۔[3]

نیازؔ کے قلم سے ڈھلتے ہوئے جملے نکلتے ہیں۔ بیان کی ندرت اور شوخی، اور طرزِ ادا کی صفائی اور شائستگی ان کی بلائیں لیتی ہیں۔ ان کے یہاں دورِ مغلیہ کے مصوّروں کی سی نفاست اور نازک کاری اور قدیم انشاء پردازوں کی سی مہارت اور صنع طرازی ہے۔ یہ انداز اس وقت پیدا ہو سکتا ہے کلاسیکی ادب کا ذوق خوب رچا ہوا ہو اور نثر میں داخلہ شاعری کے دروازہ سے ہوا ہو۔ اپنے مے کدہ کے سب سے "پرانے"؟ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جس وقت وہ داڑھی صاف کرا کے، بالوں میں خضاب لگا کر، مونچھوں کو کاسمٹک سے نوکیلا بنا کر بیٹھتے ہیں۔ اس وقت دیکھو کیا عالم ہوتا ہے۔ وہی دلکشی

---

[1] نگار (لکھنؤ) ص ۱۸۸۔ [2] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۲۲۔ [3] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۲۲۸۔

رعنائی، وہی ولولۂ برنائی، وہی دہکتا ہوا شباب وہی ٹپکتا ہوا شباب"۔[1]

بعض جگہ وہ مصرعوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں :۔

" کیوں صاحب، یہ کیا بات ہے کہ سوال عمرؔ، زید، بکر کا آیا تو

" التفات کے دریا بہا دیئے"

اور " چوں نوبتے بماشد آتش بجام کردند"[2]

" ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی"

اپنے دوست کو لکھتے ہیں :۔

" اے! کیا پوچھتے ہو" کیا کر رہا ہوں؟ نہ یادِ رفتگاں کا مشغلہ ہے کہ کچھ دیر اُس سے جی بہلے، نہ عشقِ بتاں کا حوصلہ کہ کچھ وقت سر ٹکرانے میں گزر جائے۔ اب تو حال کی سوگواریاں ہیں یا مستقبل کی حوصلہ فرسائیاں۔ جیوں تو کیوں کر، اور مروں تو کیوں کر۔ جب تک وہم اور خیال کی دُنیا میں جیتا تھا" چشم وا کردں زمیں تا آسماں آغوش داشت۔" لیکن اب کہ تعینات و حقائق کے خبط میں مبتلا ہوں:" سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے۔"[3]

ایک شاعر کو لکھتے ہیں جو مشاعروں میں مارے مارے پھرتے ہیں :۔

" ماشاءاللہ کیا کہنا۔ جبیں سائی کا نام آپ نے قسمت آزمائی رکھا ہے۔ تدابیرِ انسانی کی ناکامی کوئی ایسا تجربہ نہیں، پرجس پر حیرت کی جائے۔ لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا عبد اور معبود دونوں کے لئے شرمناک ہے"۔[4]

یہ خط ملاحظہ ہو۔ نیازؔ کی انشار پردازی کا بڑا دل کش نمونہ ہے :۔

" اللہ اللہ، آپ تشریف لا رہے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ کی نظر نہ لگ جائے۔ حجرۂ فلک سے جھانکتے جھانکتے کہیں حوریں نہ زمیں پر آرہیں۔ کہیں کروبیاں عالم قدس میں تسبیح و تہلیل نہ بھول جائیں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ

---

[1] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۲۷۸۔ [2] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۷۱۔ [3]

آتے آتے رہ جائیں۔ امے، کیوں بے وقوف بناتے ہو، تم اور وعدہ پورا کرو۔ سچ کہتا ہوں جس دن ایسا ہوگا تو آسمان پھٹ جائے گا، زمین شق ہوجائے گی اور ہم اور تم دونوں اس میں سماجائیں گے۔ آپ تو مہربانی فرما کر وہیں چھپے رہیے آپ نصب کر دیئے گئے ہیں، گلگشت کی ضرورت نہیں۔ چمن والے یوں ہی تباہ ہیں۔"[1]

نیاز نے بعض جگہ قافیہ پیمائی کی ہے اور اس طرح عبارت کے لطف کو بڑھا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

"میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ عالم پناہ۔"[2]

"میں نے نہ کبھی اپنے دعوئی خلوص کو ذریعۂ افتخار سمجھا، نہ اخلاقِ گرامی کو وسیلۂ کار۔"[3]

ان کی عبارت کا تانہ بانہ ریسمانِ شعر سے بنایا گیا ہے۔ اشعار کی کثرت بلاشبہ ناگوار گزرتی ہے لیکن بعض جگہ مصرعے عبارت کا جزو بن گئے ہیں۔ مثلاً :۔

"غارت گرِ ہوش ! زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی۔"[4]

یا "ماشاء اللہ، کیا کہنا ہے۔ آپ اور مدارج خلوت و محبت پر وعظ فرمائیں۔ یعنی "وہ" "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔"[5]

یا "اگر آپ نے بے گناہ کے خون سے دامن آلودہ کرنے کا عزم کر لیا ہے، تو بسم اللہ۔ شوق سے خنجر اٹھائیے۔" "لہو پکارے گا آستیں کا۔"[6]

نیاز کو بات میں بات پیدا کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ اس نکتہ یابی میں ذہانت اور شوخی نے گنگا جمنی لہریں پیدا کر دی ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" ایک عرصہ سے آپ نے یاد نہیں فرمایا۔ میں نے تو اس خیال سے مراسلت میں تقدیم نہیں کی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اور آپ نے اس لئے پروا نہیں کی کہ میں کبھی آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جو کبھی خفا ہونا نہ جانے، اس کو پوچھنا ہی کیا۔ اللہ اللہ، کیا

---

[1] مکتوباتِ نیاز ج ۲، ص ۲۳۸/۲۳۹۔ [2] ایضاً ۱۶۵۔ [3] ایضاً ص ۹ ۱۲۔ [4] ایضاً ص ۱۷۲۔ [5] نگار اکتوبر ۱۹۳۶ء، عنوان مکتوباتِ نیاز [6] ایضاً۔

فرقِ مراتب ہے۔[1]

نیازؔ اپنے خطوں میں اشارہ و کنایہ سے خاص طور پر کام لیتے ہیں۔ جس سے بھولی بسری یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ اور تخیّل کے لئے گنجائش نکل آتی۔ یہ اسلوب اس جگہ "خاص طور پر کامیاب ہے، جہاں انہوں نے تلمیحات کو برتا ہے۔

"باور کیجئے کہ میرا مقصود بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ آپ مجھے بھلا نہیں۔ رہا یہ امر کہ جو طریقہ میں نے اختیار کیا وہ درست تھا یا نہیں۔ سو شوق و نیاز کی دنیا میں اس کا معاملہ نہیں ہوتا۔ مصر کے بازار میں یوسف کی خریداری کے لئے ایک بڑھیا صرف سوت کی انٹی لے کر گئی تھی۔"[2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

"آپ وہاں جارہے ہیں تو کس اہتمام کے ساتھ، اس کی خبر نہیں۔ (یوسف) تو خیر پیغمبر تھے کہ الزام عائد ہوا تو صفائی میں قمیص کا پچھلا دامن پھٹا ہوا دکھا دیا اور لوگوں نے اسے مان بھی لیا۔ لیکن آپ اپنی چاک دامانی کو کیوں کر چھپائیں گے۔"[3]

ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

"اچھا ہوا تمہارا تبادلہ وہاں سے ہوگیا۔ لیکن ہمیں کیا۔ دمشق میں قحط سالی ہو یا نہ ہو، لیکن تمہاری فراموش کاری کو تو بہر حال قائم رہنا ہی ہے۔"[4]

نیازؔ اس گُر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ خطوں میں اگر بے تکلفی نہ ہو تو وہ بے مزہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے یہ بے تکلفی ہر ممکن ذریعے سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"اللہ اللہ یہ برہمی۔ خوبصورت پیشانی کی یہ خوبصورت شکنیں۔ پھولوں سے رخساروں کے نیچے یہ دہکتی ہوئی آتشِ گل۔ یہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے نکلنے والے شعلے۔ معاذ اللہ۔

"آتشم تیز ست و داماں می زنم"[5]

---

[1] مکتوبات نیاز ج ۲ ص ۹۴-۹۵ [2] ایضاً ص ۲۱۹ [3] ایضاً ۱۶۱ [4] ایضاً ۳۰۲۔ [5] مکتوبات نیاز ج ۲ ص ۹۴، ۱۵۲

ایک اور مثال ملاحظہ ہو :-

" بجا ارشاد ہوا" یہ سارا فتنہ میرا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ میں ہی اودھ سے دامن کشاں گزرتا ہوں۔ اور میرے ہی لئے

غبار اُٹھ اُٹھ کے رہ جاتا ہے اکثر خاکِ بسمل کا

کیوں نیا بنایا گھر بگاڑتے ہو۔ اور کیوں وہ بات کرتے ہو جو شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے[1] "

نیازؔ نے بعض جگہ چند لکیروں سے تصویریں کھینچی ہیں۔ لیکن وہ بے ساختہ اور مؤثر ہیں :-

" بھئی" مجھے کیا معلوم تھا کہ جا ہوں گا اچھا اور ہو جائے گا بُرا۔ بہ خدا میری نیت یہ تھی کہ کسی طرح ان دونوں کی صلح ہو جائے۔ لیکن وہاں تو قیامت برپا ہو گئی۔ آستینیں چڑھ گئیں۔ منہ سے جھاگ اُڑنے لگا۔ اور اگر خان صاحب موجود نہ ہوتے تو شاید خون کے فوارے جاری ہو جاتے۔ لاحول ولا قوۃ کس قدر خفیف ہوا ہوں۔ اور کتنی ملامت کی ہے میں نے اپنے آپ پر[2] "

ایک خط میں منشی امیر اللہ تسلیم کا نقشہ کھینچا ہے :-

" ہاں، میں نے منشی امیر اللہ تسلیم کو دیکھا ہے۔ ان سے ملا بھی ہوں۔ ان کی شاعری کا بھی معترف ہوں۔ میرا عنفوانِ شباب ہے اور ان کا زمانۂ شیب۔ یعنی میری مسیں بھیگ رہی ہیں اور وہ دَورِ پُرافشانی سے گزر رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر جھریوں کا یہ عالم جیسے کپڑے پر الٹو کر دیا ہو۔ یہ ہے ان کی ہیئت کذائی۔ بغیر عصا کے سہارے ایک قدم چلنا دشوار ہے۔ سماعت اور بینائی تقریباً مفقود۔ کمر جھکی ہوئی۔ بروت سب برف کے گالے کی طرح سفید۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ لیکن خوش دلی اور خوش مزاجی کا یہ عالم کہ گویا جوانی ابھی آئی ہے[3] "

---

[1] مکتوبات نیاز ج ۲ ص ۱۳۱، [2] ۲۴۲ [3] ۵ رر ۱۵۲

" ایک خط میں برسات کے خُلد فروش موسم کا ذکر کیا ہے :۔

" جانِ عالم ۔ کیا بتاؤں کل شام سے کس عالم میں ہوں ۔ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے ہیں ۔ اور کوندا لپک رہا ہے ۔ بادل گرج رہے ہیں ۔ ہوائیں چل رہی ہیں ۔ اور میگھ برسے ۔ دن میں سانولا پن تو دوپہر ہی سے تھا، لیکن شام کو شیام رنگ محفل ایسی جمی، ایسی رچی کہ اب کیا کہوں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کنور کنھیا پاؤں میں گھونگرو باندھے ہوئے بانسری بجا رہے ہیں ۔ بے تابانہ رقص کر رہے ہیں ۔ اور شاید پاؤں کی آخری ضرب، گھونگرو کی جھنکار اور بانسری کے آخری بول کے ساتھ بساطِ عالم بھی ہمیشہ کے لئے اُلٹ دی جانے والی ہے " [۱]

" اُردو کے انشار پردازوں میں نیاز کی حیثیت بہت ممتاز ہے ۔ وہ شروع میں ادبِ لطیف کی طرف جھکے رہے ۔ لیکن اس لٹریچر کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ اس نے ہمیں ایک دلکش نقاد بھی دیا ۔ اُن کی تنقیدوں میں ماضی کا رس اور حال کا احساس ہے ۔ ان کی شعریت اور جمالیت نے اس میں رعنائی و زیبائی پیدا کر دی ہے ۔ ان کا ادبی شعور گہرا اور ان کی جمالی حس بہت نازک ہے ۔ اس کا اندازہ بآسانی ان تنقیدوں سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مکتوبات کے پیرائے میں کی ہیں ۔ انہوں نے تسلیم لکھنوی [۲] اُردو طنز و مزاح [۳] ۔ اقبال [۴] ۔ ناسخیت [۵] ۔ مومن [۶] جلال [۷] منظومات جدید [۸] اور انقلابی شاعری [۹] کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں فنی گہرائی، شیرینی اور شگفتگی ہے ۔

نیاز کے خطوط سے ان کی سیرت اور معتقدات کے متعلق قطعی رائے قائم کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے ۔ اس لئے کہ ان کی " تعمیر " میں ایک صورت خرابی کی بھی مضمر ہے ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ سب سے دلچسپ خطوط وہ ہوتے ہیں جو

۱ ،، ۱۳۱ ۔ ۲ مکتوبات نیاز ج ۲، ص ۱۶، ۱۷، ۳ مکتوبات نیاز ج ۲، ص ۱۱۳، ۴ ،، ،، ،، ،، ۱۲۵

۵ ،، ۱۳۱، ۶ ،، ،، ۱۳۶، ۷ ،، ،، ۱۵۰، ۸ ،، ،، ۱۹۵، ۹ ،، ،، ۲۱۶

تلف کر دیئے جائیں یا منظرِ عام پر نہ آئیں۔[1] نیاز فتح پوری نے ان خطوں میں تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا ہے جو آئینہ کی طرح دمکتا ہوا ہے۔ وہ زندہ رہنا اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا چاہتے ہیں۔ مشرب پروانہ رکھتے ہیں اور جُرمِ محبت کی سزا میں دوزخ میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ دوستی کے سلسلے میں وہ سراپا رہن عشق ہیں اور ایک مرتبہ رہنِ محبت ہونے کے بعد انہوں نے کبھی اپنے آپ کو واگذاشت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں نرمی، دردمندی، خودداری اور غیرت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ عورت کی حمایت پر کمربستہ ہیں۔ ترقی پسند تحریکوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آزاد ملک، آزاد فضا، آزاد خیال لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں خیام کا فلسفہ اتنا عزیز تھا جتنا اس کا عمل۔ وہ مخالفت کی پروا نہیں کرتے، اور خذف ریزوں کو ٹھکراتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ظواہر و رسوم کو پسند نہیں کرتے۔ اور انسانیت کو سب سے بڑا خدا سمجھتے ہیں۔

اصلی نیاز تک ہماری رسائی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ انہیں خود پوشی میں کمال حاصل ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ خطوط سیرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اور انسان کے اصلی جذبات اور خیالات کا جتنا صحیح اظہار خطوں سے ہوتا ہے، اتنا کسی اور ذریعے سے نہیں۔ مگر بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ بات سب خطوں پر صادق نہیں آتی۔ جسے پردہ داری منظور ہے اور اس کا سلیقہ بھی رکھتا ہے، وہ خطوں کو بھی اپنی اور تحریروں کی طرح اخفائے حقیقت کا ذریعہ بنا لیتا ہے بلکہ اکثر یہ ذریعہ اور ذرائع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والا اپر تکلف سادگی اور ساختہ، بے ساختہ پن کے پردے میں بات کو اس طرح چھپاتا ہے کہ پڑھنے والے کو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔[2]

نیاز کے خطوط بے لاگ نہیں ہیں۔ ان کا سلسلہ عشق و محبت کا سا معاملہ ہے۔ "جس طور پر محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی، اسی طور پر خط لکھ جاتا ہے، لکھا نہیں جاتا۔"[3]

---

[1] نگار لکھنؤ ج ۲ ش ۱ ص ۱۹۔ [2] اردو خطوط۔ تعارف ص ۲ کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی [3] نگار ج ۱۷ ش ۱ ۱۹۴۲ء

نیازؔ نے معصیت کا علاج سکرات سے کیا ہے۔ اور حقائق سے آنکھ نہیں ملائی، گمراہی ہے، اس لئے ان کے مکتوبات میں "غیر ذمہ دارانہ بشارتیں" اور "غفلت زا طرب انگیزیاں" ہیں۔ ان کی شہرت کا تمام تر انحصار ان کے شگفتہ اور پختہ اسلوب پر ہے، جس کی چمک دمک ابھی بہت دنوں تک قائم رہے گی۔

پروفیسر یوسف سرمست

نیاز کی مزاح نگاری

سنجیدگی جہاں بھی اور جس صورت میں بھی ہو ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن تبسمِ گل سے قلقلِ مینا تک ہنسی اور خوشی کی اتنی صورتیں اور کیفیتیں ہیں جن کی کوئی حد ہے نہ شمار۔ لیکن مزاح کی رنگا رنگی اس کی درجہ بندی کو آسان بنا دیتی ہے۔ مزاح پھکڑ بازی سے شروع ہو کر فحش، ضلع جگت، ہزل گوئی، ہجو، پھبتی، تمسخر، استہزا، ظرافت، طنز، چٹکلے بازی، لطیفہ گوئی، دل لگی، حاضر جوابی اور شوخی کو اپنے دائرے میں لیتا ہوا ایک انبساطی کیفیت تک پہونچ جاتا ہے۔ مزاح پیدا کرنا خواہ تحریر میں ہو یا تقریر میں بہت مشکل ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ زندگی کی حقیقت نہیں زندگی سے فرار کا ایک راستہ ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقت کی ٹریجڈی موت ہے۔ یہ اتنی مستقل اور اتنی محکم حقیقت ہے جس سے کہیں بھی اور کسی طرح بھی مفر نہیں ہے۔ انسان کی زندگی آغاز سے انتہا تک غم کی پرچھائیوں سے مملو ہوتی ہے۔ وہ روتا ہوا آتا ہے اور رلاتا ہوا جاتا ہے۔ اس لئے حد درجہ خوشی میں بھی آنسو ہی نکل آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں غم کا یہ استقلال صرف مسرت کو اہمیت ہی نہیں دیتا، بلکہ اسے خود زندگی بنا دیتا ہے۔ لیکن زندگی میں مسرت کا ارتکاز کچھ بے جوڑ سا نظر آتا ہے۔ اس لئے مزاح کا وہ انداز جو قہقہہ آنگیز ہو بڑا ہی وقتی ہوتا ہے۔ قہقہہ دیر تک نہیں لگایا جا سکتا اور اگر کچھ دیر قہقہہ لگایا

جائے تو اس کے بعد بڑی ہی خاص پژمردگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہم یہ سوچنے یا کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "بھئی آج تو بہت ہنسے"۔ اس کے برخلاف ایک نشاطیہ یا انبساطی کیفیت بڑی دیر تک قائم رہتی ہے۔ اور اس کے ردِّ عمل کے طور پر بھی کوئی دوسری کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لئے مزاح کی وہ قسم جو بعض وقت تبسم زیرلب بھی پیدا نہیں کرتی۔ سب سے اعلیٰ اور بالکل فطری ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے مزاح میں ہونٹ کھلیں یا نہ کھلیں، دل کی کلی ضرور کھلتی ہے۔ مزاح کی یہ قسم بڑی لطیف ہوتی ہے اور بہت ہی دیرپا۔ ایسا مزاح ایک انبساطی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور یہ کیفیت غم کی اس کیفیت کے عین مطابق، لیکن اس کے برعکس ہوتی ہے جس کے لئے کہا گیا ہے۔ "دل پر گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے"۔ جس طرح غم میں یہ کیفیت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اسی طرح خوشی کی یہ حالت زیادہ مسرّت زا ہوتی ہے۔ مزاح نگاری کا یہ انداز اردو میں بہت کم یاب ہے۔ شوخیِ تحریر کے ایسے دلآویز مرقعے غالؔب کے پاس یا پھر نیاز کے ہاں کثرت سے نظر آتے ہیں۔

نیاز کی شوخی تحریر کی انبساط رائی کی آماجگاہ خاص طور پر ان کے خطوط ہیں۔ خطوط کا شخصیت کا براہِ راست انداز میں اظہار ہوتا ہے۔ اور شخصیت کی طرح داری لطیف مزاح کی سب سے اوّلیں شرط ہے۔ مزاح کے کیف کم کا انحصار بالکلیہ شخصیت کے لطف و کرم پر ہوتا ہے۔ گہری ظرافت شخصیت کے احتجاجی انداز کی غماز ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مزاح نگار خود قہقہہ لگاتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی قہقہہ لگانے کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ وہ مختلف چیزوں کی مضحکہ خیزی کو نمایاں کر کے ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔ یہ ہنسنا ہنسانا اصل میں احتجاج ہوتا ہے۔ اور قہقہوں میں نفرت اور بیزارگی کو چھپایا جاتا ہے۔ اور یوں لطیف مزاحی کیفیت برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے مزاح کی لطافت کا دار و مدار شخصیت کی فلسفیانہ بے تعلقی سے ہوتا ہے۔ بے حسی پر بہر طور نہیں۔ کارزارِ حیات کو

ایک استغنا آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے اور مسکراتے ہوئے اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھنے والا ہی لطیف ترین مزاح پیدا کرتا ہے۔ مزاح کی لطافت زندگی سے پیار اور اس کو برتنے کے سلیقہ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ نیاز کا لطیف مزاح ان کی شخصیت کے بانکپن کے انعکاس کا نتیجہ ہے۔

نیاز کے مزاح کی لطافت اپنی شدید صورت میں انبساطی کیفیت سے بڑھ کر کبھی کبھی تبسم زیر لبی تک بھی پہنچتی ہے۔ لیکن مزاح کی اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے سنجیدگی سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سے ان کا مزاح پُر لطف بن جاتا ہے۔ نیاز کے اس خاص رنگِ مزاح کی روشن مثال ان کا یہ خط ہے۔ گو یہ طویل ہے لیکن اس کی طوالت میں اس کی خوبصورتی مضمر ہے اس لئے صرف اقتباس پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ لکھتے ہیں:۔

"آپ کی تحریر جس کے لفظ لفظ سے آپ کا اضطراب ٹپک رہا ہے کل شام کو مجھے ملی۔ یقیناً آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے اس قدر جلدی جواب دینے میں کیوں کی۔ جب کہ آپ کے خیال کے مطابق کم از کم دو چار دن تو دریافت حال کے لئے ضروری تھے۔ سُنیئے مجھے تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں کیونکہ میں ان کو خوب جانتا ہوں گو وہ مجھے نہ جانتی ہوں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ آپ کی شناسائی کب کی نکل آئی؟ بہر حال اگر یہ خواہش خود انہیں کی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ابھی تک آپ صرف تمنا ہی تمنا پر جی رہے ہیں تو میں اس اقتران کی مخالفت کروں گا۔ آپ کے اور ان کے مزاج میں وہی تفاوت ہے جو میرے اور قاضی صاحب بھوپال کے مزاج میں، آپ ٹھیرے "ہنسوڑ" کہ پہلے ہنس لینا اور پھر بات کرنا اور وہاں متانت و سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی اس وقت تک کسی نے ان کی پیشانی کو شکن سے خالی دیکھا ہو۔ مجھے نہیں معلوم مگر سُنا ہے کہ اپنے فن پر اور شاید صورت پر بھی اتنا پندار ہے کہ وہ کسی سے کھل کر بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علاج وہ اچھا کرتی ہیں اور چند دن میں خاصی

شہرت انہوں نے حاصل کر لی ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ تمہارے دردِ دل کا علاج کر سکیں۔

صورت کے لحاظ سے انہیں "جمیل" تو "یقیناً" نہیں کہہ سکتے۔ لیکن دلکش ہونے میں کلام نہیں۔ رنگ کھلتا ہوا سانولا (جو شباب کے زمانے میں واقعی قیامت ہوتا ہے) کشیدہ قامت، دراز گردن، بڑی بڑی آنکھیں، لچکیلا بدن، کتابی چہرہ، یہ ہیں ان کی جسمانی خصوصیات۔ رہے معنوی محاسن، سو یہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ لکھنؤ کی گریجویٹ اور دہلی میڈیکل کالج کی فاضل ڈاکٹر ہیں، عمر ۲۶، ۲۷ سال کی ہو گی لیکن چہرے کی نرمی سترہ اٹھارہ سال کی سی ہے۔ تہذیبِ جدید کی جتنی رعنائیاں ہو سکتی ہیں وہ بھی سب ان میں موجود ہیں، خصوصیت کے ساتھ رفتار تو واقعی قیامت ہے۔ پھر اب پوچھو کہ میں تمہارے لئے کیوں موزوں نہیں سمجھتا۔ ایک سبب تو ابھی بیان کر چکا ہوں کہ ان کی تنک مزاجی تمہاری خوش مزاجی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے فن کو کبھی کسی حال میں ترک نہ کریں گی اور تمہاری رشک نہ کرنے والی طبیعت غالباً اسے گوارا نہ کرے، تیسرے یہ کہ نقاب وہ اپنے چہرے پر ڈالیں گی نہیں اور تمہارے والد بے پردہ انہیں گھر میں گھسنے نہ دیں گے اور چوتھا سبب جو سب سے بڑا مانع اس ازدواج کا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اس نام کی ڈاکٹرنی کوئی ہی نہیں، یہ تم کو کس نے بیوقوف بنایا ہے، مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

کسی بھی تحریر کی خوبی اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ وہ قاری کے تخیّل کو مہمیز لگائے۔ اور تخیل دیر تک تحریر کے مختلف پہلوؤں سے لذّت یاب ہوتا رہے۔ مندرجہ بالا خط کے اختتام میں جو مسرّت انگیز اچانک پن ہے وہ قاری کے تخیّل کی بھی آبیاری کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس میں ایک لطیف مزاح پیدا ہوتا ہے۔ قاری تحریر پڑھتے ہوئے اپنے تخیّل کے ذریعہ لیڈی ڈاکٹر کے پیکر کو تراشتا ہے اور جب یہ مجسمہ تخیّل میں سانس لینے لگتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو کچھ "ہی نہیں" اس کے بعد اس کا تخیّل فوراً مکتوب الیہ کی حالتِ زار کا اندازہ کر کے خیال ہی خیال میں مزے لیتا ہے۔

نیاز کا مزاح ایک ایسے تاثر کی تخلیق کرتا ہے جسے کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ

اس میں "تیر نیم کش" کا انداز اپنی ساری تکمیل کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اور جس کی خلش لذتِ زخم جگر بن جاتی ہے۔ نیاز کی شوخیٔ تحریر ایک حسین یاد بن کر دل و دماغ میں محفوظ رہ جاتی ہے چنانچہ ڈاکٹرنی والا خط جب میں نے ایک ایسے پروفیسر دوست کو سنایا جو بڑا ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ تو انھوں نے کہا "میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیاز کی تحریر کو کوئی بھی کبھی نہیں بھلا سکتا کیونکہ حسن خواہ تحریر کا ہو یا کسی اور چیز کا کبھی کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز کی شوخ تحریریں کیٹس کے اس خیال کا کہ ایک خوبصورت چیز ہمیشہ کے لئے مسرت بخشتی ہے (A THING OF BEAUTY IS A JOY FOR EVER) محکم ترین ثبوت ہیں۔ مزاج کی سنجیدگی کی اس دلنشینی کو دیکھئے:

تمہاری سب سے پہلی تحریر مجھ تک پہونچی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہی باتیں تمہاری زبان سے سنتا تو کیا ہوتا ..... تمہیں خبر نہیں لیکن ہوا یہی!

میں نے تمہاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر حرفوں کی ہر کشش کو سمجھ کر، کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لے کر میں نے تمہاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و نکہت کے نقش کے لئے مخصوص ہے اور میں اس میں محو ہو گیا۔ تو کیا میں بتا ہی دوں کہ میں نے تمہاری تحریر کے اندر چھپا ہوا میں نے تم کو کیسا پایا؟ .....

معاف کرنا، ممکن ہے کہ کوئی بات خلاف حقیقت ہو یا تمہارے ذوق کے خلاف لیکن جب میرا یہ خط تم تک پہنچ ہی نہیں سکتا تو پھر یہ اندیشہ کیوں ....؟

اچھا تو سنو اب تم اپنا سراپا ..... کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ لیکن مجھے اس قدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ویسی نہ نکلیں تو مجھے افسوس ہوگا۔!

کھلتا ہوا سانولا رنگ، یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے اور کیفیات پر ختم ... وہ جسے دیکھ کر چھونے کو جی چاہے اور ہونٹوں پر بے اختیار کپکپی سی محسوس ہونے لگی .... معاف کرنا میرے ہاتھوں نے بھی تمہیں چھوا،

اور میرے لبوں نے بھی تمہارے لبوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑیوں کی طرح نازک تھے .... میں نے تم کو نحیف و ناتوان پایا، لیکن اپنی رعنائی و کشیدہ قامتی کے لحاظ سے تمہیں ایسا ہونا ہی چاہیئے .... تمہارے بال بہت سیاہ تو نہیں، لیکن ان میں ایک خاص قسم کی چمک ہے اور تھوڑا سا گھونگر بھی کنپٹی کے بالوں میں مجھے نظر آتا ہے ..... پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک میگوں رنگ ابھری ہوئی مانگ تک چلی گئی ہے ... بھویں کافی چوڑی ہیں اور ایک نہایت ہلکی عنبری لکیر ان دونوں تلواروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے ... رنگ کے بعد سب سے زیادہ قاتل چیز تمہاری آنکھیں ہیں ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہنے والی آنکھیں جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی سمندر میں ڈوبتے چلے جانا ہے .... چہرہ کتابی .. گردن کھنچی ہوئی تناسب اعضا کانٹے پر تلا ہوا ... اور چال ایسی جیسے ناگن راستہ کاٹتی ہوئی سامنے سے گزر جائے۔ عمر تم خود ہی بتا چکی ہو ۲۰ سے کم اور پندرہ سے زیادہ۔ غالباً ۱۸ سال یہ تھی تمہاری وہ تصویر جو میں نے تمہارے سب سے پہلے خط کو دیکھ کر اپنے دل پر نقش کی تھی اور اگر میں یہ سب کچھ پہلے لکھ دیتا تو شاید تم اسی وقت لکھ بھیجتیں کہ "آئندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے" میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہو جاؤ اور میں تم کو ایسے لفظ سے خطاب کر سکوں جو تمہاری خوبصورت پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے۔ لیکن اچھا ہوا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ لپیٹا طا الٹ دی گئی اور تم نے زندگی کی اس تلخ حقیقت کو جان لیا کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں"

الفاظ کے ذریعہ تصویر کشی کرنا صرف نیاز کا حصّہ ہے۔ ان لفظی مرقعوں کے شوخ و شنگ رنگ اس درجہ شگفتہ و شاداب رہتے ہیں کہ جن کو دیکھنے سے روح اہتزاز کرتی ہے۔ اردو ادب میں ایسی لفظی مجسمہ سازی نیاز کے سوا کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ نیاز کی تحریر میں حسن کا ذکر ہمیشہ مسرت کی کیفیت پیدا کرتا

ہے۔ جیسے اس خط میں بھی :۔

"پھر ایک بات اور ہے جو صرف کان میں کہنے اور اشارہ سے بتانے کی تھی۔۔۔ مگر مجبوراً لکھنا پڑتی ہے۔۔۔۔۔ کہ حزیں کو بنارس میں "ہر برہمن لچھمن و رام نظر آتا ہے"، یہاں قدم قدم پر "سیتا و رادھا" کا سامنا ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ سو بے پردگی دیوانہ طرح نقاب افگندش۔

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں۔۔۔۔ بلند بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بیندی۔۔۔۔ اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں۔ قامت رعنا کی وہ ادا کہ لچک کر آئینہ بھی شرما جائے، کمر میں وہ لوچ کہ بید کو بھی عار آئے۔

آپ کو واللہ آئیے اور صرف یہ فیصلہ کرنے کے لئے آئیے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس سے زیادہ دیکھنے کی اور سمجھنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ نیاز کی تحریر میں بعض حصے ایسے ہوتے ہیں جنھیں کوشش کے باوجود نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس تحریر کو بھی دیکھئے۔ کوشش کے باوجود بھی آپ اسے بھلا دینے میں کامیاب ہو جائیں تو بات ہے :۔

کفارہ کے سلسلے میں آپ روزے بھی رکھیں گی اور مسکینوں کو کھانا بھی کھلائیں گی، خیر روزہ رکھنے میں تو کوئی حرج نہیں۔۔۔۔ رنگ کھلتا جائے گا، جتنا کہ اڑتا جائے گا۔" لیکن دوسری بات بہت خطرناک ہے۔ آپ نے ہندی کا دوہا نہیں سنا جس کا یہ مفہوم ہے کہ "غربا کو غلہ تقسیم کرنے کی خدمت بہو کے سپرد کی گئی اس خیال سے کہ اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہیں خرچ کم ہوگا، لیکن وہاں ساری دنیا بھکاری بن کر جمع ہو گئی۔"

نیاز۔ اپنی شوخی سے کام لے کر بعض وقت اہم اور سنجیدہ مسائل کو بھی اس طرح حل کرتے ہیں کہ نہ تو مزید بحث کی گنجائش رہتی ہے اور نہ ہی کوئی شک باقی رہتا ہے۔ سنجیدگی سے طول طویل مباحث کے ذریعہ کسی بات کو ثابت کرنا بڑی

ہی عام بات ہے۔ لیکن رندی کو قائم رکھتے ہوئے جنّت کا سودا کرنا حد درجہ ذہانت، بلا کی حاضر دماغی اور بے پناہ شوخیٔ فکر کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک خاتون نیازؔ سے "ختم نبوّت" کے متعلق دریافت کرتی ہیں جس کا جواب نیاز دیتے ہیں :۔

"ختم نبوّت" کے متعلق آپ میری رائے دریافت کرتی ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی کبھی ظاہر کر چکا ہوں اور پھر اسی کا اعادہ کرتا ہوں کہ رسول اللہؐ بے شک نبی آخرالزماں تھے! کیوں کہ اب اگر واقعی کوئی نبی آئے بھی تو اسے مانتا کون ہے۔ پچھلا زمانہ ہوتا تو گاندھی جی بھی رسول ہو سکتے تھے۔ اور وہ تو وہ بھی دعوئ نبوت کر سکتے تھے۔ اور وہ تو وہ .... میں بھی نبی بن سکتا تھا (مسیلمہ نہی قسم کا سہی) اور آپ بھی نبیہ ہو سکتی تھیں ..... بنت اوس کی سی سہی، گو ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی اور ....."

کعبہ کا بت خانہ ہونا ایسی حقیقت ہے جس کا اعادہ اب اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتا۔ لیکن نیازؔ اسی بات کو ایسے زاویہ سے کہتے ہیں کہ بتوں کی خدائی یاد آجاتی ہے

"میں جب کبھی آپ کو خط لکھتا ہوں تو دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ آپ سے خطاب کس طرح کروں آپ تو "محترم" لکھ کر اس فرض سے بہ آسانی سبکدوش ہو جاتی ہیں۔ تصنع و تکلف ہی ٹھیرا نا؟ لیکن میں اس کے جواب میں آپ کو "محترمہ" لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ "احترام" کی حد زیادہ سے زیادہ "حریم کعبہ" تک ہے اور میں آپ کو اس وقت کی چیز سمجھتا ہوں جب کعبہ، کعبہ نہ تھا "بتکدہ" تھا"

نیازؔ نے اپنی زندگی کے متعلق لکھا تھا کہ اُن کی زندگی میں عورت اور مذہب کا بڑا اہم مقام رہا ہے۔ عورت اور مذہب کے ذکر کے ساتھ ہی نیاز کی تحریر شگوفے کھلاتی رہتی ہے۔ ان موضوعات کے ساتھ ادبی نکات کی عطر بیزی بھی شامل رہتی ہے بعض ادبی مباحث پر نیاز بڑے ہی پر لطف انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ شعر کے مفہوم کو متعین کرنے کے بارے میں بعض حضرات جس قسم کی غیر شاعرانہ حرکتیں کرتے ہیں ان کو بیان کرنے میں نیازؔ نے مزاح کے پھول کھلائے ہیں :۔

"غالب کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے ؟۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اگر تم نے یہ بحث شروع کر دی کہ غالب کا یخ گلانے کے فن سے کب واقف تھا یا یہ کہ بلیماروں میں شیشہ گروں کی دوکانیں کہاں تھیں جہاں انھوں نے آبگینہ پگھلوایا ہوگا یا یہ کہ ساغر میں ڈالنے کے بعد کا یخ رقیق کیونکر رہا ہوگا کہ پیا جاسکتا ہے کہ اس کے پینے کے بعد کوئی زندہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ تو سوا اس کا سننے والا اپنا منہ پیٹ لے اور کیا کرسکتا ہے۔

جن اشعار کا تم نے مضحکہ اڑایا ہے ان سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی تم میں نہیں ہے۔

ہوتا ہے ازدحام تمنا اسی قدر ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

اس شعر کے سمجھنے میں تم نے جس بدتمیزی سے "جنسی جذبات" کا تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تمہاری انتہائی بدذوقی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ "فی نفسہٖ شباب" کی بھی توہین ہے۔

ایک شعر سے لطف اٹھانے کے لئے شاعر کی "نفسیات" سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو خود اپنے علوئے نفس سے کام لینا چاہئے اور اسے بھی جانے دو، میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمنا کا ایک خاص مفہوم قرار دینا اور پھر لفظ "ازدحام" کی چھان بین میں اتنی بدتمیزی کا اظہار، اس کا تمہیں کیا حق حاصل تھا جبکہ کشودِ نقاب" کی تعیّن خود اس کے منافی پڑتی ہے۔

ایک صاحب تم سے بھی زیادہ خوش تمیز یہاں موجود ہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے :۔

میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

انہوں نے رسوائی اور خلوت کو ملا کر ایک عجیب مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگر خلوت میں آپ نے مجھے بلا لیا تو رسوائی کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ میں بالکل ضعیف و ناکارہ ہوں

اور کسی کو کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

بولئے قائل ہوئے کہ نہیں۔ اب آؤ گے تو میں تمہیں انہیں کا شاگرد کرا دوں گا ایسے سخن فہم زمانہ میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔

نیاز ادبی انشا کی تنقید و تحلیل کے وقت بھی بڑے ہی خود آگاہ رہتے ہیں۔ نیاز کی خود آگہی اُن کے مزاح کو بڑا دلکش بناتی ہے۔ اور اعلیٰ مزاح کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اسی خط کو دیکھئے جب تک شعر و ادب کی بات ہوتی رہی مزاح کی کیفیت پیدا ہوئی لیکن جہاں بات اپنی ذات کے تعلق سے کہی گئی، مزاح کا رنگ ابھر آیا:۔

اس میں کلام نہیں کہ بغیر فارسی لٹریچر کا مطالعہ کئے ہوئے اردو لکھنا پڑھنا نہیں آسکتا۔ میں دبی زبان سے اس میں عربی کا بھی اضافہ کروں گا۔ کیونکہ ادب کے محاسن کو سمجھنا بہت کچھ موقوف ہے۔ عربی جاننے پر آپ کے اس ذوق سے میں بے خبر تھا لیکن وہ شغف کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ اس سے یقیناً بے خبر ہونا آپ کا وجدان صحیح خود بہتر رہنما ہے۔ مجھ سے یا کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ آپ نے دریافت کیا ہے اس لئے عرض کروں گا کہ آپ فی الحال مرزا غالبؔ کے کسی اور طرف توجہ نہ فرمائیے۔

جس ندرت اور شوخی پر آپ جان دیتے ہیں وہ سوا غالب کے کہیں نہ ملے گی اور پھر اسی کے ساتھ "فارسیت" کا وہ عالم کہ ہر صفحہ "ایران زار" نظر آتا ہے، نزاکت جمال اس میں شک نہیں کہ بیدل کا حصّہ ہے لیکن اس میں یہ لطفِ زبان کہاں؟ جب تک آپ جوان ہیں "خراباتِ غالب" نہ چھوڑیئے، انحطاطِ عمر میں البتہ "مصحفِ بیدل" سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ میری نہ کہئے، یہاں ہر بات الٹی ہے۔ جب جوان تھا تو بیدل پر جان دیتا تھا۔ اب زمانۂ انحطاط میں غالب پر سر دھنتا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے گا کہ مجھ پر بڑھاپے میں دوبارہ جوانی آئی ہے۔ بلکہ یہ کہ میں جوانی میں بھی بوڑھا تھا۔"

اسی طرح مظہر جان جاناں کی شاعری کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے وہ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"میں تو مظہر کے ذوقِ شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست

ٹھے یا گیا کیونکہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے آگاہ نہیں، کہ حسنِ مجرّد کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہے گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ محبّت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں۔ میں محبّت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ اس کی لذت باقی رہے۔ عورت کے ساتھ جانماز کا سا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں"!

نیاز بڑے ہی وسیع مشرب آدمی ہیں۔ خدا اور مذہب کے تعلق سے ان کے خیالات ہمیشہ دعوتِ فکر دیتے رہتے ہیں۔ وہ نہ تو خدا کو مسجد میں مقید رکھنا چاہتے ہیں نہ مذہب کو داڑھی کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا صرف قہار و جبار نہیں نہ ہی مذہب نام ہے زندگی کو بے رنگ و بے کیف بنا دینے کا اس لئے وہ خدا سے بھی "شرارتیں" کرتے ہیں مذہب میں بھی زندہ دلی سے کام لیتے ہیں۔ جیسا خود انھوں نے لکھا ہے :-

ترانۂ کہ نہ گنجد بہ سازِ حی خواہم

یہی وہ چیز ہے جو سیاسیات میں "اشتراکیت" کہلاتی ہے اور مذہبیات میں "ترکِ رسم" والی "وحدانیت"۔ اگر اللہ کا وجود ہے تو لاکھ انکار کیجئے، وہ موجود ہی رہے گا۔ انسان کچھ کرے لیکن خدا کی خدائی اس کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ پھر خالق و مخلوق کا یہ تعلق کہ وہ انکار سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ اقرار پہ مجبور نہیں، مٹا دیجئے تو دنیا رہنے کے قابل نہ رہے۔ اللہ اللہ آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے لیکن اسی کے ساتھ تصدیق بالجنان از بس ضروری ہے کہ رندی نام بدتمیزی کا نہیں بلکہ انتہائی تمیز کا ہے۔

مذہب کی دنیا میں بداخلاقی کی گنجائش ہو تو ہو لیکن یہاں سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے :-

تو بہ دینِ درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

کہتے ہیں کہ تصوّف بھی رندی ہی کی ایک شاخ ہے لیکن میں اسے صرف شاعری کہتا ہوں اور شاعری بھی مولانا ناسخ رحمتہ اللہ علیہ کی کیونکہ صوفی کہتا ہے کرتا نہیں اور خرابات میں عمل کے سوا سب حرفِ باطل ہے۔

غالب کا یہ شعر آپ کو یاد ہوگا، لیکن پھر سناتا ہوں، کہتا ہے:۔

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر   خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یہ وہ شرارتیں ہیں جن پر خدا کو بھی پیار آجاتا ہے، لیکن "اہلِ تقشف" اتنی تفریح بھی جائز نہیں سمجھتے ان کے نزدیک گویا کائنات نام ہے قدرت کی "شکن پیشانی" کا۔"

نیاز کو اپنی زندگی میں مولویوں کے طبقہ سے جتنی تکلیف پہنچی ہے شاید کسی اور چیز سے نہ پہنچی ہوگی۔ لیکن نیاز کی کشادہ دلی اور وسیع النظری کو دیکھئے۔ کہ اس طبقہ کے ذکر کے ساتھ ان کے لہجہ میں نہ تو تلخی آتی ہے نہ ناگواری بلکہ وہ اس طبقہ کے متعلق جب بھی کچھ کہتے ہیں تو ان کی شوخی اور مزاح کا رنگ اور زیادہ نکھر جاتا ہے اس میں "زہر خند" کی کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ تصویر کشی کے بارے میں نیاز اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

میں جانتا ہوں یہ لوگ کیا کہیں گے۔ ایک کی رائے ہوگی تصویر کھچوانا بہر صورت ممنوع ہے (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کی صورت واقعی اس قابل نہیں کہ تصویر لی جائے) دوسرا کہے گا کہ نیم رخی (PROFILE) تصویر میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس طرح نقش میں تجسیم کا رنگ پیدا نہیں ہوتا (لیکن یہ قول اس کا ہوگا جو اس آرٹ سے بالکل ناواقف ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ "تجسیم" کی کیفیت نیم رخی تصویر ہی سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے) تیسرا کہے گا کہ نصف دھڑ... (BUST) کی تصویر جائز ہے، کیونکہ اس طرح پورا جسم سامنے نہیں آتا (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کے نزدیک خطرہ صرف نیچے کے دھڑ میں ہے اور دل و دماغ بیکار چیزیں ہیں) ....

جس حد تک اہل علم کا تعلق ہے وہ بت پرستی کا دور ختم ہو چکا ہے (ہندو مسلمان دونوں کے لئے) رہے جاہل، سو ان کے لئے مجسمہ، تصویر، پیپل، مزار سب یکساں ہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں ایک جماعت صوفیہ کی ایسی بھی ہے جو اپنے پیر طریقت کی تصویر سامنے رکھ کر سجدہ کرتی ہے اور انہیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ تصویر کیسی ہے پھر ان کے لئے تصویر تو مطلقاً حرام ہونی چاہیئے، لیکن سوا اپنے پیر کے سب کی۔

ان کے برخلاف اہل فن کی جماعت کو لو، جو تصویر کیا اچھے خاصے بت بناتی ہے۔ لیکن اس کا مقصود صرف فن کی تکمیل ہوتا ہے تو کیا ان کے لئے مجسمہ سازی حرام قرار دی جائے گی؟

یہ انتہائی کج فہمی ہے کہ کسی قانون یا شریعت کے کسی علم کو دائمی چیز سمجھا جائے۔ قانون، وقت، ضرورت اور مصلحت کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کے بدل جانے پر قانون میں بھی تغیر و تبدل ضروری ہو جاتا ہے۔

جس وقت اسلام نے مجسمہ سازی کی مخالفت کی یہ وہ زمانہ تھا جب عرب میں بت پرستی کا رواج فنی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بکثرت پایا جاتا تھا اور اس رواج نے ان کے قواء ذہنی کو مضمحل کر رکھا تھا خیال تھا کہ بت سازی سے باز نہ رکھا گیا تو اس مذموم عادت کا استیصال نہ ہو سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت بھی کوئی مسلمان ایسا ہے جو محض، مجسمہ سازی یا تصویر کشی کی وجہ سے، بت پرستی اختیار کر سکتا ہے؟

پھر جب اس کا امکان نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ حکم اسوقت بھی قابل عمل قرار پائے اور اس کو کالعدم نہ سمجھا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خدشہ تمہارے دل میں پیدا ہی کیوں ہوا؟ کوئی اچھی شکل و صورت والا انسان اگر تصویر کھنچوائے تو اسے خیال کرنا چاہیئے کہ کہیں لوگ اسے پوجنے نہ لگیں، تمہیں کیا ڈر ہے۔؟

نیاز اپنے مزاج کے ذریعہ بڑے بڑے اخلاقی سبق دے جاتے ہیں۔ وہ کبھی نصیحت اور تلقین نہیں کرتے لیکن مسکراتے مسکراتے وہ کچھ اس انداز میں بات کہتے ہیں کہ دل نشین ہو جاتی ہے۔

"ہر چند شادی کوئی اچھی چیز نہیں مگر آپ ضرور کیجئے، کیونکہ اگر یہ حرکت آپ نے نہ کی تو ضرور کوئی اور اس سے زیادہ خراب حرکت کر بیٹھیں گے مگر خیال رہے کہ آپ شادی کر رہے ہیں "عیاشی نہیں" بیوی کا تعلق "جذبۂ شہوانی" سے اتنا نہیں ہے جتنا "مصلحت عمرانی" سے ہے اس کا صاحبِ حسن و جمال ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا خوش خصال ہونا۔ . . . لیکن مجھے معلوم ہے آپ میری اس نصیحت کی مطلق پروا نہ کریں گے اور "ضرورت شادی" کا جو اشتہار دیں گے تو اس میں سب سے پہلی شرط "جمیل و طرحدار" ہونے کی درج ہوگی۔ حالانکہ آپ خود اس لحاظ سے ماشاءاللہ صفر ہی صفر ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایک معمولی صورت کا مرد کیوں یہ خواہش کرتا ہے کہ عورت اسے نہایت طرحدار ملے . . . . اور پھر یہ کہ وہ اس سے محبت بھی کرے۔ آؤ میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں مگر کسی مولوی سے نہ کہہ دینا، یہ جو مذہب اسلام میں کفو کے درمیان شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا مفہوم سب غلط سمجھتے ہیں۔ کفو سے لوگ خاندان یا برادری مراد لیتے ہیں درآنحالیکہ کفو کے معنی مماثل کے ہیں۔ مماثل کیا؟ یعنی جو لوگ تہذیب شرافت، تعلیم و تربیت، سیرت و صورت بھی باہم کر مماثل ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم ہونا چاہیئے، پھر اس کے لئے خاندان یا برادری کی قید بے کار ہے، فرض کیجئے۔ خاندان کی ایک لڑکی ہے۔ لیکن اپنے صفات کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کی ہے تو یقیناً کفو میں داخل نہ ہوگی، لیکن اگر کسی دوسرے خاندان کی ہے اور صورتاً و سیرتاً مماثل واقع ہوئی ہے تو کفو کہلائے گی۔ جنّت میں حوریں بدصورت مردوں کو گوارا کر لیں تو کر لیں۔ لیکن اس دنیا میں یہ ظلم زیادہ نبھنے والا نہیں، اس لئے آپ کو بھی حسن و جمال کی جستجو کا حق حاصل نہیں۔ یقیناً آپ بدصورت نہیں لیکن اتنے طرحدار

بھی نہیں کہ جیو پیڑ کی بیٹی سے کم درجے کی عورت آپ کو پسند آئے۔"

اپنے اسی مخصوص انداز میں ازدواج کے مسئلہ پر ایک دوسری جگہ یوں روشنی ڈالتے ہیں :-

"آپ نے جو شرائط شادی پیش کئے ہیں وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ یعنی آپ کو ایک ایسی عورت چاہیئے جو حسن میں کوہ قاف کی پری ہو اور دولت میں راکفلر یا فورڈ کی بیٹی . . . . خیال اچھا ہے کیونکہ تم بھی اپنی بدصورتی یا مفلسی میں جواب نہیں رکھتے۔ ہوش میں آؤ، کیوں دماغ خراب ہوا ہے، اوّل تو ایسی عورت ملنا محال ہے اور اگر مل بھی گئی تو وہ تجھے چھوڑ کر تمہارے پاس کیوں جانے لگی یاد رکھو بدصورت مرد کے لئے حسین بیوی سے زیادہ کوئی عذاب نہیں، اگر اس کو تم سے محبّت نہ ہوئی (اور محبّت ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو اس عذاب میں مبتلا رہوگے کہ خدا جانے کب چھوڑ بیٹھے اور اگر محبّت ہوگئی تو ہمیشہ غلام بنے رہوگے۔

اگر آزادی ایسی ہی ناگوار ہے تو کوئی عورت معمولی شکل و صورت کی ڈھونڈو جو تمہاری قدر کرے اور تمہارے آئینہ میں اپنا منہ دیکھ سکے۔ جھونپڑے میں رہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا سراسر حماقت ہے۔"

نیاز مزاح کی ساری نزاکتوں کو جانتے ہیں۔ انھوں نے ایک خط میں مزاح کیلئے "فطری آمد" کو سب سے مقدّم قرار دیا ہے "ہنسنے ہنسانے کے خاص اہتمام" پر انھیں غصّہ آجاتا ہے۔ نیاز کے کامیاب ترین مزاح نگار ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے مزاح کو کبھی "پیشہ" کے طور پر اختیار نہیں کیا۔ اس لئے اس میں "فطری آمد" ہمیشہ رہی۔ جب کسی پر "مزاح نگار" ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اس منصب کو سنبھالنے کے لئے اکثر اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کوشش میں آمد کا کیا سوال باقی رہ سکتا ہے۔ مزاح نیاز کی طبیعت کے "دریائے بے تابی" کی ہمیشہ "ایک موج خوں" بنا رہا۔ اس لئے آپ کی سرخروئی ہمیشہ قائم رہتی ہے اور فطری آمد جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی خط کو دیکھئے :-

میں نے سنا ہے (یہ نہ بتاؤں گا کس سے) کہ آپ ماہ آئندہ سفر حج کا عزم رکھتے ہیں اور برسبیل تذکرہ آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ کیا نیاز کا چلنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے بعض نے صاف صاف کہدیا ہو کہ "آپ بھی کس کافر و مشرک کا ذکر کرتے ہیں"

سو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نفس حج کا خیال اور وہ بھی کسی کی معیت میں، کسی کے طفیل میں کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر سوال سیر و سیاحت کا سو ایک عازم حج کے ساتھ اس کا بھی کوئی لطف نہیں، آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا نظارہ زجنبیدن "مژگاں گلہ دارد" کا آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح و حمائل ہوگی اور یہاں جام و مینا، پھر آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکل گیا اور ٹھیک اسی وقت آپ تسبیح پڑھنے لگے تو میں کیا کروں گا سوا اس کے کہ سمندر میں کود پڑوں۔ غرض یہ کہ آپ کے ساتھ چلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں، ہاں اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ بمبئی میں جہاز کے عرشہ پر مجھے گم کر کے پھر اس وقت تک میری جستجو نہ کریں گے جب تک آپ پھر بمبئی واپس نہ آجائیں، تو بے شک میں طیار ہوں . . . . مگر پوچھئے کہ یہ معیت ہی کب ہوئی؟"

مزاح زندہ رہنے والی قوت کو ابھارتا ہے۔ مزاح حقیقی معنوں میں وہی ہے جو زندگی بسر کرنے کا حوصلہ اور ولولہ پیدا کرے۔ زندگی اپنی ساری خوبصورتیوں کے ساتھ ابھر ابھر کر سامنے آئے کہ اس پر جان دیتے ہی بنے۔ مزاح میں ایسی کیفیت مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر نیاز کا مزاح اسی خصوصیت سے مالا مال ہے۔

ملاحظہ کیجئے:۔

سنئے صاحب، جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں، مرنا برحق سہی لیکن جب تک آپ جی رہے ہیں اس "واویلا" سے فائدہ بھی کیا ہے۔ آخرت کے خیال کو آپ بعد الموت سے کیوں متعلق کرتے ہیں۔ آخرت سے مراد انجام ہے اس کا جو ہم آپ اس دنیا میں کرتے ہیں ورنہ "مرد آخر بیں مبارک الست کے معنی کیا۔

خدا کے لئے اس خیال کو ترک کیجئے آپ کی صحت پر خراب اثر پڑے گا۔ اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کر کے بے کار بنا دیں گے۔ لاَحولِ وَلاَ قوۃ..... آپ سے کس نے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہر وقت موت کو یاد کرنا ہے۔ مسلمانوں نے تو موت کا مقابلہ کیا ہے۔ اس سے جنگ کی ہے اور ایسی جنگ کہ ان میں بہت سے مرنے کے بعد زندہ ہیں اور آپ ہیں کہ زندگی ہی میں مرے جا رہے ہیں۔!

اگر برا نہ مانئے تو عرض کروں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گناہ بھی کر لیا کیجئے۔ کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے اور جب کچھ جان بدن میں آ جائے تو بڑے بڑے! اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو مطلع کریں۔ تاکہ ہم آپ دونوں ایک ساتھ اس کا تجربہ کریں۔..... ذرا دیکھیں تو سہی ہوتا کیا ہے؟"

مزاح کے متعلق خود نیاز نے لکھا ہے کہ "یہ رنگ وہی شخص کامیابی کے ساتھ نباہ سکتا ہے جس کا مطالعہ بہت وسیع اور ذوق ہمہ گیر ہو" اس لئے نیاز کے ایک بلند پایہ مزاح نگار ہونے میں کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔ بعض وقت نیاز صرف ایک ہی لفظ سے قاری کے تخیل میں ایک خاص مزاحی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسے اس خط میں :۔

"نماز شروع کر دی۔ اچھا کیا، خدا مبارک کرے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس مرتبہ کونسا نیا شکار پیش نظر ہے۔ اُس مرتبہ تم نے نماز کی پابندی کی تو غریب منیر کو تباہ کر دیا اور وضو کراتے کراتے اس کے چہرے کو اچھا خاصہ کمبخت بنا دیا۔ اس مرتبہ نظر عنایت کس پر ہے؟"

نیاز کا طنز بھی مزاح کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتا ہے۔ طنز کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ بغیر مزاح کے گالی بن جاتا ہے۔ طنز بغیر مزاح کے گالی بنے یا نہ بنے۔ لیکن مزاح کے ذریعہ طنز میں جو نشتریت آ جاتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز کے ایک دوست جو خیر سے شاعر ہیں اور نظم گوئی کو تو،

"جنون دیوانگی" سمجھتے ہیں لیکن غزل گوئی کو بڑی "فرزانگی" ان معتقدات کے ساتھ ان کی غزل گوئی جیسی بھی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگالینا دشوار نہیں۔ یہاں نیاز کا مزاحیہ طنز دیکھیئے :۔

"میں نے سنا تھا کہ بھائی مراد باوجود ان کی تباہ حالیوں کے حج کو جانے والے ہیں خدانخواستہ یہ خبر صحیح تو نہیں ؟ ہائے یہ بھی دنیا کا کتنا بڑا سانحہ ہے کہ ایک بھائی کو شاعری نے تباہ کیا اور دوسرے کو مذہب نے میں سچ کہتا ہوں کہ یہ عذاب تمہاری شاعری کی وجہ سے نازل ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس غریب کے پاس اتنی دولت کہاں کہ وہ یہ جسارت کر سکے ۔"

وہ واقعات جو غصّہ اور جھنجلاہٹ پیدا کرتے ہیں۔ ان کو نیاز کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے اور اس واقعہ کی ستم ظریفی بھرپور انداز سے ہم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس خط میں بھی وہ شعر سنانے کا ذکر کرتے ہیں لیکن خالص مزاحیہ انداز میں :۔

"کل آپ کا خط لے کر وہ تشریف لائے اور اس تصنّع و تکلّف کے ساتھ کہ اب کیا کہوں ، آنکھوں میں سرمۂ دنبالہ ، ہونٹوں پہ لاکھے کی بہار ، گالوں پر غازہ ، ابروؤں پر وسمہ ، پنڈلیوں میں چپکا ہوا تنگ پاجامہ ، پاؤں میں وصلی کا زرکار جوتا ، تنزیب کی تنگ اچکن ، نیچے جامدانی کے کرتے کی پھبن ، بس یوں سمجھ لو :۔

بر تنش پیراہن گل تنگ بود

بیٹھتے ہی کلام کی فرمائش کی ، مدعا یہ تھا کہ میں فرمائش کروں ، بس پھر کیا تھا ، یوں سمجھ لو کہ ، بجے شام آدھی رات تک جسمانی و روحانی کوئی اذیت ایسی نہ تھی جو اٹھا رکھی ہو۔ اخلاقاً پہلے تو دو چار غزلوں کی داد میں نے دی لیکن اس کے بعد جب زبان نے یارانہ دیا تو خاموش ہو گیا ، لیکن وہاں تو یہ عالم تھا گویا سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اور دنیا کی کوئی قوّت اس کو روک نہیں سکتی۔ خدا خدا کر کے جب بارہ بجے یہ درس ختم ہوا تو فرماتے کیا ہیں کہ اب اجازت ہو تو صبح پھر حاضر ہوں۔ میں نے کہا یہ بھی آپ کا

گھر ہے۔ جب مزاج میں آئے تشریف لائیے۔ لیکن صبح میں ایک نہایت ضروری کام سے آگرے جا رہا ہوں فرمانے لگے خیر کوئی حرج نہیں میں صبح حاضری دونگا کیونکہ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ سفر ملتوی ہو جائے ..... کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ......
میں ان کے جانے کے بعد ہی فوراً اسٹیشن چلا آیا دہیں سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔"

نیاز مذہبی معاملات کے بیان میں جس شوخی سے کام لیتے ہیں وہ ان کی اپنی خاص چیز ہے۔ اکثر جگہ نیاز کی شاعرانہ طبیعت ادبی وسیع نگاہی اور احساس مذہبی کی کسی ایک نقطہ پر اجتماع بڑے ہی لطیف مزاح کا باعث ہوتا ہے :۔

"آپ بھی سن لیجئے اور ان سے بھی کہہ دیجئے کہ اعترافِ محبّت کوئی گناہ نہیں کہ تعزیر میں آزمائش و امتحان کے مبادیات طے کرنا ضروری ہوں۔

غالب کہتا ہے :۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست زصہبا کشودۂ

"مگر یہاں تو انشاء اللہ نامہ اعمال بالکل کورا ہی ملے گا۔ وہاں کم از کم ایک روزہ تو تھا خواہ وہ شراب ہی سے کیوں نہ کھولا گیا ہو۔ مگر یہاں تو ساری عمر اسی حسرت میں بسر ہوئی کہ شراب ہوتی تو روزہ رکھا جاتا۔"

بات یہ ہے کہ نیاز مرتاضیت سے بیزار ہیں۔ ایسی مذہبیت جو انسان کو انسانیت کے جامے سے باہر کھینچ لیتی ہے ہمیشہ نیاز کے مزاح اور طنز کا نشانہ بنتی ہے۔ خشک مذہبیت کو نشانہ بناتے ہوئے نیاز کی شوخی بڑا البیلا پن اختیار کر لیتی ہے اور ان کے مزاج کی لطافت اور رکھ رکھاؤ کا بانکپن ایسے ہی موقعوں پر کھلتا ہے :۔

"رہبری کا شکریہ لیکن کیا کروں میری گمراہی تو سکندر کی سی گمراہی ہے کہ خضر بھی آب حیواں تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ میں آپ کی ہدایت پر ایک سے زاید بار ان کی صحبت "مراقبہ و سلوک" میں شریک ہو چکا ہوں ..... گھنٹوں سر جھکائے رہنے کے بعد گردن میں درد تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن دل پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ

"حضرت" کی صورت ہی مجھے اچھی معلوم ہونے لگتی . . . . فرمایا "کیا چاہتے ہو"!
میں نے جواب دیا . . . . "روحانیت"۔ بولے "روحانیت سے کیا مراد ہے"؟ میں نے کہا
"بادہ خوری کی توفیق اور گناہ کرنے کی صلاحیت"؟ قریب تھا کہ گردن میں ہاتھ دے کر
مجھے نکال دیتے لیکن میں نے کہا "جناب غصے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب روحانیت
کا مفہوم خود آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں تو سوائے اس کے کیا عرض کروں۔
میں تو آپ کے پاس خود ہی سوال لے کر آیا ہوں اور آپ الٹا مجھ ہی سے دریافت
کرتے ہیں"۔ یہ سن کر خیر غصہ تو کیا کم ہوتا لیکن ایک حد تک ضبط پر قادر ہو گئے۔ اور
فرمایا "پھر بھی تمہارے نزدیک کوئی نہ کوئی مفہوم روحانیت کا ہوگا، وہی معلوم
کرنا چاہتا ہوں . . . میں نے کہا . . . میرے نزدیک روحانیت نام ہے صرف پاکیزہ
اخلاق کا"۔ دریافت فرمایا۔ کوئی مثال دو۔ میں نے جواب دیا۔ مثلاً "گاندھی جی"
اب کیا پوچھتے ہیں کہ یہ سن کر ان کا کیا حال ہوا"؟

مذہبیت ہندوستان میں بعض وقت صرف توہم پرستی کا مہذب نام بن جاتی
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کی خدمت کا جذبہ بھی بعض وقت یکسر توہماتی بن کر
رہ جاتا ہے۔ یہاں ملک کو مسجدوں سے "آباد" کرنا ہی سب سے بڑی مذہبی خدمت
سمجھ لی جاتی ہے لیکن اس "آبادی" کی "ویرانی" دور کرنے کی کوشش کا بھی خیال
ذہن میں نہیں آتا۔ نیاز کے طنز کا نشتر ایسے فاسد مواد پر ہمیشہ چلتا ہے مسلمانوں
کی تعمیر سے زیادہ مسجدوں کی تعمیر کو عزیز رکھنا اور توہماتی روحانیت کے
زعم میں اپنی بے قوفی کا اظہار کرنا نیاز کی مزاحی حس کو ہمیشہ بیدار کر دیتا ہے
وہ بڑے لطیف انداز میں ایسے واقعات پر طنز کرتے ہیں۔

ان کے جدِ بزرگوار تو خیر صرف ہمارے فتح پور ہی کے صاحب خدمت
تھے لیکن ان کے والد محترم کے سپرد تو پوری کمشنری الہ آباد کا نظم و نسق تھا۔ یہ خود کیا
ہیں مجھے تو ان کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یورپ کے جس قطب نے
جنگ عظیم کرادی تھی اس کو شکست دے کر انھوں ہی نے آپس میں صلح کرائی ہے۔

یہ اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ آپ ہی اس حقیقت کو سمجھ سکیں تو سمجھ سکیں۔ میرے بس کی بات تو ہے نہیں۔ یہ فی الحال اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوا رہے ہیں اور امداد کے طالب ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے گاؤں میں کوئی مسجد نہیں تو فرمایا کہ "مسجدیں تو کئی ہیں لیکن بے مینار کی مسجد کوئی نہیں"۔ میں ڈر کے مارے یہ نہ کہہ سکا کہ "کیوں نہ آپ "موجودہ مسجدوں کے مینار توڑوا دیں اس میں زیادہ آسانی ہے"۔

نیاز کا مذہبی موضوعات اور اعتقادات پر گفتگو کرتے وقت استدلالی انداز ان کے مزاح کو بڑا نکھارتا ہے۔ نیاز کی بے باکی اور جرأت ان کی شخصیت کے تیکھے پن کو دلچسپ بناتی ہے۔ وہ مزاح کا نقاب اس لئے نہیں اوڑھتے کہ جو جی چاہے کہہ سکیں بلکہ نقاب ہٹانے کے بعد بھی وہی کہتے ہیں جو ان کے دل کی بات ہے۔ اس لئے مزاح نقاب کے اندر سے جھلکتی ہوئی حقیقت دلچسپ ہی نہیں فکر انگیز بھی بن جاتی ہے۔

"مانا کہ تم مذہبی انسان ہو، خدا کے بڑے صبر و شکر والے بندے ہو، کلام الٰہی میں بڑی قدرت ہے لیکن خدا کے لئے بتاؤ تو کہ جو بات بات میں تم خدا کو تکلیف دیا کرتے ہو اس سے کیا فائدہ . . . . کیا اللہ میاں کو سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ وہ صرف تمہاری ریاضت، اور تمہارے ایمان و اسلام کو بیٹھے ہوئے سراہا کریں اور تم کو مرنے سے پہلے ہی دنیا میں جنت کی تمام راحتیں مہیا کر دیں

ہوش میں آؤ، زہد و تقویٰ بھی وقت وقت سے اچھا ہوتا ہے یہ نہیں کہ میاں کو چھینک آئی اور تسبیح پر ہاتھ پہنچ گیا، سر میں درد ہوا اور مصلّٰی بچھ گیا اللہ میاں کو توبہ توبہ کیا تم نے اپنا خانہ زاد غلام سمجھ لیا ہے جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے گا۔ کیا دنیا میں ہم سے گناہگاروں کی کمی ہے جو تم ایسے زاہدان عبوس کی طرف توجہ کرتے، میں یہ نہیں کہتا کہ تم عبادت و ریاضت چھوڑ دو یا میری طرح بے دین ہو جاؤ لیکن یہ حرکت کیا کہ "زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہید"

نیاز کی زبان و بیان پر بے پناہ قدرت ان کے مزاح کا منبع اصلی ہے۔

وہ ایک عظیم آرٹسٹ کی طرح اپنے برش و قلم سے سایہ و نور کے ایسے امتزاج پیدا کرتے ہیں کہ وہ جس طرح کی چاہتے ہیں کیفیت اور تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔

اس خط کو دیکھئے:۔

"کل شام کا لطیفہ سنو، تمہارے خاں مکرم تشریف لائے اور اس شان سے کہ تسبیح ہاتھ میں تھی اور کفنی گلے میں حیران کہ خدایا میں نے کب دعویٰ نبوت کیا تھا جو جبریل کا نزول اجلال ہوا، میں نے اپنے گم کردہ راہ ہونے پر کب اظہار مسرت کیا تھا کہ جناب خضر تشریف لے آئے! . . . باور کرو میں نے ان کو پہچانا ہی نہیں سر و قد تعظیم دی، دست بوسی کے لئے آگے بڑھا جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا کہ کہیں یہ "سامری" افسوں پڑھ کر خاکستر نہ کر دے۔ دفعتاً وہ مسکرا پڑے اور میں نے ان کے طلائی دانت دیکھ کر فوراً پہچان لیا۔"

حیران تھا کہ خدایا کیا انقلاب ہے، وہ شخص جو وضع مغربی کا اتنا دلدادہ ہو اس حد تک بھیانک بن جائے، وہ شخص جس نے بھول کر بھی خدا کا نام نہ لیا ہو وہ بالکل زمزمی بنا ہوا سامنے آئے۔

میں نے پوچھا "حضرت یہ کس نگاہ کا کرشمہ ہے؟ کس جلوۂ بے محابا کی کار فرمائیاں ہیں؟" اسے یہ سننا تھا کہ ان پر تو حال طاری ہو گیا۔ لاحول ولا قوۃ میں کس قدر پچھتایا کہ میں نے کیوں ان سے یہ پوچھا۔ وہ نیم بسمل . . . کی طرح لوٹ رہے تھے اور میں پریشان کہ کہیں ان کا دم نہ نکل جائے۔ آخر کار زبردستی ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی کے چھینٹے دیئے، لخلخہ سونگھایا تو انھیں ہوش آیا۔"

نیاز کے معتقدات اپنی انفرادیت رکھتے ہیں وہ اپنی ہی . . . راہ چلتے ہیں یہ راہ پر پیچ ہی نہیں دشوار و خطرناک بھی ہے۔ ان راستوں کو سمجھنا اور سمجھانا بھی بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن نیاز کا ہلکا پھلکا مزاح ان راہوں کو سہل ہی نہیں بنا دیتا بلکہ ان پر روشنی بھی بکھیرتا ہے۔ ٹھنڈی روشنی اتنی دلکش اور پرکشش ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ کیسے سے کیسا زاہد خشک ہو اس راستہ پر نیاز کے ساتھ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، ہو لیتا

ہے۔ اور پھر جیب لوٹ آتا ہے تو اس کی فکر تو کچھ نہ کچھ تردامن ہو ہی جاتی ہے۔ نیاز کی شوخی تحریر بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے :۔

قبلۂ عالم! آپ لاکھ سمجھایئے، یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہ آئے گی کہ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے وہ سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ ظہور اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہوئے ہوں گے، اور ان کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے۔ پھر کیا کوئی موٹی عقل ا سے باور کر سکتی ہے کہ خدا ایک کو تو جنّت دے اور ہزار کو دوزخ میں ڈال دے ..... اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی، اور اتنی مخلوق کو جس میں خدا جانے کتنی حسین عورتیں ہوں گی آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کون سی مسرت وابستہ ہے''

اسی رنگ میں ایک اور تحریر دیکھئے :۔

"ہوش کی باتیں کرو، خدا اگر چنگیز و ہلاکو نہیں تو حاتم طائی اور جعفر برمکی بھی نہیں! نہ اس کو تمہاری عبادت کی پرواہ، نہ میری سرکشی کی، یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ تمہارے سجدہ کرنے سے خوش ہوتا ہے اور میری شراب خوری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیتا ہے، عجیب عقلمند ہو۔

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود۔ ز زہد ہمچو توئی یا ز فسق ہم چو منی

نہ تم نمازیں پڑھ پڑھ کر کوئی بت کدہ مسمار کر سکتے ہو اور نہ میں اپنی بت پرستیوں سے کعبہ ڈھا سکتا ہوں، اس دربار میں نہ جنید و شبلی کے لئے خاص رعایت ہے نہ بہرام و جمشید سے کوئی عداوت۔ چند دن کی زندگی کو اس کوفت میں بسر کر دینا کہ معلوم نہیں حشر میں کیا معاملہ ہو، سخت نادانی ہے۔ کسی کا دل نہ دکھاؤ اور جو جی میں آئے کرو۔

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن

آپ نے دنیا ترک کر دی برا کیا، دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہو

اور زیادہ برا کرتے ہو۔ . . . . . تم نا اہل و بزدل ہو تو ساری دنیا کو کیوں ایسا سمجھتے ہو۔ تم چاہتے تھے کہ رندی اور بادہ آشامی کی حقیقت اسقدر آسانی سے تم پر کھل جائیں۔ . . . معقول

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخم جگر کہاں

میں اس نئے رنگ میں دیکھنے کا تمہیں آرزومند ہوں، اپنے مولا سے پوچھ کر ایک دن یہاں بھی نعرۂ "یاہو" لگا جاؤ۔ . . . ممکن ہے میں بھی ڈر کر، سہم کر تمہارے قدموں پر گر پڑوں، یوں زبانی وعظ و پند سے تو کام چلے گا نہیں۔"

نیاز کی رندی کا ذکر خود ان کی زبانی تمام تر گل افشانی بن جاتا ہے۔ نیاز ایسے رند ہیں جو "بےخودی" میں بھی "انداز گفتار" کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی احساس رکھتے ہیں کہ اس صدی کے "رند" ہیں۔ وہ خود اس کا ذکر بڑے ہی پر لطف اعتماد کے ساتھ کرتے ہیں:۔

"حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کس خیال میں ہیں یہ سوئے ظن اور میرے متعلق آہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آپ کو معلوم نہیں جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر سو سال کے بعد ایک رند پیدا ہوا کرتا ہے، سو اس کا حال تو آپ کو معلوم ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ آپ ہی ہوں لیکن اس صدی کے رند کی بابت مجھ سے پوچھیئے کہ کون ہے؟ ہر چند خود ستائی ہوگی لیکن آپ اصرار کریں گے تو صاف صاف کہنا ہی پڑے گا۔

پھر آپ ہی غور فرمائیے کہ آپ کا یہ تمام "دفتر تدبیر و مصلحت" کیا کام دے سکتا ہے اور آپ کی مجددانہ ترشیاں اس نشہ کو کیا اتار سکتی ہیں جہاں اگر کبھی ترکِ معصیت کا خیال بھی ذہن میں آ گیا تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر — خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

نمازیں پڑھتے رہیئے اور فرشتے بنے رہیئے، ہم لوگوں کو چھیڑنے سے فائدہ کہ اگر آزادی سے ایک سانس بھی آپ کے سامنے لی تو بادۂ شبانہ کی بو سے آپ کو بھاگنے

کی راہ نہ ملے گی، ہم لوگ رند ہیں رند! سنا آپ نے۔"

نیاز بڑے ہوش و گوش رکھنے والے رند ہیں۔ ان کی تحریر کی لطافتیں زندگی کی زنگا رنگی سے رنگین بنتی ہیں۔ وہ دل و دماغ دونوں کے دریچے کھلے رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر رُخ کو دیکھتے ہیں۔ اسے محسوس کرتے ہیں اور پھر اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اسے اپنے جذبات کی ترازو پر تولتے ہیں اور پھر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ چونکہ ان سارے مراحل میں وہ نفسیاتی ژرف نگاہی سے کام لیتے ہیں اس لئے دوسروں کی کمزوری پر وہ جھلاتے نہیں بلکہ اس پر مسکرا دیتے ہیں چونکہ اس مسکراہٹ میں ہمدردی اور خلوص ہوتا ہے اس لئے ان کی اس خوش دلی میں سب ہی شریک ہو جاتے ہیں۔ ذرا اس تحریر پر غور کیجئے:-

" معاف فرمایئے۔ میں آپ سے متفق نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا انتخاب میں آنا باعث حیرت ہو۔ لیکن خود ان کا انتخاب تو ایسا ہے کہ جلِّ وصلِّ میں اپنے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ۔ ۔ ۔ ۔ کہ یہ تمام برہمی صرف اس لئے ہو کہ عناصر میں وہ اعتدال باقی نہیں۔ یہ درس اخلاق دینے والے بھی کس قدر ظالم ہوتے ہیں۔ جب تک خود جوان رہتے ہیں کسی کی سنتے نہیں۔ اور بوڑھے ہونے پر چاہتے ہیں کہ دنیا سے جوانی ناپید ہو جائے۔ آپ کیوں خواہ مخواہ کو فت مول لیتے ہیں۔ وہ آپ کے بھتیجے ہیں اور میرے دوست۔ آپ کی طرح میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ان کا اخلاق خراب نہ ہو۔ لیکن اس کا بھی یقین ہے کہ اگر ہمیں آپ کو دوبارہ جوانی نصیب ہو جائے تو اسی عورت کے پیچھے آپ ہم دونوں ایک دوسرے کے نہایت سخت رقیب ہو جائیں اور نہ آپ اس بات کو دیکھیں کہ صورتاً آپ کو مجھ سے کیا نسبت ہے اور نہ میں یہ دیکھوں گا کہ دولت کے لحاظ سے میں آپ کے مقابلے میں کتنا حقیر ہوں۔"

نیاز کے ہاں نازک اور حد درجہ شگفتہ مزاح لطیف ترین مزاح کے ان گنت جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاح کی نزاکتوں کی پھلواری

کا جائزہ لینا اوران کے اس خزانے کی قدر و قیمت کو متعین کرنا وہ بھی ایک مختصر مضمون میں مشکل ہی نہیں بلکہ شاید ناممکن ہے۔ جلدی میں میرے ہاتھ جو کچھ لگا اسے میں نے یہاں پیش کر دیا لیکن یہ "مشتے از خروارے" سے بھی بہت کم ہے۔ غالب کے بعد نیاز نے ہی اردو مزاح کی لطافتوں کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا۔ نیاز نے جہاں اردو ادب کو اور بہت گراں قدر چیزیں دی ہیں وہیں شگفتگی اور زندہ دلی کا ایک منفرد انداز بھی دیا ہے۔ نیاز کی شوخی صرف انبساطی فضا پیدا نہیں کر دیتی بلکہ یہ ذہن و فکر کا تعزیہ بھی کرتی ہے۔ زندگی کی بے پناہ وسعتوں کا لطیف احساس نیاز کی تحریروں میں سمٹ آتا ہے اور یہی سمٹی سمٹائی احساسیت فکر و فن کے تار کو چھیڑتی ہے اور اسی تار کی لے پر نیاز کے مزاج کے نازک اور لطیف نغمات ابھرتے ہیں اوران نغمات سے اردو ادب کا ایوان ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ . . . . .
اس لئے نیاز کی تخلیقی ذہانت کا صرف یہی ایک پہلو انھیں اردو ادب میں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

محمّد خورشید عاصم

نیازؔ کا اسلوبِ نگارش

دنیا کی تقریباً اڑھائی ارب آبادی میں شاید ہی دو انسان ایسے ہوں جو آپس میں کلی مناسبت و مشابہت رکھتے ہوں، یہ طبائع عادات اور بہ حیثیت مجموعی شخصیتوں کا اختلاف رنگا رنگی عالم کا باعث ہے، ادب جو زندگی کا آئینہ دار اور جذبات کا عکاس ہے۔ طبائع کا تفاوت اس میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہر شاعر و ادیب اپنے ایک مخصوص رنگ کا مالک ہوتا ہے، ہر شاعر کا شعر اور ہر نثر نگار کی نثر، اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو دوسروں سے مختلف دکھائی دیتی ہے، میرؔ، سوداؔ غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ وغیرہ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد شان کے مالک ہیں۔ حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر ایک جداگانہ عظمت و وقار رکھتے ہیں ایک کا اسلوب دوسرے سے الگ ہے اور یہ چیز ہم عصر ہونے اور ایک ہی ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود ظہور پذیر ہوتی ہے۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ہم ادب سے ادیب کی شخصیت کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ اسی مطلب کو ابوالفضل نے انشاء کے دفتر سوئم میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے "خولیشتن را از نقش تا بہ نقاش باید رسانید"۔ ظاہر ہے کہ ادب کا بغور مطالعہ کرنے سے ادیبوں کی متحرک شخصیتوں ان کے احساسات جذبات مطمع نظر معیار ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں ادیب کے اسلوب بیان پر اثر انداز ہوتی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ادیب کی عبارت رنگین ہوتی ہے۔ کسی کی سادہ، کسی کی تحریر رواں ہوتی ہے، کسی کی سست، کسی کے اسلوب میں ایک

ولولہ وہنگامہ ہوتا ہے اور کسی کے ہاں نرمی و سکوت، کہیں تشبیہات و استعارات کا زور دکھائی دیتا ہے اور کہیں محاورات و ضرب الامثال کی بھرمار نظر آتی ہے۔ بعض جگہ کسی وصف کی افراط ہے اور بعض جگہ تفریط، اور بعض مقامات پر حیرت انگیز اعتدال پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بالارادہ نہیں ہوتا، یہ طبعی چیز ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو جو چاہتا محمد حسین آزاد کی سی نثر اور غالب کے سے شعر لکھنے پر قادر ہوتا وجہ یہ ہے کہ اسلوب یا انداز الفاظ میں نہیں بلکہ بیان کرنے والے کی شخصیت میں پنہاں ہوتا ہے۔ جیسے محمد حسین آزاد نے کہا ہے۔ انھیں اوصاف سے سودا، سودا اور میر تقی میر صاحب ہیں۔ ورنہ جس کا جی چاہے یہی تخلص رکھ لے۔ خالی سودا ہے تو جنون ہے اور خالی میر ہے تو گنجفہ کا ایک پتّہ ہے۔ ۵۱

اسٹائیل کا مادہ لفظ (Stilus) ہے نہ کہ (Stylus) سے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نوکدار آلہ کسی دھات، لکڑی یا ہاتھی دانت کا ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کیے جاتے تھے۔ امتداد زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھایا جاتا تھا، خود ان نقوش یعنی جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا، اور ایک عمل جو ابتداً میکانکی تھا، رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ ان نقوش کو اسٹائلس کے دوسرے کند حصے سے سدھارا جاتا۔

ادب میں کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے، وہ اپنا جائزہ لیتا ہے۔ اور غور کرتا ہے کہ جو کچھ اسے کہنا تھا کہہ سکا اور حقیقت کا جو نقش اس کے دل میں مرتسم تھا وہ تحریر میں بلاکم و کاست منتقل ہو گیا کہ نہیں۔ اسی دیدہ ریزی پر کسی پارۂ ادب کی خوبیوں اور نوک پلک سے درست ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ ۵۲

---

۵۱ آب حیات ص ۳ ۵۲ اقبال اور انداز بیاں۔ اثر لکھنوی روزنامہ امروز ۲۱ اپریل ۶۳ء

اسلوب بیان ہر مصنف ادیب یا شاعر کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے، لکھنے والے کی شخصیت جن احساسات جذبات وخیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان کی جھلک ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرے اور بیان کی تمام اداؤں میں موجود ہوتی ہے ادب میں زندگی اور حرارت، خون جگر کے بغیر ناممکن ہے۔ اور خون جگر صرف اسی صورت میں ادب میں منتقل ہو سکتا ہے، جب ادیب کا حقیقی احساس اور جذبۂ صادق الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو جائے۔ یعنی ہر نیا لفظ اور ہر نیا فقرہ یا مصرع شخصیت کی گہرائیوں سے ابھر کر نگاہوں کے سامنے آئے اس حقیقت کے پیش نظر ہم ادب کو ادیب سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ادب کے عناصر معلوم کریں تو لازماً ہمیں ان عناصر کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے جن سے ادیب کی انفرادیت کی تشکیل ہوئی تھی، احساس اور جذبۂ ادب کی اساس ہیں۔ ہم ادیب کے احساسات وجذبات مختلف ہوتے ہیں جو چیزیں ایک کے نزدیک محبوب ہوں ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا لگاؤ رکھے، یہ اختلافات قدرتی طور پر اسٹائل میں بھی اختلاف پیدا کر دیتے ہیں اور پھر ہر ادیب یا شاعر کی اپنی شخصیت مختلف

اس میں ابتدائی زندگی، تعلیم و تربیت، احباب اور متعلقین کی شخصیتیں، سیر و سفر اور مطالعہ کا بڑا دخل ہے۔ دوسرے الفاظ میں لکھنے والوں کی شخصیت میں جس قدر وسعت، جس قدر عمق اور جس قدر پیچیدگی ہوتی ہے اس کا اسلوب اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اتنی ہی زیادہ وسعت اور گہرائی کا حامل ہوگا اور اس کے رنگ ویسے اتنے ہی زیادہ متنوع اور مختلف ہوں گے۔

ان ہی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم نیاز کی نثر نگاری اور ان کے اسلوب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے نثر نگاروں کی وسعت سے اتنی ہی مختلف ہے، جتنی خود نیاز کی شخصیت دوسروں کی شخصیت سے متفاوت ہے نیاز کے خیالات ان کے انداز فکر، اور طبعی رجحان پر گزشتہ مضمون میں کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ دھندلے سے نقوش ایک دھندلی سی تصویر ہمارے روبرو

لار کہتے ہیں، جس کی مدد سے ہم پوری طرح نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ نیاز کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر ان کے اسلوب کو سمجھنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔

سب سے بڑی چیز جو ہمیں محسوس ہوتی ہے وہ نیاز کی تشکیکیت وہ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور حقیقت کی جستجو میں سرگردان و پریشان ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک اضطراب مسلسل ہے اور خلجان لامتناہی۔ یہی پیچ و تاب اور یہی سوز و ساز ان کی طبیعت کا بڑا اہم جز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ احساسات میں ایک تحرک ہے اور جذبات میں تموّج، نظر دور دور تک پہنچتی ہے مگر کہیں نہیں ٹھہرتی، دماغ سوچتا ہے لیکن یہ عمل بھی بہت سریع ہے۔ یہ تیز روی اور اضطراب ہی انہیں سکون و راحت سے صحیح طور پر لذت اندوز ہونے کے قابل بناتا ہے۔ جنہوں نے خزاں کے ستم نہیں اٹھائے وہ بہار کی قدر و قیمت کیا جانیں، جنہوں نے موجوں کے تھپیڑے نہیں کھائے وہ ساحل کی عافیت بخشی سے کما حقہ کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ نیاز کی یہ بے سکون طبیعت مرقع راحت کو خوب پہچانتی ہے یہی باعث ہے کہ حسن جوانی، خوشبو، بہار، برسات، سبزہ ساحل، سمندر، محافل، رقص و سرود وغیرہ کا ذکر وہ ذوق سے کرکرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صحرا گزیدہ کسی شیریں اور شفاف چشمے پر پہنچ گیا۔ اس بے سکونی اور تلاشِ سکون کا تصادم و اختلاف ان کے طرزِ اسلوب کا خلاق ہے۔

ان کی اس طبعی جولانی و بے قراری سے ان کی عبارت میں روانی اور بہاؤ بہت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں عبارت ناہموار ہو گئی ہے تاہم بحیثیت مجموعی یہ صفت و خاصیت شروع سے آخر تک جاری و ساری دکھائی دیتی ہے خواہ وہ کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں یا ناول تحریر کر رہے ہوں، کوئی خط قلمبند کر رہے ہوں یا مذہب پر بحث و تمحیص ہو رہی ہو، عبارت اس طرح رواں ہوتی ہے اور لطف یہ کہ یہ روانی اپنے اندر ایک ہنگامہ رکھتی ہے، پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک تند و تیز مواج دریا ہے جو پہاڑوں سے ٹکراتا کہیں آبشاریں بناتا، کہیں دل آویز نغمے الاپتا، کہیں سرسبز وادیوں اور خوش رنگ پھولوں کو آئینہ دکھاتا اور

کہیں اپنے کناروں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نیاز قلم ہاتھ میں لیتے ہیں اور خیالات و جذبات کا ایک طوفان امنڈ آتا ہے۔ جس کا مقابلہ ہر صاحبِ قلم نہیں کر سکتا۔ لیکن نیاز اس پر قادر ہیں۔ وہ جس تیزی کے ساتھ سوچتے ہیں اور جس طرازی سے خیالات ان کے سامنے آتے ہیں اسی سرعت اور اسی افراط سے وہ حوالۂ قلم کرنے پر قادر ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملے کو وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح لکھ بھی دیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو شاید ہی کبھی یہ گمان ہوا ہو کہ عبارت ان کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ یا ان کے الفاظ تشنۂ مطالب ہیں، بلکہ بعض اوقات تو انکے قلم کی جولانی و روانی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مطالب عبارت کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ کولیرج کے نزدیک مشکل باتوں کو آسان طریق پر نثر میں نمایاں کر دینا بہت بڑا کمال ہے۔

اس روانی کے ساتھ ساتھ نیاز کے اسلوب میں ایک دلکشی بھی ہے اس دلکشی کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ ان کی رومانیت پسندی ہے۔ جو شاید ان کے طبعی اضطراب اور بے سکونی کے ردِ عمل سے پیدا ہوئی تھی، جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ بعض اوقات لکھتے لکھتے کھو جاتے ہیں۔ اور دور اپنے رنگین خیالات کی وادیوں میں محوِ سیر و تماشا نظر آتے ہیں۔ نیاز کا لکھا ہوا کوئی منظر خواہ وہ بمبئی کا ساحل ہو یا حیدرآباد کی کوئی دلنواز شام ہو یا روہیلکھنڈ کی کوئی پہاڑی ہو، یا کسی مصری زبیدہ کا تذکرہ ہو یا بارش، کوہسار، سمندر، سبزہ زار، طلوعِ آفتاب و مہتاب کا بیان ہو، ان چیزوں کا ذکر اُن کی تحریر میں ایک ولولہ پیدا کر دیتا ہے، وہ اس بیان میں ایک کیف آور مستی محسوس کرتے ہیں۔ بالخصوص عورت، اس کا حسن، اس کی محبّت، اس کی جوانی، اس کا لباس اور پیکر، ان کی رومانی تحریروں کا بہت بڑا حصّہ ہوتے ہیں، عورت کا معاملہ من حیث المجموع ان کے ہاں بہت حسین پیچیدگیوں اور پیچیدہ حسن آفرینیوں کا حامل ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کی عظمت اور اس کی اہمیت اس کی اس کے زندگی بخش وجود کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتے ہیں،

حالانکہ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اس کی دلنوازی اور جان آفرینیوں کے قصیدہ خواں ہیں، وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ عورت گلشن رنگ و بو' ہے اور ہستی کے دھڑکتے ہوئے دل کی راحت، لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کے متعلق اور کبھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں، اسے اور بھی اچھی طرح سمجھنے کی خواہش اُن کے دل میں موجزن ہے اور پھر زیادہ الفاظ میں بسیط تر ذکر اور بیان کے ذریعہ وہ اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو داد وہ عورت کو دیتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی فراخدلانہ اور مخلصانہ کیوں نہ ہو، تاہم اُن کے دل کو تسکین نہیں ہوتی، انہیں اس سے زیادہ الفاظ کی ضرورت ہے اور اگرچہ اس کے پاس الفاظ ہیں لیکن اس احساس کی بے پایانی کا کیا علاج کہ ہر لحظ ایک نیا رنگ ہے اور ہر رنگ میں ایک نئی ترنگ، یہی عناصر مل جل کر ان کے اسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں یعنی عبارت میں ایک دلکشی اور دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

"ادھر چاند کی دیوی اپنے مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زریں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی اور سطح آب پر سایہ کی تاریکی جو مشرق کی جانب سمٹی جا رہی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر آنکھیں آنکھیں کھول رہا ہے۔ [۱]

"وادیٔ قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا۔ فرطِ تعطّر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہو گئی تھیں۔ چاند چار سمیں پھیلا کر اس پر اتر لینے کی کوشش کر رہا تھا، چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بس کر رہ گئی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں ہیں اور حباب گھونگرو کے دانے جو صبا کے سبک و نازک پاؤں سے فرشِ آب پر ہنگام رقص نکل کر

---

[۱] - نگارستان صفحہ ۱۱

رہ گئے ہیں کرۂ آب یا دشتِ نیلوفر میں جو کلی کہیں کھل کر رہ گئی تھی اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا بت کسی شوالے میں رکھا ہے۔ ؎۵۱

کل سے بارش ہو رہی ہے اور یہاں کی وادیاں، ایسا معلوم ہوتا ہے ان میں زمرد حل کر کے بھر دیا گیا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا خم کے خم لئے پھرتا ہے اور کوئی پینے والا نہیں۔ مینہ کا ہر ہر قطرہ نغمہ جان سے لبریز ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں ہے۔ ؎۵۲

تمام کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا، جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا ٹکڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہو ہو کر ساحل پر سر ٹپک رہی تھی، متحرک امواجِ آب میں نشر ضیا کا وہ عالم تھا کہ گویا حوریں اپنی زلفوں کی افشاں دھونے کے لئے پانی میں اتر آئی ہیں۔ ؎۵۳

چاند بلند ہو کر تمام سطح آب پر ایک روشن تھرتھری، ایک منور ہلچل پیدا کر چکا تھا۔ لیکن لہروں کا خرام ناز ایک ایسا خرام خاموش تھا، جس کو ہماری نگاہیں تو دیکھ سکتی تھیں لیکن سامعہ کے لئے کوئی آواز ایسی نہ تھی جس کو ہلکی موسیقی سے بھی تعبیر کر سکیں۔ چاند کی کرنیں نہایت آزادی کے ساتھ پانی سے کھیل رہی تھیں، تمام سطح آب پر بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں اور کوئی دامن اس چاندنی کو جمع کرنے والا نہ تھا۔ چاند آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا اور اپنی متین اور سنجیدہ رفتار کے ساتھ نصف آسمان تک پہنچ کر معلق نظر آنے لگا، ہوا چل رہی تھی لیکن اس قدر نرمی و نزاکت کے ساتھ کہ درختوں کی پتیاں بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکتی تھیں اور

؎۵۱ مکتوبات حصہ اوّل ص۱۱۱ ؎۵۲ مکتوبات حصہ اوّل ص۱۱۱
؎۵۳ مکتوبات حصہ اوّل ص۱۱۱

چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی اپنی جگہ آسودہ نظر آرہا تھا۔ [1]

جہاں تک عورت اور اس کی خوبیوں کے بیان کا تعلق ہے، نیاز کی مذہبی قسم کی تحریروں کو چھوڑ کر باقی تمام تحریریں ان مضامین سے رنگین ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے نیاز حسن کے فریفتہ و دلدادہ ہیں اور ان کے ہاں تمام کائنات کے حسن کا نچوڑ، اور تمام عالم کی رعنائیوں کا عطر اور تمام اوصاف کا ہیولیٰ اگر کوئی چیز ہے تو وہ عورت ہے شروع کی تحریریں بالخصوص لبریز کیف و مستی ہیں، نیاز کے رومانی افسانوں کی جان انھیں انھیں بنانے والی قوت، ان میں شعریت و رنگینی کی کیف آگینی شامل کرنے والی لطیف شے صرف عورت ہے۔ عورت کے نغمے نے ان کے ہر لفظ کو، ہر جملے کو، ہر قصے کو رومانی اور روحانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد[2] دی ہے نہ تمام افسانوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں اور نہ بہت سی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت تاہم بطور نمونہ چند ایک سطور کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

> اپنی دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک متلاطم نور، ایک سیلاب رنگین، ایک طوفانِ حسن و شباب یعنی ایک عورت، مکمل عورت تمام نازک ترین خصوصیاتِ نسائی لئے ہوئے دوکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے[3]
>
> خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے لوگ خدا جانے کیا کیا بے سر و پا دلائل پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ چمیلی اور گلاب کے افشردہ کو منجمد کر کے اس سے ایک مجسمۂ جمیل تیار کرنا اس کی رگ رگ میں آتشِ سیال دوڑا دینا اور کمر کی دونوں طرف کا بلور نکال کر سینہ میں بھر دینا تاکہ ایک ہی وقت میں شباب کی نزاکت و قوت دونوں بجلی کی منفی و مثبت رو کی طرح دیکھنے والوں کو مسحور کر لیں۔ سوائے خدا کے کوئی اور

---

[1] جمالستان ص ۱۲۱   [2] ہمارے افسانے ص ۱۰۱

کر سکتا ہے؟ یاد رکھیے، یہ جی چاہتا تھا کہ کاش میں ذرّۂ خاک ہو کر اس کی راہ میں پڑ جاتا اور وہ پامال کرتی گزر جاتی۔ [۱]

وہ یونان کے اس عہدِ زریں کا مجسمہ تھا، جب مقصدِ فطرت صرف حسن کا پیدا کرنا تھا اور اس کے ساتھ پرستاریٔ حسن کو عام کر دینا، ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی چمپئی رنگ کی مورت، سر سے لیکر پاؤں تک لوچ ہی لوچ، اعضاء کے لحاظ سے سراپا تناسب و موزونیت، ہر ہر ادا سے نشہ بخش و سحر انگیز، ہیئیات کے اعتبار سے یکسر برق بجوالہ، تاثرات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی، اور محبت کی پذیرائی میں ہمہ تن درد آہ، کراہ۔ [۲]

صحرائے عرب آج تک ایسا غزالِ رعنا پیدا نہیں کر سکا اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیاہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی، اس کی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے شراب بھی، جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی، اس کی لانبی پلکیں، جس کی ہر جنبش بحالت التفات رگ جاں ہے، اور بصورت عتاب نوکِ سناں، اس حریر سے بنائی گئی ہیں جسے نازنینان روما کی نرم اور لچکیلی انگلیاں تیار کرتی ہیں۔ [۳]

اس کا رنگِ جسم یہ معلوم ہوتا تھا کہ نسترن زار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگِ شفق ملا کر بلوریں جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے، آنکھوں کے سکر و خمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے جو ابد ہینہ کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے۔ [۴]

---

[۱] جمالستان صفحہ ۱۱۰
[۲] جمالستان صفحہ ۷۵
[۳] جمالستان صفحہ ۳۲۳
[۴] مذاکرات نیاز صفحہ ۷۹

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک ایسا عمیق چشمہ تھیں، جن میں
دلربائی سے زیادہ معصومیت اور مادیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی۔[۱]

حسن عام اس سے کہ وہ ایک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور ایک
ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو یا جنبش لطیف میں پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا
نشیمن بنانا پسند کرے۔ فطرتاً اس امر کا مقتضی ہے کہ حسن ہی اس کا متجسس ہو
جمال ہی اس کی جستجو میں سرگرداں ہو، جس طرح نزاکت کا بار اٹھانے کے
لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، نازک بیلوں پر ایک تیتری ہی بیٹھی
ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے، ایک حسین صبیح پیشانی پر کچھ صندل ہی کا قشقہ
لطف دیتا ہے، معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کی خصوصیات مجھے بہت
پسند ہیں، وہ جاذب ہے اور یہ منجذب، وہ پسندیدۂ حسن ہے اور یہ
حسن پسند، عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سنا ہے کہ پارہ
بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی گردن جھکا کر جھانک نہیں لیتی۔[۲]

عورت ایک لذت ہے مجسم، ایک تسکین ہے متشکل، ایک سحر ہے مرئی
ایک نور ہے مادی۔[۳]

زیادہ مثالیں طوالت کا باعث ہوں گی کیونکہ عورت اور اس کے حسن کا
بیان جہاں بھی ہوا ہے ایک نئے پیرائے سے ہوا ہے، یہ امر نیاز کے ذوقِ جمال، یہ
حسن پرستی اور اس کا والہانہ بیان ان کی تحریروں کو ایک حسن اور دلکشی بخشتا ہے۔

نظم و نثر دونوں میں رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے اکثر تشبیہات سے
کام لیا جاتا ہے۔ نیاز اس فن میں بھی بہت مہارت رکھتے ہیں۔

اس کے جوتے کی نوک ایسی سریع جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی
تھی جیسے ہرن کے پاؤں چوکڑی بھرتے وقت، اور جب برقیہ کی رنگین

---

[۱] نگارستان صفحہ [illegible]
[۲] صفحہ [illegible]
[۳] نگارستان صفحہ [illegible]

روشنیاں اس کے قامت خوش اندام پر ڈالی جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ پرستان کی کوئی مخلوق ہے جو راستہ بھول کر دنیا میں آگئی ہے یا سمندر کی دیوی ہے جو دنیا کو ڈبو دینے سطح آب پر آگئی ہے۔ ؎۱

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایک سفید فاختہ یا کبوتر معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خدوخال کی کشمیریت اسکی انکھوں کی نشیلی کیفیت ؎۲

اس کے بال ایسے تھے جیسے بھیگا ہوا سنہرا ریشم اور جو بال ذرا الگ ہو گیا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کے پیالے میں باریک سونے کا تار، اس کا جسم سفید تھا جیسے چنبیلی، اور اس کا نیچے کا حصّہ جیسے چاندی اور موتی، ہاں، اس کا یہ حصۂ جسم ایسا ہی تھا اور سمندر کی سبز گھاس اس کے چاروں طرف لپٹی ہوئی تھی، اس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے ہونٹ جیسے بالکل مونگا۔ ؎۳

اس کا نام کملا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح . . . . اس کنول کی طرح جو سطح آب سے اونچا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور لچکیلی تھی، اس نے لپشت کی طرف کرسی پر اپنی نازک اور ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راج کماری گنگنانے لگی اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگا دی جائے، سچے موتیوں کے باریک ذرے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

؎۱ نگارستان ص۱۷۱ ؎۲ نگارستان ص۱۷۱

؎۳ جمالستان ص۲۸۱

اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں
جگنو چمک رہے ہوں ۔ [1]

عریاں شانہ دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے
تھے جیسے آئینہ میں دور کے کسی آبشارِ زریں کا نظارہ ۔ [2]

اس کے ساتھ ساتھ نیاز رقص وسرود اور نغمہ و آہنگ کے بھی شیدا ہیں
ان کی یہ فریفتگی اور ذوقِ نغمہ بھی ان کی تحریروں پر اثرانداز ہوا ہے ۔ ان کی طبیعت
میں مغنی کی لے اور رقاص کی لچک جاں گزیں ہے جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر
ان کی عبارت میں بھی یہ نغمگی اور حرکت منتقل ہو جاتی ہے ۔ اسے عبارت کی خوبی
سمجھا جاتا ہے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے کہا ہے کہ :-

ہر بہترین نثر کی علامت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت آواز میں مد و جزر
اور دل آویزی پیدا ہو ۔ [3] ذرا غور سے دیکھیں تو ان کی عبارتوں میں یہ اثرات
جگہ جگہ بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں اسکی سب سے بڑی نشانی الفاظ کی تکرار ہے مثلاً :-

گھر گھر مجالس لطف ونشاط کا قیام گوشہ گوشہ میں رندان بادہ کوش
کا اژدہام ، ہر ہر بام سے حسن دلنواز کی جلوہ فروشی اور ہر ہر گلی میں عشق
کی تپش اندوزی ، ہر شام کو شب عیش کے وہ اسباب گویا صبح تک
زندہ رہنا نہیں ہے ۔ [4]

پیاپے جام بھر بھر کر دیئے جانے لگے ۔ لوگوں نے خالی کرنا شروع
کئے ۔ اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں ، سرکٹ کٹ
کر فرش پر گر رہے تھے ۔ [5]

نہ بچے کی تمیز تھی نہ عورت کی ، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر ،

---

[1] جمالستان ص ۱۷۵ [2] جمالستان ص ۲۰۲ [3] اردو اسالیب بیان ص ۱۷ محی الدین قادری زور [4] انتقادیات اوّل ص ۲۷ [5] حسن کی عیاریاں ص ۱۵۰

اس کے بعد خاص طور پر عبارت کو دلکشی اور دل آویزی سے مزین کرنے والی چیز جا بجا حسین و لطیف اور بے تکلف شعروں کا استعمال ہے۔ یہ چیز بھی نیاز کی شاعرانہ طبیعت کا پرتو ہے، کوئی موضوع ہو حسب موقع اپنے مقصد کی وضاحت کے طور پر یا اپنے کسی قائم کردہ نظریہ کے ثبوت یا سند کے لئے یا کسی منظر و کیفیت پر روشنی ڈالنے کے لئے شعر کا استعمال کرتے ہیں اور اس بے تکلفی سے کہ لطف آجاتا ہے اشعار کا یاد رکھنا واقعی قابل ستائش امر ہے اور اچھے اشعار کا انتخاب اور بھی زیادہ قابل تعریف بات ہے لیکن برموقع اور برمحل کسی شعر کا استعمال تو صلاحیت کا اظہار ہے اور یہ بات ہر آدمی کے بس کی نہیں۔ ویسے تو شاید ہی کوئی نثر نگار ایسا ہوگا جو نثر لکھتے وقت شعر کے استعمال سے کلی طور پر اجتناب کرتا ہو، لیکن جس کثرت اور خوبی کے ساتھ ابوالکلام اور نیاز اشعار سے کام لیتے ہیں وہ چیز عام نہیں۔ جہاں کہیں زیادہ کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے، وہاں اشعار کا استعمال اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے، مثلاً ان کے خطوط میں اشعار کی بہتات ہے اور لطف یہ ہے کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر ٹھونسا گیا ہے۔ جو شعر جہاں آیا ہے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا آنا اشد ضروری تھا ورنہ شاید یہ بات نہ بنتی۔ یہ چیز بھی ان کے کمال فن پر دلالت کرتی ہے، ان کے ذوق کی بلندی اس امر سے ظاہر ہے کہ گھٹیا درجہ کا یا پست مضامین کا حامل شعر شاید ہی کہیں مل سکے۔

خط ۱۲۔ اس برہمی پر نثار ہو جائیے اس "تو سے نا ہیں بولوں گی" والی ادا کے قربان جائیے۔ نظام رامپوری کا شعر یاد آگیا:۔

اے جان کہو پھر اس ادا سے — میں آج نظام سے خفا ہوں

کاش ایسا ہوتا کہ بجائے "جان عالم" کے جان نیاز لکھ سکتا۔ ہائے غالب

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

زندگی کے دوسرے سوانح کا ضبط و شمار کیا . . . تاہم مَن پیدائش و وفات کی جگہ آپ "ازل تا ابد" لکھ سکتے ہیں اور سوانح زندگی کی جگہ صرف یہ شعر:۔

مذہب کا خون آشام دیوتا بپھرا ہوا تھا اور انسانی جان کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا وہ خون کا پیاسا تھا اور اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ میں ڈالے جا رہے تھے اور ان کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بدبو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر دیوتا خوش ہو رہا تھا حسین عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور ان کی چیخیں سن سن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا [1]

میری تکریم، میری قدر، میری محبت صرف پیرس میں ہوتی ہے،
وہ پیرس جو کعبۂ عشاق ہے، جو قبلۂ اہل دل ہے جو زیارت گاہ حسن ہے۔ [2]

اس کے جسم سے شعاعیں نکل نکل کر میرے دل کے اندر تپ کی
حرارت پیدا کر رہی تھیں . . . . [2 الف]

یاد رکھو کہ یہ جنت کا لالچ دلا دلا کر رات بھر مریدوں سے
پاؤں دبوانے والے دن دن بھر ملازموں کی طرح کام لینے والے مذہب کے دشمن ہیں [3]

میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، اُن کے جسم کا ریشہ ریشہ حرم پناہ [4]

اللہ میاں کو توبہ توبہ تم نے خانہ زاد سمجھ لیا ہے۔ جو بات بات میں
تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے۔ [5]

وہاں کالے کالے بادلوں میں سرخ سرخ ڈیلیا پھولتا ہے تو یہ،
"کاک ٹیل" دماغ انسانی پر کیا اثر کرتی ہے، مجھ پر اوّل اوّل جو اثر ہوا اگر میں
بیان کروں تو آپ کو اعتبار نہ آئے گا۔ [6]

بچہ بے قرار ہے، ماں آغوش میں بھینچ بھینچ کر، سینہ سے لپٹا لپٹا کے،
منہ چوم چوم کے اپنی ساری قوتِ محبت سے اسے چپ کرا رہی ہے۔ [7]

---

[1] حسن کی عیاریاں ص ۱۵۷ [2] ایضاً ص ۱۵۶ [2 الف] جمالستان ص ۲۱۶
[3] مکتوبات حصہ اوّل ص ۲۹ [4] مکتوبات حصہ دوم ص ۱۷۵ [5] مکتوبات حصہ اوّل ص ۶۷ [6] مکتوبات حصہ دوم ص ۲۹۴ [7] نگارستان صفحہ ۸۲

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست　　　　خام بُدم پختہ شدم سوختم [1]

کبھی کبھی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال
کا جائزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے
جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، کیا وہ واقعی صحیح و درست ہیں۔
اتنی نہ بڑھا پاکیِٔ داماں کی حکایت۔ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ [2]

. . . سو یہ چند لمحوں کی بات ہے۔ اس کے لئے ساری زندگی خراب
کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تم تو ایک حد تک مذہبی انسان بھی ہو۔ اس
لئے تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ :۔

روئے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ　　　　آں جا کہ نغمہ ہائے ید اللہ حی زنند [3]

سوادِ بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کر کے تمام اُن کیفیات کی یاد ستانے
لگی جن کو ہر چند میں بھلا چکا تھا۔ لیکن انکے بھلا بیکی ابدا کبھی نہیں بھول سکتا
جاتی ہے کشمکش کہیں اندوہ عشق کی　　گو دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا [4]

ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ نیازؔ اس پر بھی قادر ہیں کہ پورے شعر کے
بجائے مصرع پر ہی اکتفا کریں اور مصرع کو اس خوبی اور مہارت سے عبارت میں پیوست
کریں کہ وہ نشتروں کا کام دے۔ مصرعوں کے استعمال کے بارے میں اگر یہ کہا جائے
کہ اردو نثر نگاروں میں نیازؔ کا مقام سب سے ممتاز ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ پڑھتے
پڑھتے عبارت میں مصرعے آتے چلے جاتے ہیں اور اس بے تکلفی سے کہ کہیں روانی
میں فرق نہیں آتا مثلاً :۔

ارے بھئی ان کا کیا ہے۔ ع　　　　وہ جیسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں
مشکل تو ہماری ہے کہ ع　　　　ڈوبنے جائیں تو دریا ملے پایاب ہمیں [5]

---

[1] مکتوبات اوّل ص۲۲۳ [2] من و یزداں ص۸۷ [3] تاملات نیاز ص۱۰
[4] مذاکرات نیاز ص۳ [5] مکتوبات سوم ص۲۷

لیکن جب اپنی فراست سے اسے سمجھا تو آپ جانتے ہیں کیا ہوا ؎

خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند۔

آپ سمجھے یہ "درجات" کیا وہی درجاتِ بے نیازی وہی ؎

نتواں ترا دجاں را بہم امتیاز کردن ؂۱

اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی

حزن وملال پنہاں تھا۔ گویا کسی نے یہ کہا :۔

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد ؂۲

اگر جنّت ایک زاہدِ شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل

کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ :۔

فردوس را بدامِ نگہ می کنم شکار ؂۳

میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت

ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے کہ :۔

مستم چناں کہ گل نشاسم زنوکِ خار۔ وغیرہ ؂۴

؂۵

"وہ محسوس کرنے لگا کہ دنیا نام ہے صرف۔ ہمیں جائے من وجائے تو باشد" کا

یہ ذوق شعران کی طبیعت میں اتنا رچ گیا تھا کہ حافظ کی بے پایانی نے یہ اقتدار

حاصل کر لیا ہے کہ نیاز بے تکلفانہ دیکھتے جاتے ہیں اور ان میں شعر تو رہا ایک طرف مصرع

بھی نہیں بلکہ ایک ایک دو دو الفاظ اس طرح کے پیوست کرتے جاتے ہیں کہ قاری کا ذہن

خود بخود اشعار کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ چیز کمال وضاحت پر دلالت کرتی ہے

کہ ایک دو لفظ جو اکثر ٹے بھی ہوں بلکہ اگر کوئی نہ پہچانے تو یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ انکا

پس منظر کہ ہے، ور پس منظر نامعلوم ہونے کے باوجود بھی ان کی ذاتی قدر و قیمت میں

؂۱ مکتوبات سوم ص۹۱ ؂۲ مذاکرات ص۳۳ ؂۳ من ویزداں ص۳۶
؂۴ من ویزداں ص۳۵ ؂۵ شہاب کی سرگزشت ص۱۴۷

فرق نہ آئے، اس طرح عبارت میں لائے جائیں کہ محض ان کے اشاروں ہی سے وسیع مضامین خیال میں آجائیں اور عبارت بھی گراں بار نہ ہو۔

جی ہاں کل میر صاحب تشریف لائے تھے۔"اور جتنی گالیاں انھیں یاد تھیں سب صرف دربان کر گئے۔ میں آپ کا دربان ہی ہوں نا۔ [۱]

اس عبارت میں انھوں نے غالب کے شعر کو خوب کھپایا ہے:۔

واں گیا بھی تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

اسی طرح غالب کے اس شعر کی طرف:۔

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے۔ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

اس عبارت میں کیسا اشارہ کیا ہے۔ دیکھئے:۔ اور یقیناً یہ اجتماع بڑی خدا ساز" بات سمجھی جاتی ہے . . . . [۲]

اس طرح جب ہم ان کی یہ عبارت پڑھتے ہیں:۔

آپ کو یاد ہوگا جب ہم آپ کسی وقت ایک "رندِ شاہد باز" کی فرضی تصویر کھینچ کر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے۔ [۳]

اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

حکم برستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے۔ یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے:۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی ہیں۔ کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم

. . . سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک سینوں پر "خانہ برانداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر . . . حقیقت یہ ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں شہادت کو زندہ قرار دے یا اس خونبہا کو۔ [۴]

---

[۱] مذاکرات اوّل ص۷ [۲] مذاکرات نیاز ص۲۱ [۳] مذاکرات نیاز ص۱۰۱ [۴] مذاکرات نیاز ص۱۰۵

اس عبارت سے ذہن فوراً ان دو اشعار کی طرف جاتا ہے :-

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ۔ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی — سودا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ ۔ شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا — غالب

پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر دریائے جہلم اور ڈل جھیل کی رعنائیوں میں گرمیِ خرام پیدا کر رہی ہے اور ہوا کا جھونکا گویا "موجِ خرام" یا ہے جو ہر جنبش پر گویا گل کتر کر گزر جاتا ہے ۔ ؎

ظاہر ہے کہ خرام یار اور گل کترنے سے غالب کے اس شعر کیطرف اشارہ مقصود ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ انداز نقش پا — موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ایک اور خصوصیت جو نیاز کی نثر میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات جذبات کی شدت کے وقت ان میں ایک خطیبانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی چھوٹی سی بات کو جو مختصر عبارت میں بھی بیان کی جا سکتی ہو خوب پھیلا دیتے ہیں ۔ یہ چیز بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرز نگارش" سے مماثلت رکھتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا طبعاً خطیب ہیں ۔ اس لئے ان کی عبارت میں اس چیز کی افراط ہے ۔ اور خطیبانہ رنگ نیاز کے مذہبی مضامین میں دوسرے مضامین کی بہ نسبت زیادہ دکھائی دیتا ہے ۔ چند ایک مثالیں جو نیاز کی مختلف کتب سے لی گئی ہیں ملاحظہ فرمائیے :-

میں دیکھ سکتا ہوں کہ ایک شخص محبوس ہو کر اپنے وطن کی یاد اپنے دل سے بھلا دے ۔ اس منظر کو برداشت نہیں کر سکتا کہ آزاد کی حالت میں ترک الفت کے بہانے تلاش کئے جائیں ۔ میں اس بات کو سن سکتا ہوں کہ ایک شخص دام اضطراب میں ممنوعات اپنے اوپر جائز کر لے لیکن اس کے سننے کی تاب مجھ میں نہیں کہ صرف ہوا و ہوس کی مجبوری سے کسی لغو تاویل کو درست سمجھ لے ۔ میں ایک ظالم و سخت گیر قوت کے سامنے سر جھکا دینے والوں پر ملامت نہیں کرتا خواہ وہ قوت کتنی عدوئے دین کیوں نہ ہو ۔ لیکن میرے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبتک

میں دیکھتا ہوں کہ وہ قوت سر جھکا دینے پر کسی کو مجبور نہیں کرتی اور یہ عجز و نائیت اخلاق کا نتیجہ ہے۔ میں کسی جدید تعلیم یافتہ کو مذاق سلیم سے معرا دیکھ کر اس خیال سے خاموش رہ سکتا تھا کہ یہ اس کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن اظہار نفرت و ملامت اس وقت میرے اختیار سے باہر ہے جب میں جان لوں کہ تعلیم جدید سلب وجدان نہیں کرتی۔ میں کسی کو مجنونِ فیشن و لباس دیکھ کر اس یقین کی بنا پر دم بخود رہ سکتا ہوں کہ شاید فنون یورپ صرف یہی سکھاتے ہوں گے۔ لیکن . . . . الخ [1]

جب ارتقائے انسانیت کی یہ حالت ہے اور کارگاہِ قابلیت کا یہ عالم، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جو ادبی روحانیت اور روحانی ادب سے اظہار نفرت و حقارت کو معیار قابلیت دے چکے ہیں، وہ لوگ جو ذوق شعر ہی سے اس لئے متنفر ہیں کہ یورپ ان کا مرشد مقدس اس طرف متوجہ نہیں۔ وہ لوگ جو پاکیزہ ترین ادبی مذاق کو بھلا بیٹھے ہیں، اس بنا پر کہ ان کے پیرمغاں کا وہ مسلک نہیں، وہ لوگ جنھوں نے اپنے اپنے محاسنِ قومی و خصوصیات مذہبی سے یکسر روگردانی اختیار کرلی ہے، اس خیال سے کہ وہ ایک مدعیِ تہذیب قوم کے نزدیک افسانہ ہائے پارینہ ہیں وہ لوگ . . . . الخ [2]

یہ آپ نے خوب سوال کیا کہ دنیا میں کسی چیز کا قائل بھی ہوں یا نہیں . . . . اے حضرت آپ کا قائل ہوں آپ کی پارسائی کا قائل ہوں، آپ کی شب زندہ داریوں کا قائل ہوں . . . . [3]

خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی روحیں کانپ اٹھی ہوں گی۔ سکندر و نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہوگا۔ آج کل

---

[1] مقدمہ گیتان جلی [2] مقدمہ گیتان جلی ص ۶-۷ [3] مکتوبات سوم ص ۲۷

کے سینڈوا اور رگاما کا کیا ذکر وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو ٹوکتے ہیں
آج سے میری تمام تحریریں ایک ایسے شخص کی تحریریں سمجھی جائیں جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں . . . . لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا۔ اگر وہ فکر و رائے کی حریت کا دشمن نہیں ہے اگر وہ بغیر اطمینان نفس پیدا کئے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا۔ اگر وہ مجموعۂ مزخرافات و خرافات نہیں ہے اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانے میں دست گیر و راہنما بن سکتا ہے۔ تو اے مسلمانو میں پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں۔ ان کو کیا منصب حاصل ہے کہ وہ ایک توحید خداوندی کا اقرار کرنے والے کو کافر قرار دیں . . . . [۱]

جہاں تک فقروں کی ساخت کا تعلق ہے۔ یہ بالعموم لمبے ہیں اور اس وصف میں وہ سرسید کے انداز سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ سرسید کی بھاری بھرکم شخصیت اور ان کے وسیع و عریض مقاصد، ان کی بے پایاں ذمہ داریاں ان کی طرز تحریر پر اسی صورت میں اثر انداز ہوئیں یعنی عبارت میں بھی ایک بھاری بھرکم پن پیدا ہو گیا سرسید کی عبارت میں اور جب، لیکن، اگر، مگر پھر کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ یہی چیز بڑی حد تک نیاز کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نیاز کی ذمہ داریاں سرسید کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے انکی دنیا سرسید کی دنیا سے بہت وسیع ہے۔ نیاز نے بہت زیادہ لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس چیز میں ان کی طبیعت کی جولانی کے علاوہ ان کا ایڈیٹر ہونا بھی کسی حد تک ممد ہے۔ یعنی ایک تو طبیعت کی اس افتاد کے سبب وہ جلد جلد اور تیز تیز اپنے مطالب کا بیان کرنا چاہتے تھے۔ ان کے فقرے لمبے ہو گئے۔

اور جو، جبں وغیرہ کی قبیل کے الفاظ زیادہ استعمال نہیں آئے۔ دوسرے ایک رسالہ کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے بعض اوقات انھیں نصف یا اس سے بھی زیادہ پرچہ خود ہی لکھ کر پورا کرنا پڑتا تھا۔ [1] اس وجہ سے بھی انھیں بہت زیادہ اور بہت مختلف موضوعات پر قلم اٹھانا پڑا جس کی وجہ سے جہاں مضامین وسیع ہوئے وہاں عبارت کے جوڑ بند بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ نہیں کہ نیاز کے ہاں چھوٹے فقرے نہیں پائے جاتے۔ چھوٹے فقرے بھی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ان کی عبارت رواں ہونے کے باوجود کسی حد تک پھیکی ہو جاتی، خطوط میں زیادہ حد تک چھوٹے چھوٹے فقرے استعمال کرتے ہیں اور مذہبی بحثوں میں زیادہ تر طویل فقرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں موضوع زیادہ سنجیدہ ہو اور امور بحث طلب ہوں وہاں فقرے لمبے ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں محض شگفتگیِ خاطر کے لئے لکھی جائیں ان میں فقرات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ ان کے طرزِ تحریر کی چند مجموعی خصوصیات ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ ہر موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور مضمون کے لحاظ سے ایک جدا اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ افسانہ اس میں بھی رومانی اور عام اخلاقی افسانہ۔ استدلالی اور مذہبی مضامین، انشائے لطیف، عام علمی مضامین، تنقید اور خطوط وغیرہ موضوعات ایک دوسرے سے بُعدِ بعیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی مصنف کے مختلف موضوعات کی عبارتیں بالکل یکساں نہیں ہوتیں۔ مصنف کی طبیعت کا جزو اہم ان میں قدرِ مشترک کے طور پر ضرور موجود ہوتا ہے اور اس سے اس کا مصنف پہچانا جاتا ہے۔ خواہ موضوع کوئی کیوں نہ ہو لیکن مضامین کے اپنے اپنے لب و لہجہ کے تفاوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد کی عبارات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دربار اکبری، آبِ حیات، نیرنگ خیال،

---

[1] ۱۹۳۰ء کے قریب کے رسائل ملاحظہ ہوں۔

بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ لیکن میر ایران اور ان کے خطوط کا اسلوب ان سے مختلف ہے۔ سخندانِ فارس نہ ان کے خطوط کی طرح سادہ ہے نہ آبِ حیات کی طرح پرکار۔ قصص ہند اور درسی کتابیں جو مولانا نے ناد انستہ طور پر عبارت میں لکھیں۔ ان کا انداز اور اسلوب جداگانہ ہے۔ لیکن ان تمام ظاہری فرق کے باوجود مولانا کی طبیعت کا خلوص اور دردمندی ہر جگہ کارفرما ہے اور آزاد کا شخصی رنگ ہر عبارت میں ہویدا ہے۔ اس لئے یہ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ عبارت کا مصنف کون ہے۔ یہی حال مولانا شبلی کا ہے۔ انھوں نے سیاسی تاریخیں بھی لکھیں اور علمی ادبی مضامین بھی لکھے اور خطوط بھی، لیکن شعر العجم میں جو دلکشی ہے، ظاہر ہے کہ وہ الغزالی میں نہیں ہو سکتی۔ اور جو دل آویزی ان کے خطوط میں ہے وہ مقالات میں نہیں اور لطف تو یہ ہے کہ خود ان کے خطوط لطف اور چاشنی کے لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو عطیہ فیضی کو لکھے گئے اور باقی جو مکاتیب شبلی میں شامل ہیں۔ تاہم شبلی اپنی ہر تحریر میں موجود ہیں۔ ان کی حسّاس طبیعت اور مزاج کی نزاکت ہر جگہ نمایاں ہے۔ بعینہٖ یہی حال نیاز کی تحریروں کا ہے۔ اُن کی کوئی تحریر اٹھا کر دیکھ لی جائے۔ نیاز کی مضطرب طبیعت اس میں جلوہ گر ہوگی ہر جگہ عبارت کی طراری اور زلزلہ انگیزی اپنے مصنف کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

بہر حال یہ درست ہے کہ نیاز کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت بہت زیادہ تھی۔ اس زمانے میں ٹیگور کا اثر ان پر زیادہ تھا۔ مضامین خیالی بھی بہ افراط تھے۔ اور مجرد تشبیہات کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان کی وہ نثر بیدل کی شاعری سے مماثل کہی جا سکتی ہے۔ جو خوبی اور رعنائی کے باوجود لفظاً بھی اور معناً بھی مشکل تھی۔ لیکن اسکے باوجود اس میں وہ دلکشی تھی کہ نوجوانوں نے ان کے اسلوب کی تقلید کرنا چاہی اور انکا بھی وہی حشر ہوا جو بیدل کی شاعری کے مقلدین کا ہوا یہ چیز عجیب وغریب ہے کہ ایک شاعر اپنے مقلدین سے گھبرا کر اپنی روش میں مناسب ترمیم کرنے پر مجبور ہو۔ جیسا کہ ناجور نجیب آبادی نے لکھا ہے۔ لہ (لہ روح انتخاب ص ۳۴)

اس امر کے متعلق عزیز احمد نے اپنی مشہور تصنیف "ترقی پسند ادب" میں مواخذہ کیا ہے۔ وہ ان کی اس رومانیت پسندی کو ادب برائے ادب کے مسلک سے تعبیر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اگر جدید اردو ادب میں واقعتاً ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہے تو وہ نیاز فتح پوری ہیں اور اس کا نتیجہ دیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو شاعر کا انجام کا تہدیہ" ؎۱ اس تہدیہ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اے دلِ ویرانہ ! اپنے نغمہ ہائے شکستہ تیرے ہی ساز بے خودی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ عرض نغمہ تیری ہی ہستی متالم کے حضور میں خجلتِ کاوش نہ ثابت ہو۔ ؎۲ ظاہر ہے کہ یہ رنگ آخر تک قائم نہیں رہا۔ نیاز خود اس طرف متوجہ ہوئے اور عبارت کو سہل بنانے کی کوشش کی۔ بعض مقامات پر انداز بیان کو بدل دیا اور بعض مقامات پر بہ خیال خود غیر ضروری عبارت کو کاٹ دیا۔ شہاب کی سرگزشت کے پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں اسی قسم کا ردوبدل ملتا ہے ؎۳ اسی طرح انھوں نے متعدد جگہ عبارت کو مختصر کرکے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی ہے مثلاً

غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ زمانہ زمانہ اس صدمہ کو بھلا دے گا۔ مجھ سے معافی چاہ کر اس خلا کو پر کردو گے جو مراسم محبت میں پیدا ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ میں کمی پیدا کر دے یہ بھی ممکن ہے کہ تم مجھ سے طلب عفو کرو۔ لیکن محمود یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو۔ ؎۴

اب اس طرح ہے:-

غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو ناممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ کو کم کر دے۔ لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑجانیوالے بال کو دور کرسکو ؎۵

؎۱ ترقی پسند ادب ص ۱۶۱ ؎۲ شہاب کی سرگزشت (پرانا ایڈیشن) ؎۳ شہاب کی سرگزشت (نیا ایڈیشن) ص ۱۲ ؎۴ شہاب کی سرگزشت پرانا ایڈیشن ص ۸۴-۸۵ ؎۵ جدید ایڈیشن ص ۷۹

دنیا میں ایک خود غرض شخص سب سے پہلے جن لوگوں کو اپنے حملہ کا مستحق سمجھتا ہے
وہ اس کے احباب ہوتے ہیں۔ [1]

اب یہ فقرہ اس طرح ہے :۔

دنیا میں ایک شخص سب سے پہلے اپنے حملہ کا مستحق احباب ہی کو سمجھتا ہے۔ [2]

الہتہ القمر اپنی تمام بیجابیوں اور بیباکیوں کیساتھ نہ رکنے والی جوانی کیطرح اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زریں چھلکاتی ہوئی آ رہی تھی۔ [3]

اس کو اس طرح بدل دیتے ہیں :۔

ادھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زریں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی۔ [4]

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شروع کی تحریروں سے اب کی تحریریں کچھ مختلف ضرور ہیں۔ فقروں کی ساخت اور ان میں مشکل الفاظ کی کمی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عنفوانِ شباب کے جوش اور ادھیڑ عمر کے سکون سے عبارت میں کتنا فرق آجاتا ہے۔ شہاب کی سرگزشت کے نئے اڈیشن میں بعض جگہ فقرے کے فقرے جواب شاید ان کو غیر شائستہ نظر آتے ہیں انھوں نے کاٹ دیئے ہیں۔

نیاز کی عبارت میں خامیاں بھی ہیں وہ بعض اوقات عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں جس سے ایک تو عبارت میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے دوسرے عبارت عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ کا استعمال غیر شعوری طور پر کر جاتے ہوں۔ کیونکہ عربی فارسی کا مطالعہ انھوں نے کافی کیا ہے مگر اردو کی سلاست میں اس سے ضرور فرق آجاتا ہے۔

---

[1] شہاب کی سرگزشت پرانا ایڈیشن صفحہ ۹۴ [2] شہاب کی سرگزشت نیا ایڈیشن صفحہ ۴۵
[3] شہاب کی سرگزشت نیا ایڈیشن صفحہ ۱۱۷ [4] مثلاً جدید ایڈیشن

دنیائے شاعری مشکل سے ایسے "ایجاز سدید" "بیان جزیل اور عبارت انیق" کی پاکیزہ مثال پیش کر سکتی ہے۔ مومن اسلوب ادا اور قدرتِ بیان کا بادشاہ ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس قسم کی عبارتیں انکی ہر کتاب میں ملجاتی ہیں مثال کے طور "ایک شاعر کا انجام" کے چند فقرے نقل کرتے ہیں۔

میرے کوائف سے استبعاد حقیقی ہے۔ آج کم وبیش ۳۰ دن ہوئے جب مجھ سے اس نامساعد مناکحت کی تقریب میں قبول کیا اس کی آنکھیں یوں تو اور بھی مترحم اور عاشقانہ کیف کا محل نظر آئیں۔ میرے لئے وجہ نکوہش ہے اسکی نگاہوں کی عادت مستمرہ ہوگی

اسی طرح نگارستان میں بھی ہمیں اس قسم کے فقرے ملجاتے ہیں۔ اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے استرحام پیدا کر سکتے۔ "رسم مناکحت" قاطبۃً مسدود، عقد انامل پر اسم الٰہی درود شروع کر دیا۔

نگارستان کے پرانے ایڈیشن سے چند فقرے ملاحظہ ہوں:۔

اس کے پاس ایک ساختہ سحر گھوڑا تھا۔ "عبارت مستمرہ اور سلاست متعالی عود کر آئی" اور پھر طیران" بجائے اڑان کے استعمال کیا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات نیاز خود بھی اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ انکے بعض الفاظ قاری کیلئے آسان نہیں اسلئے وہ کئی دفعہ قوسین میں معنی بھی لکھ دیتے ہیں جیسے طیور حمیل کی حوصلات (سپوٹوں) کو زمرد گیاہ کے دانوں پر بھرنے سے مامور تھے۔

مجموعی اعتبار سے نیاز کا طرز نگارش اور اسلوب بیان ایک جداگانہ شان کا مالک ہے جس طرح ان کی شخصیت دوسرے مصنفین کی شخصیتوں سے مختلف ہے اسی طرح ان کا اسلوب بیان دوسروں کے اسالیب سے جدا ہے۔ ہم ان کی تحریروں کو کسی اور مصنف کی تحریروں کے مماثل نہیں قرار دے سکتے وہ مذہبی معاملات میں سرسیّد کی طرح سوچتے ہیں لیکن مذہبی مضامین پر قلم اٹھاتے وقت سرسیّد کی سی سادگی اور استدلال کا کرارا پن برقرار نہیں رکھ سکتے۔ کبھی کبھی ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کی سی متانت اور سنجیدگی قائم نہیں رکھ سکتے۔ حالی کی سادگی

سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نہ محمد حسین آزاد کی طرح ان کی عبارت میں تصویریت اور شدتِ احساس کا غلبہ ہے۔ مرزا غالب کی نثر سے بھی ان کی نثر کو کوئی مناسبت قریبہ نہیں۔ کیونکہ غالب کی شوخی اور بے تکلفی میں بھی ایک وضعداری موجود ہے۔ اگرچہ نیاز نے اپنے خطوط میں شوخی اور بے تکلفی سے پوری طرح کام لیا ہے لیکن اس وضعداری اور برگزیدگی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ تاہم اپنی جگہ نیاز کی نثر کسی بھی دوسرے مصنف کی نثر سے کم رتبہ نہیں کہی جا سکتی اور نہ ان کو کسی کا مقلد قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسلوب نگارش ایک ذاتی جوہر ہے۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی ذہنی ساخت کا اثر اس کی عبارت پر پڑتا ہے۔ الفاظ کی دروبست اور ان کا محل استعمال، شخصی تخیل، زبان پر قدرت اور لطیف جمالیاتی احساس یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کے اتباع سے حاصل نہیں ہوتیں انشاپردازی کے اصول جان لینے سے کبھی کبھی بڑا انشاپرداز پیدا نہیں ہوتا۔

نیاز کا طرز نگارش بڑا دلکش و دلفریب ہے عبارت میں ایک حرکت ہے اور زندگی پیوست خشکی اور بے رونقی کا احساس کہیں نہیں ہوتا، نئی نئی ترکیبیں، نیا نیا اسلوب بیان اور بدیع مطالب کے سبب جگہ جگہ گلہائے رنگا رنگ کی نمود نظر آتی ہے۔

ان کی تحریروں میں نشیب و فراز ہیں۔ مذہبی مضامین میں ایک کڑا پن بھی اور طعن و تشنیع کی دل آویزی بھی۔ مالہ و ماعلیہ میں بیباکی بھی ہے اور سخت گیری بھی، خطوط میں شیرینی بھی ہے اور شوخی بھی۔ غرض مکمل یکسانی و یکرنگی نہیں ہے لیکن اس اختلاف لب و لہجہ کی حیثیت وہی ہے جو مختلف رنگ پھولوں کی غالب نے بنا دیئے ہیں۔

ہے رنگِ لالہ و گل نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

یہ ساری چیزیں مل کر نیاز کے اسلوب کی تعمیر کرتی ہیں اور یہی رنگارنگی انکے انداز کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔

نیازؔ فتح پوری

یو۔پی کے ایک نوجوان ہندو شاعر

"فراق" گورکھپوری

ایک زمانہ تھا کہ میری زندگی کی تنہائیوں کا دلچسپ ترین مشغلہ صرف شعر پڑھنا تھا، اس کے بعد شعر کہنے کا دور آیا اور کافی عرصہ تک مجھ پر مسلط رہا۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں کوئی زمانہ اس احساس سے خالی نہ گزرا کہ اگر شاعری ہماری حیات دنیوی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری نہیں تو کم از کم اسے ایک نوع کی وجدانی تسکین کا ذریعہ یقیناً ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ بات بھی اسے حاصل نہ ہو تو پھر "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ"۔

یہ تھا وہ احساس جو شاعری ترک کرا کے آہستہ آہستہ مجھے "انتقادِ شاعری" کی طرف لے گیا اور اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ آج اکثر حضرات خیال کرتے ہیں کہ شاید میں اپنے سوا کسی کو شاعر سمجھتا ہی نہیں، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ میں سوائے اپنے ساری دنیا کو شاعر سمجھنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ میں دنیا کی شاعری میں وہ چیز نہ پاؤں جس نے مجھ سے میری شاعری ترک کرائی۔

میں شاعری میں کیا چاہتا ہوں؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے اور اگر اسے شاعری نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں اس میں "وہ کچھ چاہتا ہوں جسے بتا نہیں سکتا"۔

شاعری "دل کا معاملہ" ہے اور دنیا میں اتنے مختلف "دل" اور ان کے مختلف جذبات ہیں کہ ان کے متعلق کوئی نظریہ "مسلمات" کی حیثیت سے پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن اس سے شاید کسی کو انکار نہیں کہ شاعری صرف تاثرات

کی زبان ہے اور اس کے بعد پھر یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے چہ جائیکہ "اخلاقیات" و "مذہبیات"، وغیرہ کی بحث چھیڑنا کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارہ نہ کرے اگر وہ شعر کہنے پر آجائے۔

بعض کا خیال ہے کہ شاعری اور آرٹ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ میں یہاں آرٹ اور اس کی ہمہ گیری کے متعلق اظہار خیال کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ آرٹ تو خیر بہت لطیف چیز ہے شاعری "مادیات" سے جدا ہوکر بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسان کی لطیف ترین "زائیدہ ہائے خیال" وہ ہیں جو اس نے فلسفۂ حیات و فلسفۂ مذہب کے متعلق پیش کئے ہیں علی الخصوص ہندو مذہب اور ہندو فلسفۂ حیات، لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا میں "بت پرستی" رواج پاکر رہی اور خدا کا تصوّر بغیر "عرش و کرسی"، کے ذکر کے ممکن نہ ہوا۔ شاید یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس کو غالب نے یوں ظاہر کیا۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

سو دیکھنے کی چیز یہی ہے کہ "دشنہ و خنجر"، کے الفاظ سے واقعی "ناز و غمزہ" کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یا نہیں اور اسی کا نام شاعری ہے جیسے اگر "آرٹ" سے علیحدہ کردیا جائے تو اس کے "تصوّف" ہوجانے میں تو شک ہی نہیں اگر بدقسمتی سے وہ "مجذوب کی بڑ" کا مرتبہ نہ پا سکی۔

الغرض شاعری کی اصل روح چاہے کچھ ہو لیکن اس روح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں وہ میری رائے میں صرف الفاظ کا "رکھ رکھاؤ" ہے۔ یہاں اس منطقی بحث کی ضرورت نہیں کہ جس چیز کا نام "رکھ رکھاؤ"، ہے وہ خود الفاظ سے علیحدہ ایک چیز ہے اور اسی لئے جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے اُنکے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا اور وہ ذہنِ سامع تک ان کو پہنچانے میں

کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ بیان خواہ حسن وعشق کا ہو یا "نہر کی پن چکی" کا اس سے غرض نہیں، دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا ہے یا نہیں اور پھر چونکہ میں اسی دنیا کا آدمی ہوں جہاں الفاظ کا "شرمندۂ معنی" ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس دنیا کے علاوہ میں کسی اور ایسی دنیا کا قائل نہیں ہوں جہاں "معنی" "شرمندہ الفاظ" نہیں ہوتے، اس لئے میں یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم شاعری اسی پُرمعصیت دنیا کی کیجائے کیونکہ "معصومیت" کا تصور محض لڑکپن ہے اور شعر "نام" ہے "جوانی" کا۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک دوست ہیں جو کسی وقت شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے لیکن اب تصوف کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور مجھ سے بہت خفا رہتے ہیں، کیونکہ میرے نزدیک شاعری کو تصوف سے متعلق کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی خوبصورت عورت سے شادی کرلی جائے کہ اس کے بعد "حسن وعشق" دونوں کا "صفایا" ہے۔ نہ عورت عورت رہ جاتی ہے نہ مرد مرد۔

ایک دن فرمانے لگے کہ تم نہیں سمجھ سکتے تصوف اور اس کی شاعری کتنی بلند چیز ہے، اس کی ابتدائی منزل "ترک دنیا" ہے اور "ترک عقبیٰ" "و ترک مولیٰ" سے گزر کر "ترک ترک" کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تمہاری شاعری تو "ترک دنیا" سے بھی نیچی ہے اور تصوف کی شاعری کی ابتدا "ترک ترک" سے ہوتی ہے جہاں "خیالِ ترک" بھی ترک ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ "دل بے مدعا" جس پر شاعر نے ہمیشہ سر دھنا لیکن پایا نہیں اور صوفی شاعر نے اسے پہلے ہی قدم پر پالیا۔"

میں نے کہا میرے نزدیک شاعری کی ایک منزل اور اس سے بھی بلند ہے۔ پوچھا "وہ کیا"؟ میں نے کہا کہ نام تو اس کا مجھے معلوم نہیں لیکن نمونے ایک دو ضرور پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً۔

لوٹی دریا کی کلائی زُلف الجھی بام میں

فرمانے لگے "یہ تو بالکل مہمل ہے" میں نے کہا آپ کا "ترکِ ترک" اسی سے

زیادہ مہمل ہے۔ اس رنگ کے شاعر کو ہم زیادہ سے زیادہ مسخرا کہہ سکتے ہیں، لیکن آپ کی اس "ترکیبات" والی شاعری کو تو سوائے حماقت کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے رہ گیا دل بے مدعا سو حضرت وہ آپ ہی کو مبارک رہے، مجھے تو ایسا دل دیجئے۔ جس میں سوائے مدعا کے کچھ نہ ہو اور اسی کے ساتھ معشوق پری تمثال کو سامنے بٹھا کر چلے جائیے، پھر دیکھئے کہ "وصلِ وصل" کا رنگ زیادہ چوکھا رہتا ہے یا "ترکِ ترک" کا۔ اس میں شک نہیں کہ "ذہنِ رسا" فطرت کی بڑی پاکیزہ ودلیعت ہے، جو انسان کو عطا ہوئی ہے لیکن اگر اس میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو پھر انسان انسان تو رہتا نہیں، یہ اور بات کہ ہے کہ وہ صوفی ہو جائے یا اس سے بڑھ کر خدا بن بیٹھے۔

ایک صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا کہ باوصف تصوف سے اس قدر بیگانہ ہونے کے میں بیدل کی شاعری کا کیوں دلدادہ ہوں، جو کثیر تصوف ہے، میں خاموش رہا کیونکہ ان کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ بیدل کی شاعری تو ایک خاص قسم کی شاعری ہے اور اسی لئے جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے الفاظ وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ یا تو وہ خود ہمیں اس فضا میں لے جاتے ہیں جہاں کے وہ الفاظ ہیں یا پھر خود اس فضا میں آکر ہمارے ذہن کو متاثر کرتے ہیں جہاں کی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں مجاز کو بے دھڑک حقیقت" کہہ دینا اتنا مرغوب نہیں، جتنا حقیقت کو بھی مجاز کے رنگ میں ظاہر کرنا۔

سو یہ بالکل غلط ہے کہ میں تصوف کے رنگ سے متنفر ہوں، یہ ضرور ہے کہ شاعری کا خون تصوف کے ہاتھ سے مجھے پسند نہیں۔ اور ہر اہر شاعر سے، خواہ وہ کسی رنگ کا ہو، صرف یہ مطالبہ ہے کہ وہ جو خیال چاہے ظاہر کرے لیکن یہ دیکھ لے کہ الفاظ سے وہ پوری طرح ادا بھی ہوتا ہے یا نہیں، اس کے بعد مرتبہ اسلوب بیان کا ہے جس کی بلندی ونزاکت کے لحاظ سے شعران خصوصیات کی حدود میں آتا ہے جو ہم کو اس بات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ یہ شعر میر کا ہے یا سودا کا، مومن کا ہے یا غالب کا، اور جن سے ہم شعر کے خوب اور خوب تر ہونے پر حکم لگاتے ہیں۔

دور حاضر اس میں شک نہیں کہ ترقیِ سخن کا دور ہے اور مغربی تعلیم نے ذہنیت انسانی کو اتنا وسیع و بلند کر دیا ہے کہ ہم کو ہر جگہ اچھے اچھے سخن گو نظر آ رہے ہیں۔ لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے شاندار مستقبل کا پتہ ان کے حال سے چلتا ہے تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ اتنی مختصر کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بلا تامل ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر دوں تو میری زبان سے فوراً فراقؔ گورکھپوری کا نام نکل جائے گا۔

فراقؔ جن کا نام رگھوپتی سہائے ہے گورکھپور کے رہنے والے ہیں اور ہر چند اردو شاعری کا ذوق انھیں ورا ثتاً ملا ہے لیکن ان کا مخصوص "رنگِ سخن" خود انھیں کی ذاتی چیز ہے جس کے ابتدائی نشو و نما یا تدریجی ارتقاء پر میں کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ کیونکہ میں ان کے ابتدائی حالات سے بالکل ناواقف ہوں۔

میں نے اوّل اوّل ان کو یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جب کہ وہ گریجویٹ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد کانپور کے سناتن دھرم کالج سے تعلق پیدا کر لیا اور وہیں سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کی سند حاصل کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی چلے گئے۔ جہاں اب بھی وہ انگریزی زبان کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

لکھنؤ کی متعدد ملاقاتوں میں، میں نے یہ اندازہ تو کر لیا تھا کہ یہ شخص غیر معمولی ذہین ہے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس کا ایک قدم نہایت مضبوط پتھر پر قائم ہے اور دوسرا ایسی متزلزل چٹان پر کہ ذرا سا اشارہ گرا دینے کے لئے کافی ہے، لیکن چونکہ یہ خوش قسمتی سے ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس مہلک لغزش سے بچ گئے اور اب انھیں نہایت استحکام کے ساتھ بلند چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

لکھنؤ میں جب کبھی مجھے ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا، میں نے ان کے ذوق کی پاکیزگی کو بیّن طور پر محسوس کیا۔ لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی کہ وہ مستقبل میں اس کی فن کی حیثیت سے اختیار کریں گے

جہاں تک مجھے معلوم ہے فراق کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہے اور ایسا شخص جو ہر رنگ میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقتاً کسی کا شاگرد ہو بھی نہیں سکتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ، اگر ہم اس وقت یہ معلوم کرنا چاہیں کہ فراق کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

ان کا میلان وہی ہے جو مصحفی کا تھا کہ جس رنگ کو لیا اپنا بنا لیا اور ذہین و بے قرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر و بیشتر اسی نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے علی الخصوص اس وقت جب فطرت کے ساتھ ساتھ ان کا اکتساب بھی کام کرنے لگتا ہے۔ تاہم بہ لحاظ انداز بیان اگر ان کو "مومن اسکول" میں شامل کیا جائے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔

میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہئے کم ہے۔ پھر چونکہ فراق کے کلام میں ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے "قدر اوّل" کا مرتبہ نہ دیا جائے۔

یہ بالکل درست ہے کہ فراق کے کلام میں اسقام بھی پائے جاتے ہیں، یعنی نہ وہ فنی غلطیوں سے یکسر پاک ہے اور نہ بیان کی ژولید گیوں سے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاعرانہ روح ان کے ہر ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ مخصوص والہانہ انداز، جو غزل کی جان ہے کسی جگہ ہاتھ سے چھٹنے نہیں پاتا۔ فراق اب شاید مشاعروں کی طرحوں پر بھی غزلیں لکھتے ہیں اور "فرمائشی شعر گوئی" کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ مشق سخن کے لئے یہ طریق کار مفید ہو، لیکن شاید "پاکیزگی سخن" کا اقتضاء کچھ اور ہے چنانچہ جس وقت ہم فراق کی طرحی و غیر طرحی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں بیّن فرق محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مغنّی کی وہ حیثیت جب وہ تنہائی میں بیٹھ کر صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے گنگناتا ہے، اس حیثیت سے بہت مختلف ہوتی ہے جب اس کا مقصود

صرف دوسروں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ظاہر کیا کہ فراقؔ کی شاعری میں مومنؔ کا رنگ غالب ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں فراقؔ کا کلام پیش کر کے اس کی وضاحت کروں خصوصیاتِ مومنؔ کا مختصراً ظاہر کر دینا ضروری ہے۔

مومنؔ کی تنہا وہ خصوصیت جس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں اس کے اندازِ بیان کی بلاغت ہے۔ جس طرح ایک مصور کے حسنِ ذوق کا پتہ چلانے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے کس زاویہ سے تصویر لی ہے، اسی طرح ایک شاعر کے حسنِ بیان پر حکم لگانے کے لئے ہم کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس خیال کا "خطِ رفتار" کیا ہے؟ اور اس نے اپنا تیر کس گوشہ سے چلایا ہے۔ اور اسی کی جدت و ندرت پر کلام کی خوبی کا انحصار ہے، جو مومنؔ کا حصّہ کہلاتی ہے۔ اندازِ بیان کی ندرت غالبؔ کے یہاں بھی ہے اور کبھی کبھی یہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مل جاتے ہیں کہ امتیاز دشوار ہو جاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مومنؔ جو کچھ کہتا ہے وہ بہت ڈوب کر کہتا ہے اور غالبؔ کی حیثیت صرف "گاہ گاہ غوطہ زنی" کی حد سے آگے نہیں بڑھتی دوسری خصوصیت مومنؔ کی اس کی فارسی ترکیبوں کی حلاوت ہے اور تیسری یہ کہ اس کی شاعری اسی دنیا کی ہے، اسی دنیا کے انسانوں کی ہے اور اسی "عالمِ آب و گل" کے احساسات و جذبات سے تعلق رکھتی ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ فراقؔ کی شاعری میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں یعنی اندازِ بیان میں بھی ندرت ہے اور فارسی ترکیبیں بھی وہ بہت شگفتہ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ "کارِ زمین" سے ہٹ کر وہ "آسمان پردازی" میں مبتلا نہیں ہوتے، ایک شعر ملاحظہ ہو:

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

مضمون نیا نہیں لیکن سلاستِ الفاظ اور سادگیِ بیان کے ساتھ محبت کی

اس خاص کیفیت کو جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن ادا نہیں کر سکتا، ایسے سہل ممتنع انداز میں ظاہر کر دینا یہ ہے۔ اس شعر کی جان جس سے سننے والا فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔

اسی زمین کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

دوسرے مصرعہ کے بیساختہ پن اور ردیف و قافیہ کے خوبصورت صرف نے شعر کے مفہوم کو حد درجہ دلنشین بنا دیا ہے۔ محبوب کے یاد آنے اور نہ آنے کے متعلق حسرت موہانی کا مشہور شعر ہے:۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اس پر ترقی بہت دشوار تھی، لیکن فراق نے زاویۂ بیان بدل کر اس میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی۔

اسی غزل کا ایک شعر خالص مومن کے رنگ کا دیکھئے:۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تجھے رنجش بے جا بھی نہیں

مہربانی اور محبت کے نازک فرق کو "رنجش بیجا" کے ذکر کے بعد اس انداز سے بیان کر جانا شاعری کا کمال ہے اور فراق کا صرف یہ ایک شعر ان کے پاکیزگیٔ شوق کی اتنی زبردست شہادت ہے کہ اس کے بعد کسی اور استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ فطرت انسانی اور اس کے مختلف مظاہر کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔ تعبیرات میں دل کشی پیدا کرنے کے لئے فراق کی کامیابیاں اس باب میں ملاحظہ ہوں۔

نہ سمجھنے کی ہیں باتیں نہ یہ سمجھانے کی
زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

بیانِ زندگی کے سلسلہ میں دیوانے کی اچٹی ہوئی نیند کی طرف ذہن کا منتقل ہونا اور پھر اس کی توضیح کرتے ہوئے یہ کہہ جانا کہ "نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی" انتہائے بلاغت ہے. چند اور تعبیرات ملاحظہ ہوں :-

قید کیا رہائی کیا . ہے ہمیں میں ہر عالم
چل پڑے تو صحرا ہے رک گئے تو زنداں ہے

اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا - موجِ فنا میں اک اثرِ ناتمام ہو

اس بحرِ محبت میں اے دل ڈوبنے والے بچتے ہیں
پانی کو گزرنے دے سر سے پھر دیکھ کیسے بیڑا پار بھی ہے

اپنے چل پڑنے کو صحرا اور ٹھہر جانے کو زنداں قرار دینا - اسی طرح فنا کو "اضطرابِ ناتمام" سے تعبیر کرنا اور سر سے پانی گزر جانے کو بیڑا پار ہو جانا، کہنا معمولی متخیلہ کا کام نہیں - ایک اور لطیف شعر اسی رنگ کا دیکھئے

خواب گاہ میں تری ہم ہیں نیند کے جھونکے
اک سکونِ بے پایاں، ہستیٔ پریشاں ہے

فراقؔ کی ایک بالکل نئی تخئیل ملاحظہ ہو :-

کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

محبوب کے دم بھر کے آجانے کی یہ تعبیر کہ شاید تنہائی نے بھیس بدلا ہے، ہندی شاعری کی چیز ہے اور اردو شاعری میں میری نگاہ سے کہیں نہیں گزری خالص واردات محبت اور کیفیات حسن و عشق کے بعد بھی چند اشعار سن لیجئے :-

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست - وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

نثار پرسش غم کے میں کیا کہوں آخر ۔ کہ تجھ سے اب وہ مری سرگرانیاں نہ رہیں
تو نہ چاہے تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں ۔ تو جو چاہے تو غم ہجر بھی آساں ہو جائے

پردۂ یاس میں امید نے کروٹ بدلی ۔ شب غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی

پہلا شعر میر کے رنگ کا ہے اور ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو عشق بلند کام کے سوز و گداز میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرے شعر میں صرف "پرسش غم" کو سرگرانیوں کے دور ہو جانیکا باعث قرار دینا ان تاثرات سے متعلق ہے جو "کاروبار محبت" میں غریب عاشق کو پیش آتے رہتے ہیں۔

تیسرے شعر میں فلسفۂ ہجر و وصال پر بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور چوتھا شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ غم کے بقا کا تعلق یقیناً امید سے ہے نہ کہ یاس سے کیونکہ یاس کی انتہا سکون ہے اور غم کے منافی۔ انداز بیان نے اس خیال کو بہت زیادہ لطیف صورت دے کر پیش کیا ہے۔

محبت کی بے قراری بڑی لطیف چیز ہوتی ہے اور عاشق ہمیشہ اس کے قیام کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ کبھی کبھی گھبرا کر وہ ضبط و غم کی متاع کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیتا ہے جس کا رد عمل اور زیادہ تباہ کن ہوتا ہے اس خیال کو فراق نے جس خوبصورتی سے ادا کیا ہے وہ شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں

فریب صبر کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے
نہ آیا بے قراری کو حیات جاوداں ہونا

اسی غزل میں ایک نہایت نازک تخیل ملاحظہ کیجئے:۔

ہر آواز جرس پر اک صدائے بازگشت آئی
بہت ہے اسقدر بھی، خیر، یاد رفتگاں ہونا

آواز جرس کی صدائے بازگشت کو "یاد رفتگاں" کہنا بڑا اسمادی (ETHERIAL)

تخیّل ہے۔ ایک اور شعر اسی زمین کا یہ ہے :۔

ابھی اک پرتوِ حسنِ خیالِ یار باقی ہے
ابھی آیا نہیں فرقت کو دردِ رائیگاں ہونا

پہلا مصرعہ فراقؔ کا نہیں بلکہ یہ ادنیٰ تغیر غالبؔ کا ہے، لیکن فراقؔ نے دوسرا مصرعہ لگا کر اسے بالکل اپنا لیا ہے اور غالبؔ سے زیادہ حسن کے ساتھ فرقت کو صرف اس لئے دردِ رائیگاں نہ کہہ سکنا کہ پرتوِ حسن خیالِ یار ہنوز باقی ہے، نہایت لطیف بات ہے۔

شعراء نے "حسن مجرد" کے خیال کو مختلف پیرایوں سے ظاہر کیا ہے لیکن فراقؔ کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو :۔

بہارِ چند روزہ کو بہارِ جاوداں کر دے
قیودِ رنگ و بو سے کچھ الگ کر دے گلستاں کو

تکرارِ الفاظ سے معنی میں حسن پیدا کرنا بہت کافی مشق چاہتا ہے، فراقؔ کے کلام میں بعض نمونے اس رنگ کے نہایت پاکیزہ پائے جاتے ہیں۔

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

بے خبری ظاہر کرنے کی یہ تعبیر کرنا کہ گویا "اہلِ کارواں" کارواں میں شامل نہ تھے، بڑا لطیف اندازِ بیان ہے۔ اسی غزل کا مطلع ہے۔

پھر بھی سکونِ عشق پر آنکھ بھر آئی یار ہا
کچھ غمِ عشق بھی فراقؔ کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

دوسرے مصرعہ میں فراقؔ کا (ق) تقطیع سے گرتا ہے۔ لیکن شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ فراقؔ نے بعض غزلیں ایسی لکھی ہیں جو شروع سے آخیر تک مرصع ہیں۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو :۔

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا۔ وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا

کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلتِ ہوش | ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا
کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دور ہو جانا | یہ بات الگ ہے کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا
نہ پوچھ سود و زیاں کاروبارِ الفت کے | دگرنہ یوں تو نہ کھوتا تھا کچھ نہ پاتا تھا
لگاوٹیں وہ ترے حسنِ بے نیاز کی آہ | میں تیری بزم سے جب ناامید اٹھا تھا
ہر ایک سانس ہے تجدید "یاد ایامے" | گزر گیا وہ زمانہ جسے... گزرنا تھا
کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے | زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی امید | مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

غالباً یہ ظاہر کرنیکی ضرورت نہیں کہ رنجوری محبت کے بیان میں جس کیفیت و سادگی جس سلاست و حلاوت کی ضرورت ہے وہ پوری تکمیل کیساتھ ان شعروں میں پائی جاتی ہے

اب اور چند متفرق اشعار سن لیجئے :-

اب ماورائے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز | وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے
گزرے گا ہو کے شہرِ خموشاں سے آج کون | سو مرتبہ چراغِ لحد جھلملا چکے

دل چاہتا ہے وعدۂ جاناں کو استوار | اے وائے عشق میں بھی اگر انتظار ہو

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں | بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

کھلے رازِ دل تو یہ دیکھنا کہ دہن سے شعلے بھڑک اٹھے
نہ یہ پوچھ پھوٹ کے ہونگے کیا جو فراق چھالے زباں سکے ہیں

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے | ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا سے پہلے

اے فراق انھیں پا کے ہم یہ دلمیں کہتے ہیں | سوچیئے تو مشکل ہے دیکھیئے تو آساں ہے
جلوۂ حسن نثارِ غمِ پنہاں کر دے | عشق توفیق جو دے وصل کو ہجراں کر دے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا — یہ فرقِ مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے
یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب — تم دل دکھاؤ وقت مصیبت تو بات ہے

ہاں بتا دے مجھے اے رالطۂ ترکِ طلب — جس سے آجائے مجھے تیری تمنا کرنا

یہ ایسے اشعار ہیں کہ اگر کسی خوش ذوق السان کے سامنے پڑھ دئے جائیں اور اسکو یہ نہ بتایا جائے کہ انکا کہنے والا کون ہے تو وہ انہیں دہلی کے دورِ متاخر کے کسی شاعر کا کلام سمجھے گا، جبکہ غزل گوئی صرف جذبات و تاثرات کے اظہار کا نام تھی ہر چند موجودہ دور بھی بڑی حد تک اسی اصول کا پابند ہے لیکن انداز بیان اسکا کچھ اور ہے پہلے معنی آفرینی کیطرف اتنی زیادہ توجہ نہ کیجاتی تھی اور اسکا سبب صرف یہ تھا کہ "احساسات محبت" صنعت سے بیگانہ تھے۔ اب لوگوں میں "احساسِ محبت" کے بجائے احساس وقوف" زیادہ ہے اس لئے اس کی باریکیاں تو کامیابی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں لیکن "کیفیت" پیدا کرنے میں اس قدر کامیاب نہیں ہوتے۔

فراق کی شاعری میں "احساس" و "وقوف"، دونوں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اس لئے ان کے یہاں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ کیفیت و حلاوت کی بھی کمی نہیں اور وہ فنادگی و والہانہ ادا بھی ہر جگہ موجود ہے جو محبت کا لازمی نتیجہ اور غزل کی جان ہے۔

فراق نے اپنے ایک خط میں خود اپنی غزل گوئی کے متعلق عجیب و غریب گفتگو کی ہے وہ لکھتے ہیں

"جس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں اسی طرح غزل سے ہوتا کیا ہے، مگر مجبوریاں اور مایوسیاں جھک مارنے پر آمادہ کر ہی دیتی ہیں۔"

سو آپ فراق کا سارا کلام پڑھ جائیے یہ محبت کی "مجبوری و مایوسی" بقدر مشترک ان کے ہر ہر شعر میں نظر آئے گی اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی غزل گوئی کو دوسرے نوجوان شعراء کے تغزل سے متمائز کیا ہے۔

فراق کے کلام میں جا بجا ندرت بیان اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ کچھ اجنبی ہوئی سی چیز نظر آتی ہے اسکا سبب مغربی لٹریچر کی وسعت مطالعہ ہے جس سے فراق کا

متخیلہ متاثر ہو کر بغیر کسی قصد و ارادہ کے بعض بعض جگہ انداز بیان کی بالکل نئی راہیں اختیار کر لیتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اجنبیت کسی جگہ پیدا ہونے نہیں پاتی اور سوائے اس کے کہ ذہن انسانی مطالعۂ عمیق کی طرف مجبور رہے۔ کوئی ناگوار الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

الغرض فراق کی غزل گوئی کا مستقبل مجھے بہت درخشاں نظر آتا ہے اور اگر انھوں نے اپنے اس فطری ذوق کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی توجہ فن کیطرف بھی صرف کر دی تو اس دور کے باکمال شعراء کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کر لینا بالکل یقینی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ان کی ایک بالکل تازہ غزل موصول ہوئی جسے میں نے اپنے انتقاد پر مہر توثیق کی صورت سے یہاں درج کئے دیتا ہوں۔

نیرنگِ حسن یار ترے بس میں کیا نہیں — لطف و کرم تو مانع جور و جفا نہیں
جنکی صدائے درد سے نیندیں حرام تھیں — نالے اب ان کے منہ میں تو نے سنا نہیں
کس درجہ پردہ دار طلسمِ نگاہ ہے — اس بزم میں کسی کو کسی کا پتہ نہیں
میرے سکوتِ یاس پہ اتنا نہ ہو ملول — مجھ کو خدانخواستہ تجھ سے گلا نہیں
نیرنگیٔ امید کرم ان سے پوچھئے — جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں
تھا حاصل پیام ترا اے نگاہِ یار — وہ رازِ عاشقی جسے تو نے کہا نہیں
اللہ رے دردِ عشق کی غیرت کو کیا ہوا — اتنا بھی بے نیاز وہ جانِ وفا نہیں
میں شاد کام دید بھی محروم دید بھی — ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں
ہر گردشِ نگاہ ہے دورِ حیاتِ نو — دنیا کو جو بدل نہ دے وہ میکدہ نہیں
اس رہگذار پر ہے رواں کاروانِ عشق — کوسوں جہاں کسی کو خود اپنا پتہ نہیں

بس اک پیام نرگسِ مستانہ ہے فراق
مجھ کو دماغ کاوشِ لطف و جفا نہیں

نیاز فتحپوری (مرحوم)

درسِ محبّت

معبد زہرہ کی کنواریاں سب کی سب پاکباز رہی ہوں یا عصمت فروش۔ اس سے بحث نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دردانہ زہرہ کی پرستش اس کو عصمت کی دیوی ہی سمجھ کر کرتی تھی اور جس وقت وہ معبد سے تجدید تقدس کے بعد باہر نکلتی تو لوگ ایسا محسوس کرتے کہ شاید دنیا میں تخلیق کی ابتدا ابھی ہوئی ہے اور قلبِ انسانی ان ضروریات سے ہنوز ناآشنا ہے جو خون میں ناجائز گرمیات پیدا کر کے رُوح کو آہستہ آہستہ داغدار کرتے رہتے ہیں۔

یونان کے مذہبی دورِ حسن پرستی کا یہ وہ زمانہ انحطاط تھا جب یونان کا ایک ایک نوجوان قلب الگ الگ ایک مخصوص زہرہ کا معبد بنا ہوا تھا اور مذہب ان کے ہاں نام تھا محض اس زندگی کا، جس کی ترکیب صرف عورت، شباب، حسن اور عشق کے عناصرِ اربعہ سے ہوئی تھی۔

خانقاہِ زہرہ کا ایک ایک حجرہ، باغ معبد کا ایک ایک کنج جہاں کسی وقت حسنِ فطرت کی پرستش ہوا کرتی تھی جو کسی زمانے میں مخصوص تھا صرف جمیل مناظرِ قدرت کے مطالعہ کے لئے اب ایک خلوۃ کدہ تھا، جہاں عصمت "آغشتہ بہ خوں" اور محبت "مائل بہ جنوں" نظر آتی تھی۔

ملک کا کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جس نے اپنی عمر کے سیکڑوں دن اس سعی میں بسر نہ کر دیئے ہوں کہ اس فضا کی کم از کم ایک ہی معطر رات اسے میسر آجائے اور مشکل سے کوئی آشفتہ شباب ایسا ملے گا جس نے ایک مرتبہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد دُنیا میں پھر کسی اور لذت کی خواہش کی ہو۔

دردانہ ایک امیر خاندان کی لڑکی تھی جس کو اس کے والدین نے ایک خواب کی ہدایت کے مطابق خانقاہِ زہرہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور جس کی کمسنی یہیں کی سم آلود فضا میں

ریعانِ شباب تک پہنچی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یوں تو خانقاہ کی ہر کنواری اپنی اپنی جگہ ایک بے پناہ مجسمۂ حسن و شباب تھی لیکن دردانہ! اس کا تو یہ عالم تھا جیسے فطرت کے کسی حسین خواب نے انسانی صورت اختیار کرلی ہو۔

لوگ کہتے تھے کہ دردانہ سے زیادہ حسین ہونا گویا خدا ہو جانا ہے اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جس نے ابھی تک کسی کے دل میں اس کے پاس "التجائے غیر معصوم" لے جانے کی ہمت پیدا نہ ہونے دی تھی۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر جب سے اس نے نمودِ شباب کے بعد حسبِ دستور نقاب پوش ہو کر نکلنا شروع کیا تھا۔ لوگوں کی تمناؤں میں کس قدر تلاطم برپا کر دیا تھا۔ اور ان کا تخیل اس کے نقاب پوش حسن کو کس کس انداز سے عریاں دیکھا کرتا تھا۔

یوں تو ملک کا ہر وہ شخص جس کی رگوں میں خون دوڑ رہا تھا، دردانہ کے لئے یکسر اضطرابِ شوق بنا ہوا تھا لیکن سب سے زیادہ نمایاں اور اپنے آپ کو مستحقِ کامیابی سمجھنے والی ہستی شہزادہ نیرَولی کی تھی۔ جو نہ صرف اپنے حسن و صورت بلکہ اکتسابات ذہنی کے لحاظ سے بھی اس وقت یونان کا ایک ہی نوجوان تھا۔

چاندنی رات تھی خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے چراغاں کر رکھا تھا اور وادی پر سکونِ مطلق طاری تھا کہ دفعتاً اس سکون میں تبدیلی پیدا ہوئی اور ساحل کے ایک جانب سے بربط کے تاروں کی نازک لرزش آ آ کر ہوا میں ملنے لگی رفتہ رفتہ اس لرزش کا تواتر بڑھا، جھنکار میں زور پیدا ہونے لگا اور فضائی آواز موسیقی بن کر تاروں پر دوڑنے لگی۔ دردانہ کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ رات کو تنہا نکل کر ساحل پر آجاتی اور دیر تک بیٹھی ہوئی بربط کے ساتھ گایا کرتی۔ اس کا گانا حقیقتاً ایک قسم کی عبادت تھی۔ اس کی موسیقی گویا اس کی پرستش کی زبان تھی جس کے سمجھنے والے اور جس سے اثر لینے والے اسے کہیں نظر نہ آتے تھے اور اس لئے وہ جنگل ہی کی بے جان چیزوں کے سامنے اپنا فلسفہ بیان کیا کرتی اور یہیں کبھی ہنستی ہوئی اور کبھی آنسو خشک کرتی ہوئی واپس جاتی۔

سفید چادر چاندنی رات، اور دردانہ کا بے نقاب حسن صحیح حقیقت یہ ہے کہ

اس نقرئی لوح پر نقش سیمیں شکل سے اُبھر سکتا۔ اگر اس کے بالوں کی گہری سیاہی اس یکسانیت کو دُور کرنے والی نہ ہوتی۔ وہ ایک چٹان پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی اور بربط پر اپنی لانبی نازک انگلیوں سے اپنی داستان پرستش کہہ رہی تھی۔

جب رات زیادہ بلند ہو چکی اور چاند بلند ہو کر دُرّدانہ کے سر سے گذرنے لگا تو اس نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن وہ کھڑی ہونا چاہتی تھی کہ سامنے کے کنج سے ایک انسان سفید چادر میں ملفوف آگے بڑھتا ہوا نظر آیا پہلے تو وہ کچھ ڈری، لیکن چونکہ ایک پاکباز دل دُنیا میں کسی چیز کی طرف سے عرصہ تک خائف نہیں رہ سکتا، اس لئے وہ پھر اطمینان سے وہیں بیٹھ گئی اور جس وقت آنے والے نے اس کے استفسار کے جواب میں اپنا نام نیّروبی بتایا تو دُرّدانہ دفعتاً کھڑی ہو گئی اور بولی کہ شاہزادے کو کس چیز نے ایسے ناوقت اس قدر زحمت برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔

نیّروبی بولا "کیا وہ خاتون جس کو دنیا میں سب سے زیادہ حسین ہونے کا امتیاز حاصل ہے اس بات کو نہیں سمجھ سکتی، کہ نیّروبی۔ جس کی زندگی میں اب کوئی وقت۔ وقت کہلائے جانے کے قابل نہیں رہا۔ مگر وہ جو کسی حقیقی حُسن کے سامنے بسر ہو کیوں ایسے ناوقت اس قدر زحمت برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا"

دُرّدانہ یہ سُن کر صرف ہنس دی۔ نیّروبی سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا ــ "جس نے تیرا منہ ان پاکیزہ موتیوں سے بھرا ہے کیا وہ تجھے اس امر پر مجبور نہیں کر سکتا کہ تو میری قسمت کا آخری فیصلہ سنا دے"

دُرّدانہ بولی "آہا! شاہزادہ نیّروبی تو بہت اچھا شاعر ہے" اور یہ کہہ کر پھر ہنس دی شاہزادہ نیّروبی بولا "اُف! دُرّدانہ گھڑی گھڑی نہ ہنس کیونکہ چاندنی رات میں بابونہ کے پھولوں کی بہار مجھے از خود ...... "

دُرّدانہ ـ "خوب! پھر وہی شاعری، اے شاہزادے! تو نے یہ فن کہاں اور کب سیکھا؟ اگر میں رات بھر ہنستی رہوں تو بھی شاید تیری نئی نئی تشبیہوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ میں نے بھی ایک مرتبہ کوشش کر کے ایک شعر کہا تھا لیکن وہ بہت معمولی تھا۔

نیروبی :- "مجھے سُناؤ! یقیناً وہ بہت اچھا ہوگا۔"

دردانہ :- "نہیں، وہ نہایت معمولی ہے، اس میں کوئی تشبیہہ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تشبیہہ کسے کہتے ہیں اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

نیروبی :- "تمہارے لئے یہ معمولی بات ہوگی۔ لیکن میرے لئے تو ہر وہ لفظ سکونِ جاں ہے جو دردانہ کے منہ سے نکلے۔"

دردانہ :- "مجھے شرم آتی ہے۔ تم سُن کر مجھ پر ہنسو گے، اور ہاں اب تو مجھے وہ یاد بھی نہیں رہا کوشش کروں تو شاید صرف خیال ظاہر کرسکتی ہوں۔"

نیروبی۔ "اچھا وہی سہی، خیال ہی سہی۔"

دردانہ :- "ایک دن میں معبد میں دیوی زہرہ کے سامنے سر زمین پر رکھے ہوئے رو رہی تھی کہ اسی حالت میں مجھے نیند آگئی۔ میں نے ایک خواب دیکھا جو نہایت دلکش تھا۔ صبح کو نہایت مسرت کے عالم میں جب اپنا بربط میں نے لیا تو بے اختیار میری زبان سے ایک شعر نکل گیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ:-

"وہ لوگ جو میرے جسم کو چاہتے ہیں ان سے کیونکر کہوں کہ میری رُوح تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ میرے چہرے کو بے نقاب دیکھنے کی آرزو رکھنے والے کاش میری رُوح کو بے حجاب دیکھتے۔ مگر افسوس کہ صورت پر جان دینے والے بہت ہیں اور مجھ سے محبت کرنے والے کم۔"

دیکھو! میں کہتی نہ تھی کہ تم ہنسو گے، واقعی نہایت بھدا خیال ہے۔ شاعری کی اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی۔"

نیروبی :- "مجھے دھوکا نہ دے، تو نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ میں ایسا بیوقوف نہیں، جو سمجھ نہ سکوں، تو نے مجھے سمجھانے کے لئے مجھ کو تنبیہہ کرنے کے لئے ایک بات بنائی ہے۔ یہ تو نے کیسے جانا کہ میں صرف تیرے جسم کا پرستار ہوں صرف تیری صورت کا شیدائی ہوں۔"

دردانہ۔ "ہاں یہ تم نے کیا کہا؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے

ہو، اس سے قبل جب کبھی تم نے مجھ سے باتیں کیں میں نے ان کو ہمیشہ وہ التفات سمجھا جو ایک بادشاہ کی طرف سے غریب گدا پر ہوا کرتا ہے، مجھے تو کبھی اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ والیٔ یونان کا بیٹا مجھ ایسی ذلیل و خوار ہستی کے لئے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ محبت کبھی صرف کر سکتا ہے۔ تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ واقعی محبت کرتے ہو، میں کیسے یقین کروں؟"

نیروبی۔ دُردانہ یقین کر کہ وہ نیروبی، جو ملک کی بہتر سے بہتر لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ ایک زمانہ سے تیرا دیوانہ ہے اور ہر چند وہ اب تیرے چہرے کو بے نقاب نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن تیرے حسن و جمال کے خوابوں سے اب بھی اس کی نیندیں معمور ہیں اور تیرے جلوے کی یاد سے اس کی راتیں روشن ہیں"

دردانہ۔ حسن و جمال! جلوہ!! میں ان کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہوں، کیا اچھی صورت کو حسن و جمال کہتے ہیں، چہرہ کا یاسمین، رخسار کا گلاب، آنکھ کا نشہ، ابرو کی محراب، جسم کا تناسب، لبوں کی تازگی، دانتوں کی گہرآبی، رنگ کی تازگی، جن کا ذکر اکثر شاعروں کی زبان پر رہتا ہے کیا انھیں چیزوں کا نام حسن ہے۔ کیا انھیں باتوں کو جمال کہتے ہیں۔ اور کیا انھیں چیزوں کا بے نقاب ہو جانا جلوہ کہلاتا ہے۔ اگر دنیائے عشق و محبت کا فلسفہ صرف اس قدر ہے تو مجھے حیرت ہے کہ اس بے بنیاد جذبہ نے کیوں کر ایسی وسعت حاصل کر لی اور فطرت کیوں اپنی توہین گوارا کر رہی ہے۔ مگر آپ شہزادے ہیں اور آپ کے خیالات و جذبات بھی یقینی عام سطح سے بلند ہوں گے اس لئے شاید آپ کے حسن و جمال کا مفہوم اس قدر ادنیٰ و پست نہ ہوگا"

نیروبی" بے شک عام شاعروں کے ہاں اور معمولی انسانوں کے نزدیک حسن و جمال کا مفہوم وہی ہے جو تم نے ابھی ظاہر کیا۔ لیکن میں تو ان لوگوں میں ہوں جو صورت سے زیادہ ادا کو دیکھتے ہیں۔ جو اعضاء کے حسن سے زیادہ اطوار کی دل فریبی پر فریفتہ ہوتے ہیں اور غالباً یہی وہ چیز ہے جو تجھ میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے"

دردانہ" ادا! اطوار!! آہ، شاعروں اور عاشقوں کی اصطلاحیں سمجھنا بھی کس قدر دشوار ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ میرا ذہن ان دونوں کے مفہوم سے بھی بالکل خالی ہے اور

شاید میں کبھی نہ سمجھ سکوں گی کہ ان کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل بھی بارہا جب میں نے شاعروں کے کلام پر غور کیا تو میں باوجود کوشش کے کبھی نہ سمجھ سکی کہ ادا اور اس کے ساتھ بہت سے الفاظ مثلاً غمزہ، کرشمہ، عشوہ، ناز، تیور، چتون، بانکپن، پھبن وغیرہ کسے کہتے ہیں۔ اور ان میں کیا فرق ہے۔ آپ نے ابھی ادا اور اطوار کا ذکر کیا۔ اس لئے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اگر آپ نے میرے اندر ان باتوں کو دیکھ کر محبت کی ہے تو یہ چیزیں مجھ میں کہاں ہیں۔؟"

نیروبی - دُردانہ! تو یہ کیسی گفتگو کر رہی ہے۔ تجھ ایسی مکمل عورت، جو یونانی انشاء عالیہ کی ماہر ہو۔ جو فنون لطیفہ میں اپنا نظیر نہ رکھتی ہو جو اچھی طرح اس کیفیت سے واقف ہو کہ سارا یونان اس کا فریفتہ ہے ایسی اَن جان بن جائے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں تو مجھ کو اس وقت بے وقوف بنا رہی ہے۔ اور پھر اے قتالۂ عالم مجھی سے پوچھتی ہے کہ ادا کسے کہتے ہیں۔ اچھا میں پوچھتا ہوں کہ تجھے چاندنی رات کیوں اچھی معلوم ہوتی ہے تجھے اپنے بربط سے کیوں محبت ہے۔ تو موسیقی کی کیوں دلدادہ ہے۔ اگر تو کسی اور طرح نہیں سمجھ سکتی تو یوں سمجھ لے کہ تو میری چاندنی ہے۔ تو میری ہستی کا بربط ہے اور میری رُوح کو بیتاب کر دینے والا نغمۂ شیریں۔"

دُردانہ:" چاندنی تو مجھے اس لئے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ میں اس میں زیادہ جوش سے اپنے بربط کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہوں اور اپنے سازو موسیقی سے اس لئے لگاؤ ہے کہ یہ میری پرستش ہے۔ یوں سمجھ لو کہ چاندنی رات سُتھرا فرش ہے، جس پر بیٹھنے کے بعد بربط کے تاروں پر میری انگلیوں کی لرزش اور گلے سے نکل کر آواز کی نمائش عبادت بن جاتی ہے اور اگر میرے دل سے یہ کیفیت محو ہو جائے تو میرے لئے ان میں سے ایک چیز بھی توجہ کے قابل نہ رہے۔"

نیروبی:" اے میرے دل کی دیوی! میں بھی تجھ سے محبت نہیں کرتا بلکہ تجھے پوجتا ہوں، میں نے غلطی کی کہ اپنے حال کو "محبت" کے لفظ سے ظاہر کیا۔ اور اس سے زیادہ غلطی یہ کی کہ تجھے حسین و جمیل کے لقب سے یاد کیا۔ حالانکہ تو اس سے بھی بلند کوئی اور چیز ہے جس کے ظاہر کرنے کے لئے انسان کے الفاظ عاجز ہیں۔ زیادہ سے زیادہ

اگر میں کہہ سکتا ہوں تو صرف یہ کہ تو میری معبودہ ہے۔ تو میری دیوی ہے۔ اور میں تیرا پرستار ہوں، تیرا پجاری ہوں۔"

درِ دانہ: "کیا یہ صحیح ہے؟ لیکن تم درِ دانہ کی پرستش کرتے ہو یا میری؟"

نیروبی: "میں نہیں سمجھا، کیا درِ دانہ اور تو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں؟"

درِ دانہ: "ہاں درِ دانہ نام ہے اس جسم کا جو اس وقت تمہیں نظر آرہا ہے۔ اور جو ہر وقت تغیر پسند و فنا پذیر ہے اور میں تو یہ جسم نہیں ہوں۔"

نیروبی: "پھر کیا ہو؟"

درِ دانہ: "میں نام ہے فطرت کا، روح کا، وجدان کا۔ جس میں ہر وقت رفعت ہے۔ بلندی ہے۔ ارتقاء ہے۔"

نیروبی: "تو پھر میں درِ دانہ سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ تجھ سے۔ تجھی کو چاہتا ہوں۔"

درِ دانہ: "مگر ایک زمانہ آئے گا جب میری صورت خراب ہو جائے گی، درِ دانہ مکروہ ہو جائے گی۔ کیا تم اس وقت بھی مجھ پر یہی محبت صرف کروگے؟"

نیروبی: "یقیناً۔"

درِ دانہ: "اچھا اگر یہ صحیح ہے تو پھر میرا فیصلہ یہی ہے کہ درِ دانہ نیروبی کی ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن میں تمہاری ضرور ہوں اور پرسوں شام کو اسی خلوت گاہ میں اپنے آپ کو تمہارے سپرد کر دوں گی۔"

نیروبی، اس وقت اپنے آپ کو صحیح معنی میں بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ درِ دانہ ایسی ہستی پر قابو پالینا گویا دنیا فتح کر لینا ہے۔ اس لئے وہ غیر معمولی مسرت و نشاط کی کیفیت لئے ہوئے واپس گیا اور انتظار کے دو دن گزارنا اس کے لئے دشوار ہو گیا۔

۲

آفتاب غروب ہو چکا تھا شفق کی روشنی ہاتھوں کی حنائی کی طرح آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی تھی۔ اور نیروبی دو گھنٹے سے ساحل پر درِ دانہ کا انتظار کر رہا تھا کہ شام

کے دُھندلکے میں کچھ فاصلے پر ایک نقاب پوش عورت آتی نظر آئی اور نیروبی اس کے لینے کے لئے آگے بڑھا۔ اُس نے دردانہ کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اُس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مگر وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے اپنے جسم کو اس کے جسم سے ملا دیا لیکن وہ خاموش رہی۔ نیروبی کی مسرت کا اس وقت کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کائنات کی تخلیق ہی صرف اس کی آرزو میں پوری کرنے کے لئے ہوئی ہے اور آج اسے حق حاصل ہے کہ جس کو جس طرح چاہے چلائے۔

ساحل کی اس چٹان پر پہنچ کر جہاں اب سے دو دن قبل عہد و پیمان ہوا تھا، دردانہ نیروبی سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور بولی کہ "تم میری آواز پہچانتے ہو؟" نیروبی بولا "کیوں نہیں، کیا کوئی شخص ایسی شیریں آواز کو ایک مرتبہ سننے کے بعد اپنے دماغ سے محو کر سکتا ہے۔"

دردانہ نے کہا "تم میرے قد و قامت سے بھی مجھے جان سکتے ہو؟" نیروبی نے کہا "خوب! کون ہے جو اس سرو خراماں کا نظارہ کرنے کے بعد پھر اسے فراموش کر سکے۔"

دردانہ "میں نے گزشتہ دو راتیں معبد کے اندر صرف اس دعا میں صرف کر دی ہیں کہ اگر نیروبی واقعی صرف میری روح سے محبت کرتا ہے تو میری صورت میں کوئی تغیر ایسا کر دیا جائے جو دنیا کے اس سب سے زیادہ انوکھے عہد و پیمان کی یادگار بن سکے اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ دعا قبول ہوئی ہو گی۔ اس لئے میں نقاب الٹتی ہوں، میرے چہرے کو بھی دیکھ کر پہچان لو کہ واقعی میں دردانہ ہوں یا نہیں؟"

یہ کہہ کر جس وقت دردانہ نے اپنا نقاب اُٹھایا اور نیروبی کی نگاہ اس پر پڑی تو حیرت نے اس پر سکتہ طاری کر دیا۔ کیونکہ دردانہ کے حسین چہرے کے بجائے ایک ایسی کریہہ صورت اس کے سامنے تھی کہ مشکل سے وہ اس کو نگاہ بھر کر دیکھ سکتا تھا۔ تمام جلد پر گہرے چیچک کے داغ۔ ناک بیٹھی ہوئی۔ آنکھیں چھوٹی۔ بھویں ندارد ــ پیشانی تنگ ہونٹ موٹے موٹے یہ تھا دردانہ کا چہرہ جو نیروبی کو نظر آیا۔

دردانہ دیر تک نیروبی کی اس حیرت سے لطف اُٹھاتی رہی اور پھر بولی "ملنے

شہزادے جلدی کیجئے اور مجھے اپنے ساتھ لے چلئے میں آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے کے سامنے اس کے پاکیزہ و مقدس جنگل میں عہد کرنے آئی ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کی ہو کر رہوں گی، اور اپنی تمام رُوحانی برکتیں و لذتیں آپ کے لئے وقف کر دوں گی۔"

نیرو بی حیران تھا کہ سوائے چہرے کے یہ عورت اور سب طرح درّدانہ ہی تھی۔ لیکن اس کی صورت میں یہ تغیر کیسے ہو گیا کیا واقعی اس کی دُعا قبول ہو گئی یا کسی اور عورت کو بھیج کر مجھے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ اس مسئلہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ درّدانہ نے پھر تقاضہ کیا اور بولی کہ "اے شہزادے یہ سکوت کیسا، یہ حیرت کیوں، اپنے وعدے کو بھول گئے۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ میری پرستش کرتے ہو ممکن ہے کہ میں درّدانہ نہ رہی ہوں۔ لیکن میں تو ہوں، پھر یہ پس و پیش کیا۔؟"

نیرو بی، جس کو اس کی گفتگو کا اب بالکل یقین ہو گیا تھا کہ واقعی درّدانہ ہے اس کی صورت حقیقتاً مسخ ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا کہ "اے درّدانہ! نہیں اب میں تجھے درّدانہ نہیں کہہ سکتا۔ اے عورت! معاف کر مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے جذبہ کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا اور ایک ایسا وعدہ کر لیا تھا............

.. جس کو اب میں پورا نہیں کر سکتا۔ جو ایسے کریہہ بلبوں میں ظاہر ہو۔ میں تجھے اپنی بیوی بنا کر کیونکر مخلوق کو اپنا چہرہ دکھا سکتا ہوں اور کس طرح اس تنفر و کراہت کو دُور کر سکتا ہوں۔ جو تیری صورت دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئی ہے۔"

درّدانہ یہ سُن کر ہنسی اور بولی کہ "اے شہزادے تمہاری خوشی، میں نے تم کو مجبور نہیں کیا تھا۔ بلکہ تمہیں نے میرے سامنے التجا پیش کی تھی۔ اس لئے یاد رکھو کہ اگر آئندہ کبھی تمہیں نقضِ عہد پر افسوس کرنا پڑے تو اس کا الزام مجھ پر نہ رکھنا۔"

درّدانہ نے یہ کہا اور نقاب ڈال کر وہاں سے چل دی۔

۳

گذشتہ واقعہ کو دو ماہ کا زمانہ گذر گیا ہے، اور خانقاہ زہرہ کے احاطے میں کسی مخصوص تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ معبد زہرہ میں یہ رسم نہایت پابندی کے ساتھ جاری تھی کہ جس وقت کسی کنواری کی عمر ۱۹ سال کی ہو جاتی تھی تو عام جلسہ کیا

جاتا تھا اور اس کو انتخاب شوہر کی اجازت دی جاتی تھی۔ چنانچہ آج دردانہ اپنی عمر کے انیس سال پورے کر چکی تھی اور اس کو خانقاہ کی پرستارانہ زندگی ترک کر کے متاہل زندگی میں داخل ہونا تھا۔

چونکہ دردانہ کے حسن و جمال، فضل و کمال کا بہت شہرہ تھا، اور اس تاریخ کا اعلان تمام قرب و جوار کے ملکوں میں بھی کر دیا گیا تھا۔ اس لئے خواہش مندوں کا ہجوم بہت تھا۔ اور ہر ملک کا امیرزادہ بہترین ہدایا لے کر حاضر ہوا تھا۔ نیروبی اس رات کی صبح ہی کو اپنا غم و غصہ دور کرنے شکار کے لئے چلا گیا تھا اور پورے دو ماہ کے بعد اس رات کو واپس آیا جس کی صبح کو یہ تقریب عمل میں آنے والی تھی۔

اس نے سنا اور اپنے جی میں ہنسا کہ دیکھئے وہ کون بدقسمت ہے جو دردانہ کی شہرت جمال سے دھوکا کھا کر اس عذاب کو مول لے گا۔ صبح کو وہ بھی تماشہ دیکھنے گیا لیکن لوگوں کو سخت تعجب ہوا، جب انھوں نے سنا کہ نیروبی، جو دردانہ کا صد درجہ شیفتہ تھا کوئی ہدیہ لے کر نہیں آیا اور فہرست میں اپنا نام بھی درج نہیں کرایا۔ کوئی پوچھتا بھی تو ہنس دیتا اور کہتا کہ "ہاں دردانہ کی خواہش اب میرے دل کے اندر مردہ ہو گئی ہے" لیکن جب اس سے زیادہ اصرار کیا گیا تو اس نے اپنے بعض احباب سے اصل واقعہ بھی بتا دیا اور رفتہ رفتہ یہ خبر ہر چھوٹے بڑے تک پوری طرح منتشر ہو گئی اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ فکر مند نظر آنے لگا۔ خانقاہ کے پجاریوں سے دریافت کیا گیا، وہاں کی کنواریوں سے جستجو کی گئی، لیکن سب نے یہی جواب دیا کہ اب سے دو ماہ قبل تو دردانہ کی صورت نہایت اچھی تھی لیکن گذشتہ دو مہینہ کے اندر اس نے اپنے چہرے کا نقاب بہت سنگین کر دیا ہے اور کسی کو اس کی صورت دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ دیوی نے اس کی صورت مسخ کر دی ہو اور اس کے چھپانے کے لئے وہ اپنی صورت دکھانے سے احتراز کرتی ہو۔ رفتہ رفتہ یہ خبر اس قدر عام ہوئی اور اس درجہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ سب نے اپنی اپنی خواہشیں واپس لے لیں، اور شام کو جب صحن خانقاہ میں زرّیں تخت پر دردانہ بیٹھی تاکہ ہر خواہشمند سامنے آ کر اپنی التجا پیش کرے اور وہ اس کا جواب دے تو ایک متنفس بھی سامنے نہ آیا۔

نام پکارا جاتا تھا لیکن مجمع سے نکل کر کوئی شخص آگے نہ بڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سارے نام ختم ہو گئے۔ فہرست میں اب صرف ایک نام رہ گیا تھا جو سب سے آخیر میں اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ ایک نہایت ہی معمولی کسان کے لڑکے کا تھا۔ جب سب نام ختم ہو گئے تو اس کا نام بھی پکارا گیا۔ اور وہ ڈرتا کانپتا آگے بڑھا اور تخت کے پاس پہنچ کر بولا کہ "اے درّدانہ! میں نے تیری خواہش اس لئے نہیں کی کہ تو حسین وجمیل ہے بلکہ صرف اس لئے کی تھی کہ دنیا میں مجھے ایک رُوح کی ضرورت تھی جو میری رُوح کی تڑپ کو دُور کر دے اور مجھے سچی پرستش کا سبق دے۔ میں نے سُنا تھا کہ تو بڑی بلند فطرت رکھتی ہے اور تیری پوجا سے زہرہ کی خانقاہ جگمگا اُٹھتی ہے۔ پھر یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ اس نے تیرا ظاہری حسن وجمال چھین لیا۔ اور کوئی نوجوان تیرے ہاتھ کا خواہاں آگے نہ بڑھا۔ یہاں تک کہ میرا نام پکارے جانے کی نوبت آئی۔ اس لئے میں حاضر ہوا ہوں۔ کیا تیری پاکیزہ رُوح میری آلُودہ رُوح کے اتصال کو گوارہ کر سکے گی۔؟"

مجمع پر ایک سکوت طاری تھا اور ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھئے درّدانہ کیا جواب دیتی ہے۔ کہ نقاب کے اندر سے ایک نازک شیریں آواز آئی:۔

"اے اجنبی! چونکہ تو صرف میری فطرت کا گرویدہ ہو کر آیا ہے۔ اس لئے یقیناً میں تیری خواہش کو رد نہ کروں گی۔"

اور یہ کہہ کر اس نے نقاب اُٹھا دیا۔ کیونکہ انتخاب کی رسم ادا ہونے کے بعد ایسا کرنا ضروری تھا لیکن نقاب کا اُٹھنا تھا کہ سارے مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ کیونکہ اس وقت درّدانہ بالکل چودھویں کا چاند معلوم ہوتی تھی اور اس کے حسن وجمال کی تاب نظارہ بھی لوگوں میں نہ تھی۔

نیردبی، دیوانہ وار آگے بڑھا اور بولا "اے درّدانہ! یہ کیا، ایسا سخت فریب!!"

درّدانہ مسکرا کر بولی "فریب تو تیری ہی مکروہ فطرت کا تھا جس نے اپنی صورت کو میرے چہرے میں مشاہدہ کیا اور میں تو جیسی اب ہوں ویسی ہی اس وقت بھی تھی۔"

یہ کہہ کر درّدانہ اُٹھی اور کسان کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اس گاؤں میں چلی گئی جہاں

وہ رہتا تھا۔

نیروبی جس وقت دیوانہ وار درّدانہ کے حجرے میں پہنچا تو وہاں اس کی کوئی چیز نظر نہ آئی، مگر ایک مومی چہرہ، جس پر نہایت ہی بدنما خط و خال بنے ہوئے تھے اور جسے اس نے اس دن واقعی درّدانہ کا حقیقی چہرہ سمجھ کر نفرت کا اظہار کیا تھا۔

ابجد کی ابتدار

ابجد سے لے کر ضظغ تک اہلِ عرب کے حروف ہجا کا مجموعہ ہے اور ان کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے سوائے حروف علت کے وہی ہے جو عبرانی اور ارآمی زبان میں پائی جاتی تھی اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب نے حروف تہجا نباطیوں کے ذریعہ سے حاصل کئے تھے وہ چھ حرف جو عربی زبان کے لئے مخصوص ہیں انھیں سب سے اخیر میں رکھا گیا ہے۔ جس طرح اب موجودہ ترتیب کے ساتھ ان حروف سے اظہارِ اعداد کا کام لیا جاتا ہے بالکل اسی طرح آرامی زبان میں بھی رائج تھا۔

عربی کے موجودہ حروف ہجا کی ترتیب ابجد ہوز کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ مختلف ہے اور یہ ترتیب تحریر حروف کے لحاظ سے ہے یعنی جو جو حروف ایک طرح لکھے جاتے ہیں ان کو یکجا کر دیا اور یہ ترتیب بھی بہت قدیم ہے بعض نے مخارج کے لحاظ سے ان کو مرتب کیا ہے۔ چنانچہ کتاب العین میں الخلیل نے اور تہذیب میں الازہری نے مخارجی ترتیب کا لحاظ رکھ کر ان کو درج کیا ہے۔

خود اہلِ عرب کا بیان ہے کہ مدین کے چھ بادشاہوں نے عربی حروف ہجا کی ترتیب اپنے ناموں کے لحاظ سے مرتب کی تھی۔ بعض کا بیان ہے کہ پہلے چھ الفاظ (ابجد سے لے کر قرشت تک) شیطانوں کے نام ہیں اور بعض انھیں ہفتہ کے دنوں کے نام بتاتے ہیں لیکن یہ تمام بیانات لغو ہیں حقیقت یہی ہے کہ عربوں نے حروف ہجا عبرانی اور آرامی زبان سے حاصل کئے اور چونکہ وہاں یہی ترتیب تھی جو ابجد ہوز وغیرہ میں پائی جاتی ہے اس لئے عربوں نے بھی اسے بجنسہٖ لے لیا بعد کو البتہ اس کی ترتیب میں بہ لحاظ اسلوب تحریر و مخارج کچھ فرق ہو گیا۔

نیاز فتحپوری

نیاز فتحپوری

اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال

اسلام میں بہتر فرقوں کے متعلق کوئی معتبر حدیث موجود نہیں ہے لیکن ازروئے حقیقت اس وقت بہتر کیا سیکڑوں فرقے موجود ہیں جن میں راہ راست کا چلنے والا وہی کہلائے گا جو سب سے زیادہ پابندِ شریعت و سنتِ نبوی ہے اس مسئلہ پر تنقید کرنے کے لئے پہلے ایک شخص ثالث کی حیثیت پیدا کرنا چاہے اور وہ دشوار ہے اس لئے میرے نزدیک اس جھگڑے میں پڑنا بیکار ہے، جو جس فرقہ میں ہو اس کو وہیں رہ کر غور کرنا چاہئے اور تفکر کامل کے بعد عقلِ سلیم جو فیصلہ کرے اس پر کاربند ہونا چاہیئے۔

یوں تو تاریخی نقطۂ نظر سے اعتزال کی ابتدا صحابہ کے اخیر زمانہ سے ہوئی ہے لیکن اگر انصاف سے آپ پوچھتے ہیں تو مجھے کہنا پڑے گا کہ اس کی ابتدا عہدِ اسلام ہی میں ہو چکی تھی، کیونکہ میرے نزدیک جس وقت سے اسلام اور مسائل اسلام میں چون و چرا کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا، اسی وقت سے اعتزال شروع ہو گیا تھا، پھر یہ سب کو معلوم ہے کہ عقاید و اعمال کے متعلق لوگوں کے درمیان اختلاف ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا، حضرت عائشہؓ اور صحابہ کے درمیان معراج جسمانی کے متعلق اختلاف پیدا ہونا سماع موتیٰ کے متعلق عبداللہ بن عمر اور دوسرے صحابہ میں اتفاق نہ ہونا، رونے سے مُردہ پر عذاب ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ابوہریرہ اور حضرت عائشہ کے درمیان عدم اتفاق، اسی طرح اوقات نماز، ترکیب وضو، وغیرہ کے متعلق صحابہ کے درمیان اختلاف، یہ سب اس امر کا ثبوت ہے کہ مذہبیات میں عقل و نقل سے استدلال کا رواج ابتدا ہی میں ہو چلا تھا، اور حقیقتاً یہی بنیاد تھی اعتزال کی۔ لیکن یوں تاریخ کے زاویۂ نگاہ سے سب سے پہلا اہم اختلاف جو سیاسیات کی بنا پر رونما ہوا وہ شیعہ اور خوارج کا اختلاف تھا اور جس کی تفصیل غالباً آپ کو معلوم ہو گی۔ پھر چونکہ یہ سیاسی نزاع خلافت بنی اُمیّہ کے

عہد میں اور زیادہ قوی ہو گئی تھی اور ہر فریق اپنی طرف سے قرآن و حدیث ہی سے استدلال کرتا تھا اس لئے فرقہ بندیوں کو غلطی سے مذہبی تفریق قرار دے دیا گیا درانحالیکہ حقیقتاً وہ صرف سیاسی اختلاف تھا جس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا جاتا تھا۔

جب عہد بنی امیہ میں مظالم زیادہ بڑھ گئے اور مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا تو اُن کی طرف سے اس کی تاویل پیش کی گئی کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ معبد جہنی ایک شخص نے جو بنو اُمیہ کا مخالف تھا، اس کی تردید کی اور کہا کہ انسان جتنی برائیاں کرتا ہے وہ خود اسی کا فعل ہوتی ہیں، خدا مجبور نہیں کرتا جب عبد الملک بن مروان نے اس کو ۸۰ھ میں قتل کرا دیا تو غیلان دمشقی نے اس مسئلہ کو رواج دینا شروع کیا اور اسی کے ساتھ چند امور کا اور اضافہ کر دیا۔

اس کے بعد حسن بصری کے دو شاگردوں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا نے خوارج کے اس مشہور مسئلہ سے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، اختلاف کیا اور کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہوتا ہے نہ مسلمان رہتا ہے۔ حسن بصری نے جب یہ سُنا تو بہت برہم ہوئے اور دونوں شاگردوں کو اپنے پاس سے جدا کر دیا اور اسی وقت سے یہ لوگ معتزلہ کہلائے جانے لگے۔ کیونکہ حسن بصری نے ان سے کہا تھا کہ "قد اعتزلتم عنّی" (تم مجھ سے منحرف ہو گئے)

چونکہ عمرو بن عبید اور واصل بن عطا دونوں بڑے فاضل شخص تھے اس لئے انہوں نے مذہب اعتزال میں زیادہ نکتہ سنجی سے کام لیا اور خود حکومت ہی نے ان کا ساتھ دے کر اس فرقہ کو زیادہ مستحکم بنا دیا۔

بنو اُمیہ کے بعد بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی اور چونکہ اس کے اکثر خلیفہ علوم و فنون کے سرپرست اور تحقیقات علمی کے شائق تھے اس لئے اس طبقہ کو اس عہد میں بھی قدرتاً ترقی کرنا چاہئے تھی کیونکہ اس وقت تمام اسلامی جماعتوں میں معتزلہ ہی کا گروہ ایسا تھا جو معقولات سے کام لیتا تھا۔ خلیفہ منصور چونکہ ایک آزاد خلیفہ تھا اور بزور شمشیر اشاعت مذہب کا مخالف تھا، اس لئے اس کے عہد میں علمی مناظروں کا بازار گرم ہو گیا

اور معتزلہ نے غیر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی طرف سے خوب خوب داد تحقیق دی، اس کے بعد خلیفۂ مہدی کے زمانہ میں یہ آزادی رُک گئی اور اس کا سلسلہ ہارون الرشید کے عہد تک قایم رہا، کیونکہ وہ فلسفیانہ دماغ نہ رکھتا تھا لیکن اس کے بعد جب مامون کی حکومت شروع ہوئی تو پھر اعتزال بیدار ہوگیا اور اس کی ترقی انتہائی عروج کو پہنچ گئی، کیونکہ مامون خود معتزلی تھا اور مذہب کے باب میں نہایت آزاد۔

مامون کے بعد اتفاق سے معتصم اور معتصم کے بعد واثق کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت آئی اور یہ بھی دونوں معتزلی تھے، واثق کے بعد متوکل کا دور شروع ہوا جو ناموافق زمانہ تھا لیکن گزشتہ خلفاء کی سرپرستی میں اعتزال تمام ملک میں اور اس قدر کثرت سے پھیل گیا تھا کہ نہ متوکل کے روکے نہ رُک سکتا تھا، الغرض چوتھی صدی ہجری کے اخیر تک معتزلہ کی قوت ایک حد تک قائم رہی اور پھر اشعری جماعت کا زور شروع ہوا جو معتزلہ کی سخت مخالف تھی۔ ہر چند اشعری علما معقولات کی مدد سے اعتزال کا رد کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو چند تیس اس سے قبل اعتزال انجام دے چکا تھا وہ اپنی جگہ مستقل برکات کا حکم رکھتی تھیں اور اہل فہم سمجھتے تھے کہ اعتزال و اشعریت میں کیا فرق ہے؛

اس طبقہ میں عمرو بن عبید، واصل بن عطا، غیلان دمشقی، ابو الہذیل، ابو علی جبائی، نظام اور جاحظ ایسے لوگ گزرے ہیں جن کا مثل پیدا نہیں ہوا اور جن کے احسانات سے تاریخ اسلام کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی، یہ لوگ علاوہ علم و فضل کے اپنے اخلاق کے لحاظ سے اس قدر بلند مرتبت تھے کہ مشکل سے عہدِ حاضر کے اشاعرہ میں کوئی ان کا مثل نظر آسکتا ہے، یہ نفوس اپنی ذاتی آزادی اور صداقت و دیانت کی ایسی مثالیں چھوڑ گئے ہیں کہ تاریخ اسلام ان پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔

عہدِ بنی امیہ میں عمرو بن عبد العزیز کا عہدِ خلافت ہے اور استبداد کا رنگ اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ باوجود عمر بن عبد العزیز کی صداقت پسندی کے کوئی شخص بنو امیہ کے خلاف ایک لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا، لیکن معتزلی غیلان دمشقی جو توشہ خانہ شاہی

کی حفاظت پر مامور ہے، وہاں کی تمام چیزیں نکال نکال کر فروخت کر رہا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ آؤ ان کے مال پر جو خیانت کرتے تھے، آؤ ان کے مال پر جو ظالم تھے، غاصب تھے، لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ دین وملت کے امام تھے، حالانکہ ان کے ظلم و جور سے مسلمان فاقہ میں مبتلا ہیں

جب ہشام کا عہدِ حکومت شروع ہوتا ہے تو وہ اسی غیلان کو گرفتار کرا کے ایک ایک کر کے اس کے اعضا کٹواتا ہے، لیکن وہ اپنی حق گوئی سے باز نہیں آتا یہاں تک کہ اخیر میں زبان کٹوا دی جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔

منصور عباسی کا عہدِ حکومت ہے، وہ منصور عباسی جس کی جلالت و سطوت سے ملک کانپ رہا ہے، عمرو بن عبید اس کو نصیحت کرتا ہے کہ "دولت وحکومت سخت بے وفا ہے، اگر اس میں وفا ہوتی تو تجھ تک نہ پہنچتی اس لئے آج کی رات اس دن سے ڈر جس کے بعد کوئی رات نہیں ہے۔" منصور پوچھتا ہے "کوئی حاجت ہو تو بیان کیجئے"۔ وہ کہتا ہے کہ "میری خواہش یہی ہے کہ اب مجھے دوبارہ دربار میں آنے کی زحمت نہ دی جائے۔" کیا اس سے زیادہ روشن مثالیں اخلاق کی پاکیزگی کی اور پیش کی جا سکتی ہیں؟ اب فضل و کمال کو ملاحظہ کیجئے:۔

واصل بن عطا اپنے عہد کا بے مثل فصیح و بلیغ شخص تھا لیکن اس کی زبان سے حرف ر ادا نہ ہو سکتا تھا، اور اکثر خاموش رہتا تھا مگر قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی خطبہ دینے کھڑا ہوجاتا تو گھنٹوں تقریر کرتا اور کوئی لفظ ایسا استعمال نہ کرتا کہ جس میں حرف ر آ جائے۔

ابو الہذیل کے فضل و کمال کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ مامون الرشید نے اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، کم سنی کے عالم میں اس کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ غیر مذہب کے بڑے بڑے فضلا اس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے شرماتے تھے، ابو معن ثمامہ کا بیان ہے کہ مامون کے دربار میں ابو الہذیل ہمیشہ میرا نام لے کر پکارتا تھا، اور مامون مجھے میری کنیت سے مخاطب کیا کرتا تھا، یہ بات مجھے سخت ناگوار تھی لیکن جب ایک

دن ابوالہذیل نے مجلسِ مناظرہ کے اندر اپنے قول کی تصدیق میں سات سو شعر متقدمین کے پڑھ کر سنائے تو میں نے اپنے دل میں کہا اس شخص کو حق حاصل ہے جس طرح چاہے مجھے خطاب کرے"۔

نظّام باوصف اُمّی ہونے کے اتنا بڑا عالم تھا کہ لوگوں کو اس کی وسعتِ معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ اس کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ سن لی، ہمیشہ کے لئے دماغ میں منقوش ہو گئی۔ چنانچہ اس کے تبحّر کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ جعفر برمکی کی مجلس میں اس نے ارسطو کی کتاب شروع سے آخیر تک از بر سنا دی اور ہر مسئلے پر اپنے اعتراضات بیان کرنے شروع کئے۔ معقولات و منقولات میں کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کا وہ جیّد عالم نہ رہا ہو۔ یہاں تک کہ علم ہندسہ اور طبیعیات میں بھی اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ طبیعیات میں سب سے پہلے اسی نے ثابت کیا کہ رنگ و بو، روشنی و حرارت اعراضِ مادّی ہیں۔

ادبیات کا ذوق وہ فطرت کی طرف سے ایسا پاکیزہ لایا تھا کہ بڑے بڑے شعراء اس کی نکتہ سنجی پر حیران رہ جاتے تھے۔

جاحظ، باوجود اس کے کہ وہ نہایت مفلس باپ کا بیٹا تھا اور یتیم ہو جانے کے بعد اس کی حالت بہت سقیم ہو گئی تھی، لیکن ذوقِ علم اتنا رکھتا تھا کہ دنیا کا کوئی مانع اس کی تحصیل علوم کے لئے حارج نہ ہوا اور اس نے اسی غربت و افلاس میں، تفسیر، فقہ، حدیث، کلام اور ادب کی تکمیل اس حد تک پہنچائی کہ بعد کو بڑے بڑے مشاہیر نے اس کا اعتراف کیا اور معتزلہ کا ایک مستقل طبقہ جاحظیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ہجرتِ اسلام

حصولِ مقصدِ فطرت تھا ہجرتِ اسلام　　نہاں تھے قصر بہ آغوشِ خانماں تہی
حریفِ خاکِ عرب ہو سکا نہ آخرکار　　غرورِ خسروی و افتخارِ کج کلہی
تھی اپنی چین جبیں وجہِ رعشۂ دیہیم　　تھی اپنی چشم غضب لرزشِ حریمِ شہی
بنائے دولتِ اندلس تبا گئی ہم کو　　نہ مٹ سکے گا ستم سے غرورِ بے گنہی
ہر اک شکست ہے سامانِ صد ہزار عروج　　نویدِ نشۂ شب ہے خمارِ صبح گہی

قفس گذار و بہ سامانِ صد بہار بیا
سپند دار بروں شو سمند دار بیا

کسے خبر تھی کہ یہ پردۂ جہاں بانی　　کرے گا پیشِ نظر منظرِ جہاں سوزی
قسم بہ شوقِ جفایت کہ آگیا پھر یاد　　طریقِ ملک ستانی، اصولِ فیروزی
فشارِ تاک میں پنہاں ہے رونقِ مینا　　ہے سوزِ شمع سے وابستہ محفل افروزی
نہ خون سینہ سے بہتا، نہ یادِ گل آتی　　بڑا ہی لطف تھا تیرِ جفا کی دلدوزی
تمہاری تیغِ ستم بھی دو نیم ہوگی، اگر　　جو اپنی خوئے وفا ہو گئی بد آموزی

مرا بدامن اگر آتشے میسر گشت
ہزار شکر کزو جادہ ام منور گشت

ایک غزل اور مختلف آہنگ

(شعرائے متقدّمین کے رنگ میں)

جب قفس میں مجھ کو یادِ آشیاں آ جائے ہے
سامنے آنکھوں کے اک بجلی سی لہرا جائے ہے

میرے اوراقِ کتابِ زندگانی ہائے ہائے
جیسے بن دیکھے کوئی انکو الٹتا جائے ہے

دل مرا، وہ خانۂ ویراں۔ ہے جل بجھنے پہ بھی
راکھ سے جیسکی دھواں تا دیر اٹھتا جائے ہے

میں نہ کہتا تھا کہ تابِ دید کا کیا اعتبار
آج لے، اے دل ترا یہ بھی سہارا جائے ہے

تم تو ٹھکرا کر چلے جاؤ تمہیں ٹوکے گا کون
میں پڑا ہوں راہ میں تو کیا تمہارا جائے ہے

چشمِ تر ہے اُسطرف اور اس طرف ابرِ بہار
دیکھنا ہے آج کس سے کتنا رویا جائے ہے

ہائے جو گھر، رات بھر جلتا رہا ہو، صبحدم
اس کی ویرانی کا منظر کس سے دیکھا جائے ہے

میں تو بس یہ جانتا ہوں اسکو ہونا ہے خراب
کیا خبر اسکی مجھے، دل گیا ہے یا آئے ہے

کون ہے دنیا میں اب مجھسے زیادہ نامراد
ہائے وہ "میں" جو تری نظروں سے گرتا جائے ہے

ہاں، اسی کو لوٹ کر آنا نہیں ہوتا نصیب
تجھ سے پھر ملنے کی جو لے کر تمنّا جائے ہے

شمعِ محفل جل بجھی، پر یادگارِ بزمِ دوش
جا بجا اب بھی پرِ پروانہ پایا جائے ہے

میرا پندارِ خدائی اس گھڑی دیکھے کوئی
جب مجھے بندہ ترا کہہ کر پکارا جائے ہے

اب وہ کیا آئیں گے تم بھی آنکھ جھپکا لو نیازؔ
صبح کا تارہ بھی اب تو جھلملاتا جائے ہے

(مومن و غالب سے لیکر مصحفی، جرأت، جعفر علی خاں حسرت، داغ، آتش، جلال، تسنیم، داغ و حسرت موہانی تک)

منزلِ خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے — ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے
قصۂ کشتی و ساحل! ناخدا تو ہی بتا — کون ان دونوں میں کس سے دور ہٹتا جائے ہے
جو نہ مرنے دے نہ جینے دے، دمِ رخصت وہ شوخ — اک نگہ ایسی بھی ہم پہ صرف فرما جائے ہے
راستہ جو دیر کو جاتا ہے اے شیخِ حرم — جائے ہے کعبہ کو بھی وہ اور سیدھا جائے ہے
التفاتِ دوست مانا وجہِ تسکیں ہے مگر — ہاتھ رکھ کر وہ تو دل کو اور تڑپا جائے ہے
اے وہ نقشِ نامرادی ہی سہی، پر کیا کروں — بیٹھ کر محفل میں اسکی کس سے اٹھا جائے ہے
محو ہو جاتے ہیں سارے شکوہ ہائے دردِ دل — سامنے جس دم وہ جانِ آرزو آجائے ہے
جاں گسل ہے گو بہت ترکِ محبت کا خیال — لیکن اس پیماں شکن کو یوں بھی چاہا جائے ہے

حسن کا ہوگا تعلق دیکھنے سے بھی ضرور — اپنے مشرب میں تو اسکو صرف سمجھا جائے ہے
بتکدہ اور کعبہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے — بتکدہ بنتا ہے خود کعبہ بنایا جائے ہے
کرکے توبہ دیر سے جاتا ہوں جب سوئے حرم — دیر تک خود کعبہ آکر مجھ کو پہنچا جائے ہے
ذوقِ تخلیقِ برہمن کی بلندی دیکھئے — بت بنایا جائے ہے، سجدہ بھی کرتا جائے ہے
انتظار ان کے کرم کا ہے کچھ ایسا انتظار — کھنچ نہیں سکتا ہے لیکن پھر بھی کھینچا جائے ہے
تو کہ ہے ہر نقشِ پا تیرا چراغِ رہ گزر — مجھ سے چھپ چھپ کر کہاں راتوں کو جایا جائے ہے

(مرکب تشبیہات اور سخن گسترانہ تعبیرات)

حرف اک لرزش ہے نوکِ خار پر شبنم کی بوند — پھر بھی اس فرصت پہ اسکی مجھ کو رشک آجائے ہے
میری تنہائی نہ پوچھو، جیسے کوئی نقشِ پا — دور صحرا کے کسی گوشہ میں پایا جائے ہے
سنگ کیا ہے بس سراپا انتظارِ بت تراش — زندگی کا خواب تو گو یوں بھی دیکھا جائے ہے

شب کا وہ پچھلا پہر اور بھیگی بھیگی چاندنی ۔ رات بس کر جیسے کوئی ہار کمھلا جائے ہے
اس تصور سے کہ میرے انکے لب ہوں متصل ۔ ایک نقطہ پر سمٹ کر زندگی آجائے ہے
رات کی تنہائیاں اور انکی آمد کا خیال ۔ چاند جیسے روح کے اندر سے گزرا جائے ہے
اس سہی قد کا خرام ناز وہ فتنہ ہے جو ۔ ہر قدم پر اک نئے سانچے میں ڈھلتا جائے ہے
ان کی آنکھوں کا تبسم آج رکتا ہی نہیں ۔ ساغر لبریز جیسے کوئی چھلکا جائے ہے

اب یہ حالِ دل ہے جیسے رکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بیدردی سے کھینچا جائے ہے

محبوب کا جسمانی تصور اور حجا کات و معاملات

ہاتھ سے لیتی ہے اس کے اور لوٹا جائے ہے ۔ ورنہ مہندی میں کہاں یہ رنگ پایا جائے ہے
ہو گرا تیر نگاہِ شوق وہ جانِ حیا ۔ دیکھ تو کیسا پسینہ میں نہایا جائے ہے
وہ خنک سی تابناکی اسکے رنگِ جسم کی ۔ مجھ کو تو اس چاندنی میں نیند سی آجائے ہے
یہ تناسب ہے ترے اعضا کا یا جوشِ شباب ۔ جتنا بڑھتا جائے ہے کانٹے پہ تلتا جائے ہے
بے حجابی کا بھلا کیا ذکر میرے سامنے ۔ جب وہ گزرے ہے تو آنچل کو دوہرا جائے ہے
مجھ کو مارا ہے اسی تو خنجر نے، ہاں ہاں وہی ۔ جو دبا کر دانت سے آنچل کا کونا جائے ہے
ہم سنانے کو سنا دیں داستانِ غم مگر ۔ کس سے ان بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے
اف رے وہ ٹھنڈا سا اور ہلکا سا نم جو بعد غسل ۔ سوکھ جانے پر ترے بالوں میں پایا جائے ہے
حاصلِ صد عمر محرومی ہے وہ یک قطرہ اشک ۔ جو سر مژگاں پہ اس کافر کے پایا جائے ہے
اس نگاہِ سرمگیں کی برق ساماتی نہ پوچھ ۔ جو اچٹ کر آئینہ سے ناگہاں آجائے ہے

آنکھ ملتے آرہے ہیں خواب گہہ سے بزم میں
تیر پہلا دیکھئے کس پہ چلایا جائے ہے

(جدید رجحانات کو سامنے رکھ کر)

تار کی جھنکار ہی سے بزم تھرّا جائے ہے — گاہے گاہے سازِ ہستی یوں بھی چھیڑا جائے ہے
قافلہ چھوٹے زمانہ ہو گیا لیکن ہنوز — یادِ آوازِ جرس رہ رہ کے تڑپا جائے ہے
سیل و طوفاں بن کے آ، پر ناخدا بن کر نہ آ — اے خدا اس نام سے دل میرا تھرّا جائے ہے
خود زمانہ رخ ہمارا دیکھتا ہے، ہم نہیں — جس طرف مڑتے ہیں ہم دھارا بھی مڑتا جائے ہے
سر جو گردن پر نہیں تو کیا، ہتھیلی پر سہی — منزلِ عشق و جنوں سے یونہی گزرا جائے ہے
روشنی ہی روشنی ہے، عہدِ برق و نور ہے — یہ مگر سایہ سا کیوں دنیا پہ چھایا جائے ہے
ہم کہاں ڈوبے تھے یہ کل پوچھیے گا آج تو — کچھ تلاطم سا ابھی موجوں میں پایا جائے ہے
مشورہ کچھ ہم سے مجبوروں کا بھی لیجے ضرور — اے خدا! عالم اگر پھر سے سنوارا جائے ہے
عقل والو کچھ کہو، یہ رشتۂ رازِ حیات — کیوں الجھتا جائے ہے جتنا کہ کھلتا جائے ہے
کل اسی آہنگ پر ہوتا ہے تعمیرِ فغاں — آج جو کچھ زیرِ لب دیوانہ کہتا جائے ہے
آ رہا ہوں دوستو، ٹھیرو، مگر یہ تو بتاؤ — مجھ کو کس گوشہ سے صحرا کے پکارا جائے ہے

میں ہوں وہ رندِ گریباں چاک اس دُنیا میں جو
کچھ نہیں کہتا پہ تقدیریں پلٹتا جائے ہے